خواتین ڈائجسٹ

دسمبر 2021

کہنی سُننی، مدیر 8
کرن کرن روشنی، ادارہ 9
ہمارے نام، نادرہ خاتون 28

آپ سے کیا پردہ

ایک پنجابی نظم، انشاجی 11

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے، امت الصبور 244

مجھ سے ملئے

باتیں ریحان ناظم سے، شاہین رشید 15

انٹرویو

قرۃ العین خرم ہاشمی سے ملاقات، شاہین رشید 20
خامشی کو زباں ملے، ادارہ 248

ناول

رنگ ریز میرے، عفت سحر 210
زندگی ہم تجھے گزاریں گے، راحت جبیں 34

مکمل ناول

مالا، نمرہ احمد 164
تو میری راہ گزر، عنیزہ بن ابدال 92
نازک، صبا زین 128

ناولٹ

سیاہ بخت، فلک حسن 62

افسانے

نشانے باز، ثانیہ مرتضیٰ 57
گیت دان، کشف بلوچ 83
گمنام قارئین کے نام، حمیرا شفیع 235
آزمائش، راشدہ رفعت 227
پوتی، نواسی اور میں، اُم ہانی 123
کُھلتا کسی پہ کیوں، مریم شہزاد 161

نظمیں غزلیں

غزل، قتیل شفائی 239
نظم، جون ایلیا 239
غزل، افتخار عارف 238
غزل، ن - م 238

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

pklibrary.com

رنگا رنگ پھول

رنگارنگ سلسلہ — شگفتہ حیاء — 240

خبریں وبریں — واصفہ سہیل — 246

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں — عدنان — 256

پکوان

موسم کے پکوان — خالدہ جیلانی — 254

آپ کا باورچی خانہ — شائستہ نعیم — 252

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے — امت الصبور — 258

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے — خالدہ جیلانی — 243

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 1,200 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 18,000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا - 20,500 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

خط وکتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

0317 2266944
Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

pklibrary.com

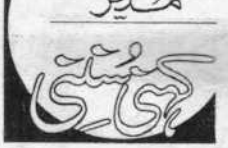

مدیر

کہی سُنی

خواتین ڈائجسٹ دسمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

دسمبر — سال رواں کا آخری مہینہ۔

ایک اور سال ختم ہونے کو ہے — جب سال ختم ہونے کو آتا ہے تو نہ جانے کیوں وقت اور حالات کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نئے اور پرانے سال کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ وہی دن، وہی راتیں — ہفتے، مہینے، سال — لیکن ایک فرق ضرور ہے کہ ہر گزرتا سال ہماری مہلت وقت میں کمی کرتا جاتا ہے۔ یہ کائنات جو ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ یہاں کوئی بھی چیز قیام پذیر نہیں — اگلا پل کیا لے کر آئے، کوئی نہیں جانتا — انسان سمیت کائنات کی ہر شے فانی ہے۔ ختم ہونے والی۔ باقی رہ جانے والے تو ہمارے اچھے بُرے اعمال ہی ہیں — جو ہم وقت کی اس مہلت میں انجام دیتے ہیں جو ہمیں دی گئی ہے۔

وقت کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتا جو وقت کے ساتھ چلتے ہیں، وقت کی قدر کرتے ہیں، وہی کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ دُنیا کتنی آگے بڑھ گئی ہے — سائنس اور ٹیکنالوجی نے کتنی ترقی کی ہے۔ سوچو تو عقل دنگ رہ جاتی ہے اور جب ہم اپنے حال پر نظر ڈالتے ہیں تو دل بحر ندامت میں ڈوب جاتا ہے۔ ہماری ستر سالہ تاریخ میں جو سانحات گزرے، ہمیں جو زخم لگے، وہ ہماری اپنی غلطیوں، کوتاہیوں کا نتیجہ ہے۔ ہم خوبصورت خوابوں کے اسیر جھوٹے وعدوں سے بہلتے رہے، ہم نے عقل و دانش سے کام نہیں لیا۔ پتا نہیں سمت درست نہ تھی۔ یا راہبر کے انتخاب میں غلطی کی۔ اور اب تو صورت حال یہ ہے کہ غلط اور صحیح کی پہچان بھی کھو بیٹھے ہیں۔

سال کے آخری دن احتساب کے ہوتے ہیں۔ سوچیں کہ ہم نے گزرے سال میں جو کھویا، اس میں ہم کہاں غلط تھے اور جو پایا، قدرت کی اس عطا کا کس طرح شکر ادا کیا۔

نیا سال۔ سروے،

نئے سال کا پہلا شمارہ جنوری کا پرچا سالنامہ ہوگا۔ سالنامہ میں حسب روایت قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1۔ گیا سال مجموعی طور پر کیسا گزرا — ؟ گزرے سال کی کوئی بات یا واقعہ جو ہمیشہ یاد رہے گا — ؟

2۔ گزرا سال ذاتی حوالے سے کس لحاظ سے خاص رہا، اپنی کوئی بات یا مسئلہ جو آپ قارئین سے شیئر کرنا چاہتی ہیں؟

3۔ اس سال فارغ اوقات میں کیا مشغلہ رہا، مطالعہ کی، ٹی وی یا سیر و تفریح میں وقت گزرا — ؟

ان سوالوں کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 22 دسمبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول — مالا،
- عنبرین ابدال کا ناول — تو میری راہ گزر،
- صبا زین کے ناول کی دوسری اور آخری قسط — نازک،
- ثانیہ مرتضیٰ، کشف بلوچ، اُم ہانی، مریم شہزاد، راشدہ رفعت اور حمیرا شفیع کے افسانے،
- راحت جبیں اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- معروف مصنفہ قرۃ العین خرم ہاشمی سے ملاقات، ، باتیں ریحان ناظم سے،
- کرن کرن روشنی — احادیث نبوی کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

شلوار (یا پاجامہ) پہننا

حضرت سوید بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم سے شلوار کا سودا کیا۔

فوائد ومسائل:

1۔ سروایل کا ترجمہ شلوار یا پاجامہ دونوں طرح صحیح ہے کیونکہ یہ ایک ہی لباس ہے جس کی بناوٹ میں فرق ہے۔

2۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شلوار خریدنا یا اسے خریدنے کا ارادہ ظاہر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ جائز لباس ہے، البتہ کسی صحیح حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاجامہ پہننے کا ذکر نہیں۔

3۔ مرد کے لیے شلوار پہننا جائز ہے کیونکہ ارشاد نبوی: ''جسے (احرام باندھتے وقت) تہبند میسر نہ ہو وہ سراویل (شلوار یا پاجامہ) پہن لے۔''

(سنن ابن ماجہ، حدیث: 2931)

اگر احرام کی حالت میں مجبوری کی صورت میں مرد شلوار پہن سکتا ہے تو عام دنوں میں شلوار یا پاجامہ پہننا بالاولیٰ جائز ہوگا۔

عورت کا دامن کتنا دراز ہونا چاہیے؟

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا:

''عورت اپنا دامن کتنا لٹکائے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایک بالشت۔''

میں نے کہا۔

''تب اس (کے قدموں یا پنڈلیوں) سے کپڑا ہٹ جائے گا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔''

''ایک ہاتھ۔ اس سے زیادہ نہ لٹکائے۔''

(ابوداؤد)

فائدہ:

ایک بالشت یا ایک ہاتھ سے مراد ٹخنوں سے اس

pklibrary.com

فدر نیچے تک ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں: خلاصہ یہ ہے کہ مرد کی دو حالتیں ہیں: مستحب حالت یہ ہے کہ تہبند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھے۔ اور جائز حالت یہ ہے کہ ٹخنوں (سے اوپر) تک رکھے۔ اسی طرح عورتوں کی بھی دو حالتیں ہیں۔ مستحب حالت یہ ہے کہ مردوں کی جائز حالت سے ایک بالشت زیادہ ہو۔ اور جائز حالت ایک ہاتھ یعنی مردوں کی جائز حالت سے دو بالشت زیادہ۔ (فتح الباری: 320/10)

سیاہ عمامے (پگڑی) کا بیان

حضرت عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا:

''میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر خطبہ ارشاد فرماتے دیکھا جبکہ آپ نے سیاہ عمامہ باندھ رکھا تھا۔''

ریشم (کا لباس) پہننا بری بات ہے

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے دنیا میں ریشم پہنا، وہ آخرت میں نہیں پہنے گا۔'' (مسلم)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا:

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم اور سونا پہننے سے منع کیا اور فرمایا:

''وہ دنیا میں ان (کافروں) کے لیے ہے اور آخرت میں ہمارے لیے۔''

فوائد و مسائل:

1۔ خالص ریشم کے کپڑے پہننا، رومال بنانا اور بستر وغیرہ بنا کر اس پر بیٹھنا اور لیٹنا یہ سب کچھ مردوں پر حرام ہے۔

2۔ سونے کا زیور پہننا بھی مردوں پر حرام ہے، خواہ وہ ہار ہو، انگوٹھی ہو، گھڑی کی چین ہو، لباس کے

3۔ دنیا میں اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ممنوعہ اشیاء سے پرہیز کرنا بہت بڑی نیکی ہے جس کا ثواب یہ ہے کہ جنت میں ویسی ہی نعمتیں حاصل ہوں گی جو دنیا کی نعمتوں سے بدرجہا بہتر ہوں گی۔

4۔ رہن سہن کے طریقوں اور لباس وغیرہ کی بناوٹ میں غیر مسلموں سے امتیاز قائم رکھنا ضروری ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لکیر دار ریشمی کپڑے کا جوڑا دیکھا تو عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول! آپ یہ جوڑا وفود کے استقبال اور جمعے کے دن پہننے کے خرید لیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اسے تو وہی پہنتا ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ حلہ ایک طرح کے دو کپڑوں کو کہتے ہیں، ایک جسم کے اوپر کے حصے پر پہننے یا اوڑھنے کے لیے، دوسرا جسم کے زیریں حصے پر پہننے کے لیے، جیسے تہ بند وغیرہ، اس لیے اس کا ترجمہ ''جوڑا'' کیا گیا ہے۔

2۔ جمعہ اور عید وغیرہ کے موقع پر عمدہ لباس پہننا مستحب ہے، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا۔

3۔ مہمانوں کے استقبال کے موقع پر عمدہ لباس پہننا مستحسن ہے۔

4۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت رکھتے تھے اس لیے آپ کے لیے عمدہ چیز پسند کرتے تھے۔

5۔ کوئی مخلص خلوص اور محبت سے مشورہ دے اور وہ مشورہ درست نہ ہو تو سختی سے رد کرنے کے بجائے اس کی غلطی واضح کر دی جائے تاکہ اسے رنج

نہ ہو اور آئندہ اس غلطی سے بچ سکے۔

6۔ آخرت میں حصہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لباس کافر پہنتے ہیں جنہیں آخرت میں کوئی بھلائی نصیب نہیں ہوگی۔

کسے ریشم پہننے کی اجازت ہے؟

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو ریشم کی قمیصیں پہننے کی اجازت دی کیونکہ انہیں خارش کی تکلیف تھی۔ (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ ان حضرات کو جوؤں کی تکلیف بھی تھی۔ ممکن ہے خارش اسی وجہ سے ہو۔

2۔ جن جلدی بیماریوں میں دوسرا لباس تکلیف کا باعث ہو اور ریشمی لباس فائدہ مند ہو تو اس صورت میں مردوں کو یہ لباس پہننا جائز ہے۔

کپڑے میں ریشم کے نشان کی اجازت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ باریک اور موٹے ریشم (کا کپڑا پہننے) سے منع کرتے تھے مگر جو اتنا سا ہو۔ پھر (حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے) ایک انگلی سے اشارہ کیا، پھر دوسری سے، پھر تیسری سے پھر چوتھی سے اور فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس سے منع فرمایا کرتے تھے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ مرد کے لیے ریشم کا لباس پہننا حرام ہے لیکن کناروں پر تھوڑا بہت ریشم ہو تو جائز ہے۔

2۔ ریشم کے جواز کی حد زیادہ سے زیادہ چار انگلیوں کی چوڑائی تک ہے۔ اس سے کم ہو تو بہتر ہے، اس سے زیادہ جائز نہیں۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو عمر عبداللہ بن کیسان یمنی رحمتہ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

"میں نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے عمامہ خریدا جس (کے کنارے) پر (ریشم کے) نشان تھے۔ انہوں نے قینچی طلب فرمائی اور اسے کاٹ ڈالا۔ میں نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کیا تو انہوں نے فرمایا:

"تعجب ہے عبداللہ (رضی اللہ عنہ) پر (اور اپنی خادمہ کو آزاد دی)"

"اے لڑکی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ لاؤ۔"

وہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا) جبہ لائی جس کی آستینوں، گریبان اور دونوں طرف کے چاک کے کناروں پر ریشم لگا ہوا تھا۔

فوائد و مسائل:

1۔ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کنارے پر ریشم کے دھاگے سے کڑھائی کی ہوئی تھی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اتنا کنارہ کاٹ دیا۔

2۔ ایک بڑا عالم بھی کسی مسئلے میں غلطی کر سکتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل ہر عالم کے فتوے پر راجح ہے۔

3۔ مرد کے کپڑے پر اگر تھوڑا سا ریشم لگا ہوا ہو تو جائز ہے، خواہ وہ کڑھائی کی صورت میں ہو یا ریشمی کپڑے کے ٹکڑے کی صورت میں۔

عورتوں کے لیے ریشمی لباس اور سونے کا زیور پہننے کا بیان

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بائیں ہاتھ میں ریشم اور دائیں ہاتھ میں سونا لیا، پھر دونوں ہاتھ بلند کر کے فرمایا:

"یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام اور ان کی عورتوں کے لیے حلال ہیں۔"

pklibrary.com

فائدہ:

1۔ معمولی زینت تو درست ہے لیکن زیادہ زیورات پہننے سے امارات اور فخر وتکبر کا اظہار ہوتا ہے جس سے غریبوں کا دل دکھتا ہے، اس لیے اس سے اجتناب بہتر ہے۔

2۔ خاص طور پر زیورات پہن کر سفر کرنے سے بہت سے مفاسد سامنے آتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک حلہ (چادروں کا جوڑا) ہدیے کے طور پر پیش کیا گیا جس کا تانا یا بانا ریشم سے بنا ہوا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ حلہ میرے پاس بھیج دیا۔''

میں نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول! میں اسے کیا کروں؟ کیا میں اسے پہن سکتا ہوں؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''نہیں، اسے فاطماؤں کو اوڑھنیاں بنا دے۔''

فوائد و مسائل:

1۔ اگر کپڑا خالص ریشم کا نہ ہو بلکہ آدھا سوتی اور آدھا ریشمی ہو۔ تب بھی مردوں کے لیے اسے پہننا منع ہے۔

2۔ ''فاطماؤں'' سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر کی وہ خواتین ہیں جن میں سے ہر ایک کا نام ''فاطمہ'' تھا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اہلیہ تھیں۔ دوسری حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا۔ تیسری حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا۔

3۔ تحفہ دینا اور قبول کرنا مسنون ہے۔

مردوں کے لیے سرخ لباس پہننا جائز ہے

حضرت براء رضی اللہ عنہ سے رایت ہے، انہوں نے فرمایا:

''میں نے کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ صاحب جمال نہیں دیکھا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (بالوں میں) کنگھی کی ہوئی تھی اور سرخ چادریں (تہبند اور چادر) پہن رکھی تھیں۔ (مسلم)

فائدہ:

امام ابن قیم رحمتہ اللہ بیان کرتے ہیں ''حلہ'' کا مطلب تہبند اور اڑھنے والی چادر ہے اور ''حلہ'' کا لفظ ان دونوں کے مجموعے پر بولا جاتا ہے۔ یہ سمجھنا غلط فہمی ہے کہ یہ جوڑا خالص سرخ رنگ کا تھا اور اس میں دوسرا رنگ شامل نہیں تھا۔ سرخ حلے سے مراد یمن کی وہ چادریں ہوتی ہیں جو سرخ اور سیاہ دھاریوں کی صورت میں بنی ہوتی ہیں۔ جس طرح یمن کی دوسری چادریں (لکیردار) ہوتی ہیں۔ یہ لباس اس نام (سرخ حلہ) سے ان سرخ دھاریوں کی وجہ سے مشہور ہے ورنہ خالص سرخ (لباس) سے تو سختی سے منع کیا گیا ہے:

امام بخاری رحمتہ اللہ اس عنوان کے ذریعے سے (سرخ کپڑا پہننے کے) جواز کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔ گویا خالص سرخ رنگ کا جوڑا پہننا بھی مردوں کے لیے جائز ہے لیکن اگر کسی علاقے میں یہ رنگ عورتوں کے لیے مخصوص ہو چکا ہو تو پھر اس علاقے میں مردوں کے لیے اس سے اجتناب بہتر ہوگا کیونکہ عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا بھی ممنوع ہے۔

سرخ رنگ

حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کہ اتنے میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ آ گئے۔ انہوں نے سرخ قمیصیں پہن رکھی تھی۔ کبھی گرتے تھے، کبھی اٹھتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (منبر سے) اتر آئے اور انہیں گود میں اٹھا لیا۔ فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا:''

انما اموالکم و اولادکم فتنتہ

ترجمہ: تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہے۔"

"میں نے انہیں دیکھا تو مجھ سے صبر نہ ہوا۔"

پھر آپ نے خطبہ دینا شروع کر دیا۔ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سرخ لباس پہننا جائز ہے۔ ممکن ہے قمیصیں خالص سرخ رنگ کی نہ ہو۔

2۔ بچوں سے پیار معزز شخصیت کی شان کے خلاف نہیں بلکہ ایک خوبی ہے۔

3۔ خطبے کے دوران کسی ضرورت کے تحت منبر سے اترنا جائز ہے۔

4۔ مال اور اولاد کے آزمائش ہونے کا یہ مطلب ہے کہ بہت دفعہ انسان مال اور اولاد کی محبت کی وجہ سے غلط کاموں کا ارتکاب کر لیتا ہے، اس لیے مومن کو احتیاط سے کام لینا چاہیے کہ مال کی طلب میں یا اولاد کی محبت کی وجہ سے کوئی خلاف شریعت کام نہ ہو جائے۔

5۔ خطبے کے دوران موضوع سے غیر متعلق بات کرنے میں حرج نہیں بشرطیکہ وہ ضروری بات ہو۔

کسم کا رنگا ہوا کپڑا مردوں کے لیے مکروہ ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گہرے رنگ سے منع فرمایا۔

(حدیث کے راوی) یزید بیان کرتے ہیں (ابن عمر رضی اللہ عنہ کے شاگرد) حضرت حسن بن سہل رحمتہ اللہ سے دریافت کیا گیا، مفدم سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا:

"جو عصفر (کسم) سے خوب رنگا گیا ہو۔"

فوائد و مسائل:

1۔ معصفر کا مطلب ہے عصفر سے رنگا ہوا۔ وہ ایک زرد رنگ کی چیز ہے جس سے کپڑے رنگتے جاتے ہیں۔ المفدم کی تشریح یوں کی ہے: "انتہائی سرخ۔ گویا وہ اتنا زیادہ سرخ ہے کہ مزید سرخ نہیں ہو سکتا۔" ممکن ہے کسم کا پودا زرد ہونے کے باوجود اس سے رنگا ہوا کپڑا سرخ ہو جاتا ہو۔

2۔ گہرے کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسم کا رنگا ہوا کپڑا اگر ہلکے رنگ کا ہو تو مردوں کے لیے جائز ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عصفر (کسم) کا رنگا ہوا کپڑا پہننے سے منع فرمایا۔ اور میں نہیں کہتا: تمہیں منع فرمایا۔

فائدہ:

1۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علی! کسم کا رنگا ہوا مت پہن، یہ نہیں فرمایا: لوگوں! یہ رنگ نہ پہنو۔ تاہم حکم سب کے لیے ایک ہی ہے۔

موت کی تمنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! دنیا ختم نہیں ہوگی حتی کہ (یہ نوبت آجائے گی کہ) آدمی کسی قبر کے پاس سے گزرے گا تو اس پر گر پڑے گا اور کہے گا۔ کاش! میں اس قبر والے کی جگہ (مرکر دفن ہو چکا) ہوتا۔ وہ دین (کے بارے میں پیش آنے والی مشکلات) کی وجہ سے ایسے نہیں کرے گا بلکہ (دنیوی) مشکلات کی وجہ سے کرے گا۔"

فوائد و مسائل:

1۔ دنیاوی مشکلات میں اللہ سے مدد مانگنا اور حالات بہتر بنانے کی کوشش کرنا بہتر طریقہ ہے۔

2۔ دنیا کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا منع ہے۔

3۔ دین کی حفاظت کی فکر دنیا سے زیادہ ہونی چاہیے۔

☆

pklibrary.com

انشاجی کی ایک پنجابی نظم

تینوں دسیا تے توں ہسنا اے
اسیں تینوں کجھ نئیں دسنا اے
بس اگ اپنی وچ جلنا اے
اور آپے پکھا جھلنا اے
اَسیں پکّے آں تُو خام کُڑے
کُجھ ہویا نئیں کی ہونا سی
اک دن دا ہسنا رونا سی
اوہ ساگر چھلاں ایویں سی
اوہ ساریاں گلاں ایویں سی
پر چرچا کرنا تمام کُڑے

اسیں کہندے کہندے مر جانا
تُوں ہسدے ہسدے مر جانا
اسیں اُجڑے اُجڑے رہ جانا
تُوں وسدے وسدے مر جانا
ہاں سوچ لیا انجام کُڑے
اک گھر وچ دیوا بلدا ای
کی دیکھ ستندیے گھلدا ای
کیوں پورب پچھم جانی ایں
کیوں من اپنا بھٹکانی ایں
گھر آجا پے گئی شام کُڑے

pklibrary.com

ریحان ناظم سے باتیں

شاہین رشید

1 ''اصلی نام/معنی؟''

''ریحان ناظم/جنت کا پھول۔''

2 ''پیار کا نام؟''

''دوست رونی بولتے ہیں جبکہ گھر میں سب ریحان۔''

3 ''تاریخ پیدائش/سال؟''

''25/12 تاریخ پیدائش اور سال 1984ء۔''

4 ''قد؟/ستارہ؟''

''5 فٹ 11 انچ/ستارہ کیپری کورن۔''

5 ''مادری زبان؟''

''اردو۔''

6 ''فیملی ممبر/آپ کا نمبر؟''

''پانچ افراد ہیں اور تین بھائیوں میں میرا نمبر دوسرا ہے۔''

7 ''شادی/بچے؟''

''جی شادی ہوگئی ہے اور الحمدللہ ایک بیٹا ہے۔''

8 ''تعلیم؟''

''اے لیول/اے سی سی اے/ڈپلومہ تھیٹر ایکٹنگ۔''

9 ''شوبز میں آمد/گھر والوں کا ردعمل؟''

''شوبز میں آمد کافی سال پہلے ہوئی..... شروعات گلوکاری سے کی اور گلوکاری کو سولہ سال ہو گئے ہیں جبکہ اداکاری کی فیلڈ میں دو سال سے ہوں۔''

10 ''بچپن میں کس سے بہت ڈر لگتا تھا؟''

''اندھیرے اور ابو کی ڈانٹ سے۔''

11 ''پہلی کمائی کتنی تھی اور کس کے ہاتھ میں رکھی؟''

''تو ہزار تھی اور خود ہی خرچ کر ڈالی تھی۔''

12 ''بچپن کا پہلا پیار؟''

''کلاس فورتھ میں ایک لڑکی تھی۔''

13 ''آپ کا سورج کب طلوع ہوتا ہے؟''

''کام ہو تو نو بجے ورنہ بارہ بجے۔''

14 ''صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟''

''چائے..... چائے اور چائے۔''

15 ''کیا برداشت نہیں۔ بھوک یا غصہ؟''

''بلاوجہ کا غصہ..... ویسے میں بڑا ٹھنڈے مزاج انسان ہوں۔''

16 ''پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟''

''جو بھی کچھ آج میں ہوں۔ پاکستان کی وجہ سے ہوں۔ بس کرپشن ختم ہو جائے اس ملک سے.....''

17 ''سیاست میں کون پسند ہے؟''

''سچ بولوں تو کوئی بھی نہیں..... لیکن ہاں پرویز مشرف صاحب بہت پسند تھے۔''

18 ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''

''دبئی میں پیدا ہوا تھا..... تو یو اے ای کی مل جاتی تو

pklibrary.com

کیا ہی بات ہوتی۔"

19 "کیا آپ کو وڈ کا شکار ہوئے؟"

"ذائقہ اور خوشبو دس دن کے لیے چلے گئے تھے ٹیسٹ کروایا تو نگیٹو آیا۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہوا تھا کہ نہیں۔"

20 "لاک ڈاؤن میں وقت کیسا گزرا؟ شوبز میں کیا، اچھا کیا برا ہے؟"

"فیملی کے ساتھ گزرا اور اچھا گزرا..... الحمدللہ اور اچھائی اور برائی ہر فیلڈ میں ہے بس یہاں میرٹ پہ کام بہت کم ملتا ہے جان پہچان ہو تو زیادہ کام ملتا ہے۔"

21 "اسپورٹس سے آپ کا لگاؤ؟ کون سا کھیل پسند ہے؟"

"بہت زیادہ لگاؤ ہے۔ بہت سے کھیل پسند ہیں۔ لیکن کرکٹ پسندیدہ ترین ہے۔"

22 "زندگی سے کیا سیکھا؟"

"مشکلات آتی رہیں گی۔ بس اللہ پر بھروسا رکھو۔ مسکراؤ..... محبت کرو اور آگے بڑھو۔"

23 "تین چیزیں جنہیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟"

"بس دنیا گھومنا چاہتا ہوں۔"

24 "کس کی خاطر شوبز چھوڑ سکتے ہیں؟"

"روزی روٹی پہ لات کیوں ماروں گا کسی کے کہنے پر۔ ہاہاہا۔"

25 "پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو کیا کیفیت تھی؟"

"سچ بولوں تو تھوڑی سی گھبراہٹ تھی..... کانشس تھا کنفیوژ تھا مگر اب یہ بات تیرہ سال پرانی ہو گئی ہے۔"

26 "تنہائی کا احساس کب ہوتا ہے؟"

"جب قسمت آپ کا ساتھ نہ دے رہی ہو۔"

27 "گھر کی کوئی چیز خراب ہو جائے تو ٹھیک کروانے کی ذمہ داری کس کی ہوتی ہے؟"

"چونکہ ہم جوائنٹ فیملی میں رہتے ہیں تو زیادہ تر میری امی پہ ذمہ داری لے لیتی ہیں..... لیکن ہم بھی پورا ساتھ دیتے ہیں۔"

28 "زندگی میں کچھ واپس ملنے کا چانس ملے تو کیا واپس لینا چاہیں گے؟"

"الحمدللہ کچھ بھی نہیں۔"

29 "گھر میں آپ کے فیصلے پر مخالفت کون کرتا ہے؟"

"اس کے پیچھے صرف میری بیگم ہو سکتی ہیں۔"

30 "بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟"

"اندر ہی اندر بہت گھبرا جاتا ہوں۔ باہر شو نہیں کرتا۔"

31 "آپ کے اب تک کے ڈراموں، فلمز اور کمرشلز کی تعداد؟"

"ڈرامے زیادہ نہیں کیے۔ فلم ایک کی ہے جبکہ کمرشلز میں نے کافی سارے کیے ہیں۔"

32 "لٹریچر سے آپ کا لگاؤ..... کس کس کو پڑھا؟"

"سچ پوچھیں تو مجھے فلمیں دیکھنے کا شوق ہے۔ لٹریچر صرف تھیٹر کی حد تک پڑھا ہے۔"

33 "کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟"

"جو بھی فیصلے کیے ہیں، ان سب سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہی ہے۔ تو کوئی کا نہیں کسی فیصلے سے۔"

34 "کچن سے لگاؤ؟ کبھی شیف بننے کی خواہش ہوئی؟"

"کچن سے تو کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے۔ لیکن کھانے سے بہت لگاؤ ہے۔"

35 "کبھی سوچا کہ اگر سوشل میڈیا نہ ہوتا تو؟"

"سوشل میڈیا کے بہت فوائد ہیں اس لیے ایسی سوچ کبھی نہیں آئی۔"

36 "کس شخصیت پر چاہتے ہوئے بھی غصہ نہیں کر سکتے؟"

"ماں پر۔"

37 "میٹھے اور نمکین میں کیا بہت زیادہ پسند ہے؟"

"میٹھے میں کیک بہت زیادہ پسند ہے..... اور نمکین

pklibrary.com

میں اسپائسی فوڈ...... چاہے کچھ بھی ہو۔''
38 ''ایک نصیحت جو سب کو کرتے ہیں؟''
''خوش رہیں اور دوسروں کو بھی خوش رہنے دیں۔''
39 ''ملک کی ترقی میں کون رکاوٹ ہے عوام یا حکمران؟''
''دونوں اپنا کردار بھرپور طریقے سے نبھا رہے ہیں۔''
40 ''رول کون سے اچھے لگتے ہیں نیگیٹو یا پوزیٹو؟''
''فلم میں نیگیٹو رول کیا ہے۔ ڈراموں میں پوزیٹو...... اور دونوں طرح کے رول کرنے میں مزا آیا۔ نیگیٹو میں زیادہ مارجن ہوتا ہے۔''
41 ''کبھی غربت میں وقت گزارا؟''
''مشکل وقت کون نہیں دیکھتا...... بس ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔''
42 ''طالب علمی کے زمانے میں کون سا مضمون برا لگتا تھا؟''
''کیمسٹری...... نفرت تھی۔''
43 ''ڈاکٹر، حکیم اور ہومیوپیتھک کس پر زیادہ یقین ہے؟''
''ڈاکٹرز کے پاس زیادہ جانا ہوتا ہے، اس لیے ڈاکٹرز پر یقین ہے۔''
44 ''پاکستان میں کیا چیز فری ملنی چاہیے؟''
''پانی۔''
45 ''اپنے ہر کام کے لیے کس سے مشورہ لیتے ہیں؟''
''اپنی بیگم سے۔''
46 ''کیا دل سے اترا ہوا انسان پہلے جیسا مقام حاصل کر سکتا ہے؟''
''جہاں تک میرا اپنا سوال ہے تو میرے لیے بہت مشکل ہوتا ہے دل میں ایسے انسان کے لیے واپس جگہ بنانا۔''
47 ''مستقل طور پر ملک سے باہر [illegible] گے؟''

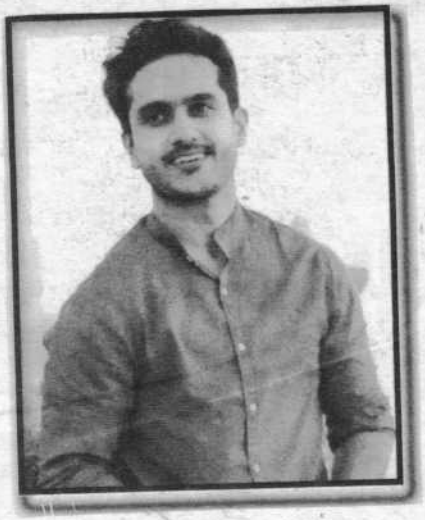

تو آپ کی کیا ایکٹیوٹیز ہوں گی؟''
''جم جاؤں گا۔ کام پر جاؤں گا اور فیملی کے ساتھ وقت گزاروں گا۔''
48 ''غصے میں منہ سے کیا نکلتا ہے؟ برے الفاظ یا جھاگ؟''
''ہاہاہا...... اگر آپشن یہی ہے تو پھر جھاگ۔''
49 ''ٹی وی ٹاک شو کے بہترین اینکر پرسن؟''
''وسیم بادامی۔''
50 ''آپ کا راز دار؟''
''میں راز کو راز ہی رہنے دیتا ہوں۔ کسی کو نہیں بتاتا۔''
51 ''فیملی پر آپ کا کتنا رعب ہے؟''
''غصہ آتا ہی نہیں ہے...... سب سے پیار سے پیش آتا ہوں۔''
52 ''کون سی تاریخیں یاد رکھتے ہیں؟''
''شادی کی اور گھر والوں کی سالگرہ کی۔''
53 ''ایک کھانا جو اپنی ٹائم کھا سکتے ہیں؟''
''فرنچ فرائز۔''
54 ''اپنی پرفارمنس میں کیا کمی محسوس کرتے

pklibrary.com

''ابھی تو بہت کچھ سیکھنا ہے۔ ایموشنل سین اور بہتر کرسکتا ہوں۔''

55 ''اپنا ڈرامہ دیکھ کر کیا سوچتے ہیں؟''

''خوشی ہوتی ہے اور مزا آتا ہے۔''

56 ''کس چینل پر ریموٹ رک جاتا ہے؟''

''اسپورٹس یا کسی بھی مووی چینل پر۔''

57 ''پہلی فلم جو سینما میں دیکھی؟''

''سرگم۔''

58 ''آپ کا ناقابل فراموش کردار؟''

''ایک فلم کی ہے ''گواہ رہنا'' ابھی ریلیز نہیں ہوئی۔ اس میں ''چھوٹو داس'' کا کردار کیا ہے جو کہ ولن ہے۔''

59 ''کس رول کو کرنے سے انکار کیا؟''

''ابھی تک ایسا کردار نہیں ملا کہ انکار کرنا پڑا ہو۔''

60 ''کس سیاست دان کا رول کرنے کی خواہش ہے؟''

''اگر کبھی موقع ملا تو عمران خان کا رول کرنا چاہوں گا۔''

61 ''علم نجوم پر یقین؟ کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟''

''علم نجوم پر بالکل بھی یقین نہیں ہے اور نہ ہی کبھی کسی نجومی کو ہاتھ دکھایا ہے۔''

62 ''کس کام کو کرنے کے لیے بہت سوچتے ہیں؟''

''جب کپڑے استری کرنے ہوں۔''

63 ''شادی کے بعد کس شوق کو قربان کیا؟''

''کمپیوٹر گیمنگ کے شوق کو۔''

64 ''آئینے کو کتنا وقت دیتے ہیں؟''

''صرف اس وقت جب تیار ہونا ہوتا ہے۔''

65 ''کیا شادی کرنا ضروری ہے؟''

''ضروری تو بالکل بھی نہیں ہے لیکن اچھا ہے اگر انسان کرلے اور پھر اس کو اچھی طرح سے نبھائے۔''

66 ''اپنا کل سوچ کر کیا احساسات ہوتے ہیں؟''

''کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اے لیول کے بعد کوئی گائیڈ کرنے والا ہوتا تو اور بھی اچھا ہوتا۔''

67 ''سگنل پہ کھڑے ہو کر کس چیز کا جائزہ لیتے ہیں؟''

''دوسری گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا.....اور بھیک مانگنے والوں کا۔''

68 ''بچپن میں کون سے فنکار پسند تھے فلم اور ٹی وی کے؟''

''معین اختر صاحب کو بہت دیکھتا تھا.....اور بچپن میں بالی ووڈ کی فلمیں بہت دیکھتا تھا۔''

69 ''خواتین رائٹرز میں آپ کی پسندیدہ رائٹر؟''

''جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ میں نے زیادہ ادب پڑھا نہیں ہے۔''

70 ''بچپن میں کون کون سے کھیل کھیلے؟''

''ہر طرح کے.....کھیلنے کودنے کا تو اب تک شوق ہے۔''

71 ''شاپنگ کے لیے نکلتے ہیں تو کس کا خیال آتا ہے؟''

''شاپنگ کے لیے ہمیشہ پلان کر کے نکلتا ہوں تو جس کے لیے سوچ کر جاتے ہیں، اسی کا خیال آتا ہے اور اسی کے لیے شاپنگ ہوتی ہے۔''

72 ''کب ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتے ہیں؟''

''جب لوگ میرے کام کی تعریف کر رہے ہوتے ہیں۔''

73 ''کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنیں؟''

''ہاں بہت دفعہ ہاہاہا.....''

74 ''اپنی کمائی کس چیز پر خرچ کرتے ہیں؟''

''والدین، شاپنگ اور کھانے پینے پر۔''

75 ''اگر آپ کو کسی سلیبریٹی کا انٹرویو کرنا پڑے تو کس کا کریں گے؟''

''مائرہ خان۔''

76 ''نیند کتنی پیاری ہے؟''

pklibrary.com

"بہت زیادہ۔"

77 "آپ کے گھر میں کون کون اس فیلڈ میں ہے؟"

"میری بیگم..... باقی کسی کو نہ تو شوق ہے اور نہ ہی یہ والی اسکل ہے۔"

77 "بچت کس شکل میں کرتے ہیں؟"

"گولڈ، پراپرٹی یا پراویڈنٹ۔"

78 "شادی میں کن رسموں کے خلاف ہیں؟"

"جہیز کے..... خاص طور پر اس وقت تو بہت غصہ آتا ہے جب لوگ ڈیمانڈ کرتے ہیں۔"

79 "خواتین آئینے کو زیادہ وقت کیوں دیتی ہیں؟"

"کیوں کہ خواتین اپنے آپ کو بہت پسند کرتی ہیں۔"

80 "آج کی فکر زیادہ ہوتی ہے یا کل کی؟"

"آج کی۔"

81 "صبح اٹھتے ہی کیا بات لبوں سے نکلتی ہے؟"

"بیگم اور بچے کو گڈ مارننگ وش کرنا۔"

82 "کیمیلی میں کون مزاج کا گرم ہے؟"

"میرا چھوٹا بھائی..... کوئی حد ہی نہیں ہے غصے کی۔"

83 "بچپن کا کون سا خواب پورا نہیں ہوا؟"

"بچپن میں پاکستان کے لیے کرکٹ کھیلنے کا خواب تھا۔ وہ پورا نہیں ہوا۔"

84 "پسندیدہ تہوار؟"

"عید۔"

85 "اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں کے؟"

"اپنے تجربے سے۔"

86 "کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟"

"چائے..... کبھی کبھی بھی۔"

87 "مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتے ہیں؟"

"مشکل سوال ہے..... دس سے بارہ دن تو کہیں نہیں گئے۔ مطلب دس سے بارہ دن۔"

88 "کیا چیز لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"

"موبائل فون۔"

89 "کھانا کہاں کھانا پسند ہے۔ بیڈ، ڈائننگ ٹیبل یا چٹائی؟"

"ڈائننگ ٹیبل پر....."

90 "گھر میں کس کے لیے اپنا شیڈول بدل سکتے ہیں؟"

"والدین اور بیگم کے لیے۔"

91 "اچھی اور بری خبر سب سے پہلے کس کو سناتے ہیں؟"

"اپنی بیگم کو۔"

92 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو..... ہمت نہیں ہاروں گا محنت پھر بھی کرتا رہوں گا۔"

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

زرد موسم	راحت جبیں	1000/-
حساب دل رہے دو	نبیلہ عزیز	400/-
محبت من محرم	سمیرا حمید	400/-
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	500/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	400/-
دست مسیحا	نگہت سیما	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

pklibrary.com

آپ کی پسندیدہ مصنفہ

قرۃ العین خرم ہاشمی سے ملاقات

شاہین رشید

ایک زمانہ تھا جب پاکستان میں ایک ہی ڈراما چینل پی ٹی وی تھا۔ اس چینل پر بھی ڈراموں کا حصہ بہت کم تھا چونکہ پی ٹی وی پر خبرنامہ اور دیگر پروگراموں کو بھی جگہ دینا ہوتی تھی۔ ان دنوں جو فنکار ڈراما سیریل میں کام کرتا، راتوں رات مشہور ہوجاتا۔ پی ٹی وی پر اداکاروں کے نام بھی بہت نمایاں طور پر دکھائے جاتے تھے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ سینکڑوں ڈراما چینلز ہیں، جن پر بے شمار ڈرامے چل رہے ہیں۔ بیشتر کے اختتام پر فنکاروں کے نام اتنی تیزی سے دکھائے جاتے ہیں اور اتنے خفی ہوتے ہیں کہ ان کو پڑھنا دشوار ہوتا ہے۔ چند ایک کے سوا ناظرین بیشتر کے نام سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ پھر نیٹ کی سہولت بھی ہر جگہ نہیں۔ اس لیے بہت سے لوگ ڈرامے دیکھ بھی نہیں پائے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے قارئین کی فرمائش ہوتی ہے کہ ان مصنفین کے انٹرویو شائع کیے جائیں جو ہمارے ہاں لکھ رہی ہیں۔

اس ماہ ہم نے انٹرویو کے لیے قرۃ العین خرم ہاشمی کا انتخاب کیا ہے۔ قرۃ العین خرم ہاشمی کو لکھتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن مختصر عرصہ میں وہ اپنی

pklibrary.com

شناخت بنانے میں کامیاب رہی ہیں۔ انٹرویو طویل ہے، اس لیے اسے دو حصوں میں پیش کر رہے ہیں۔

''کیا حال ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''آج کل کیا مصروفیات ہیں؟''

''سب سے پہلے تو آپ کا اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کا بہت شکریہ کہ مجھے اس اہم اور مشکل سوالنامے کی کرسی پر بیٹھنے کا موقع دیا۔ اگرچہ میرے جیسے لوگوں کے لیے ''میں'' کی گردان کرنا یا اپنے بارے میں بات کرنا مشکل کام ہے مگر زندگی آسانی کی میز پر کچھ سرو نہیں کرتی۔

آج کل کی مجی مصروفیات میں ایک قریبی شادی کو اٹینڈ کر کے فارغ ہوئی ہوں۔ لکھنے کے حوالے سے اسکرپٹ رائٹنگ اور بچوں کے ادب میں کچھ تجرباتی کام اور ماورائی کردار تخلیق کرنے کی کوشش میں ہوں۔

''آپ کا نام؟ بیک گراؤنڈ کیا ہے؟''

ابو نے اپنے بچوں کے نام بہت سوچ سمجھ کر رکھے۔ اس لیے ہمیں ہمیشہ اس حوالے سے کچھ نہ کچھ سننے کو ملا ہے۔ ایک تقریب میں 'عمیرہ احمد' سے ملاقات ہوئی تو فرحت العین (بہن) کا نام آٹوگراف میں لکھتے ہوئے سوچ میں پڑ گئیں اور بے ساختہ ہنس کر کہا کہ ''آپ کے مشکل نام سے مجھے بے اختیار مستنصر حسین تارڑ یاد آ گئے ہیں'' جس پر آس پاس کھڑے سب لوگ ہنس پڑے.....

جبکہ مجھے اپنے نام پر دلچسپ تبصرے قلمی سفر میں سننے کو ملتے رہے..... ابتدا میں ایک انٹرنیشنل ادبی پلیٹ فارم پر انڈیا کی مشہور افسانہ نگار نے میرے افسانے پڑھ کر بے ساختہ کہا کہ ''آپ کے نام کی طرح آپ کا افسانہ بھی بہت خوب صورت ہے۔'' اس تعریف پر میں کافی عرصہ خوش ہوتی رہی۔

مگر ایک بار لاہور بک فیئر میں قابل احترام ایڈیٹر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے گھور کر فرمایا کہ ''ویسے تو آپ اچھا لکھتی ہیں مگر آپ کا نام کافی طویل ہے۔ اس کا کچھ کریں'' اب یہ تعریف تو نہیں تھی۔ بہرحال ہنس کر ٹال دیا۔ بالکل اسی طرح جیب بہت سے میگزین فہرست میں میرا نام قرۃ العین ہاشمی لکھتے ہیں اور میرے اعتراض کرنے پر سادگی سے کہتے ہیں کہ جگہ کی کمی کی وجہ سے آپ نام مختصر لکھا ہے۔

انڈیا سے ایک خاتون ہمارے ڈائجسٹ کی کہانیوں کی دیوانی ہیں انہوں نے کہا کہ مجھے آپ کا ''ناولی'' سا نام بہت اچھا لگتا ہے (یہ ناول سے ناولی ان ہی کی ایجاد ہے) طویل نام کے پیچھے کی داستان بہت مختصر ہے ''کہانی'' سے خرم ہاشمی کا سفر۔ جسے زیب داستاں نے کیا سے کیا بنا دیا..... خاندان اور قریبی لوگ مجھے عینی کہتے ہیں جبکہ ابو مجھے پیار سے ''عینا'' کہتے تھے اور دوست احباب ''قرت'' کہتے ہیں۔''

pklibrary.com

”میری والدہ کا تعلق لاہور سے اور والد کا راولپنڈی سے ہے۔ پنڈی سے کچھ دور اونچے نیچے راستوں پر ان کا آبائی گاؤں ہے۔ جہاں وہ پرانی اور بوسیدہ حویلی، آج بھی کسی آسیب زدہ مسکن جیسی ہے۔ جس کے ساتھ چلتی پگڈنڈی، سرسبز زمین کے اس حصے تک جاتی ہے جہاں گزشتہ دو سال سے میرے والد محوِ خواب ہیں۔ والد کے بارے میں چند جملوں میں لکھنا شاید ممکن نہیں ہوگا۔

اپنی شادی سے پہلے 1971 کی جنگ کے قابل فخر فوجی جن کا نام دوبار ستارہ جرأت کے لیے نامزد ہوا۔ جیسے ہیرو آپ ناولز میں پڑھتے یا تصور کرتے ہیں، ان کی ظاہری شخصیت اور بہادری بالکل ویسی ہی تھی۔ ان کی بہادری جرأت کے قصے بہت دور تک تھے۔

وہ گمنام ہیرو تھے جن کے بارے میں ان کے علاقے کے سب لوگ جانتے ہیں۔ آج بھی ان کے علاقے اور گاؤں کے لوگ ان پر فخر کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی تحصیل کے پہلے فوجی افسر تھے..... ابو نے اپنی آخری سانس تک اپنے علاقے کے لوگوں کی بہتری اور روزگار کے لیے کام کیا..... مواقع پیدا کیے..... ان کی وفات کے بعد کئی ماہ تک لوگ ان کی تعزیت کے لیے آتے رہے تھے..... ابو بہترین اسپورٹس مین، کوہ پیما تھے۔ پہاڑوں اور فطرت کے سچے عاشق..... ابو کے بعد مجھے ان کے کاغذات میں سے کوہ پیمائی کے ادارے کا پراسپیکٹس ملا جو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا۔

ابو نے اردو، پنجابی، پوٹھوہاری اور انگریزی میں شاعری کی..... شادی کے بعد ایم اے انگلش (پوزیشن ہولڈر) کیا۔ ایل ایل بی، سول ڈیفنس کے کورسز اور بہت سے ڈپلومے بھی لیے انہیں پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی شاعری کو کتابی شکل دی۔

ابو نے سعودی عرب میں ملازمت کے دوران بنائے..... آخری عمر میں ایک ایسا اسلامی کیلنڈر بنا رہے تھے۔ جس سے نئی اور آنے والے سالوں کی درست دن، تاریخ وغیرہ پتا چل سکے۔ میرے والد کا نام محمد بشارت اظہر کیانی تھا..... والدہ ہماری ہاؤس وائف تھیں مگر اپنی خوبیوں، عادتوں، سلیقے اور بہترین کوکنگ کی وجہ سے ہمیشہ مرکز نگاہ رہیں.....

ہماری مادری زبان پنجابی ہے مگر ہمارے گھر میں صرف اردو بولی جاتی تھی۔ جبکہ والدین اپنی آپس کی گفتگو پنجابی میں ہی کرتے تھے۔ اسی لیے شادی سے پہلے مجھے پنجابی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مگر سسرال میں سب لوگ زیادہ تر پنجابی بولتے ہیں تو میں نے کافی چیزیں سیکھ لی ہیں۔ میری خراب پنجابی پر میری ساس ہنستی ہیں۔

والدین کی شادی 1975 میں ہوئی اور ہم سات بہن بھائی اس دنیا میں آئے..... مجھ سے بڑے تین بھائی ہیں۔ پھر میں ہوں۔ میرے بعد دو بہنیں اور ایک بھائی ہے جیسا کہ بتایا میرا نمبر چوتھا ہے یعنی درمیان کی..... اور ساری زندگی مجھے اپنا آپ ”پل“ کی طرح ہی لگا ہے۔ یعنی ان کے درمیان رابطے کروانے میں پیش پیش رہتی ہوں۔ میری پیدائش پر ابو بہت خوش تھے۔ ان کے ساتھ میرا تعلق ہمیشہ خاص رہا ہے، میری پیدائش 15 نومبر 1982 کی ہے۔ میں حیدرآباد سندھ میں پیدا ہوئی۔ بچپن کے کچھ سال ابو کی پوسٹنگ کی وجہ سے سندھ میں گزرے اسی لیے وہاں سے بہت انسیت ہے۔ پھر ڈی جی خان اور ملتان میں اور اس کے بعد مستقل رہائش لاہور میں اختیار کی کیونکہ ابو جاب کی وجہ سے سعودی عرب چلے گئے۔

میں الحمدللہ شادی شدہ ہوں۔ شادی کو کافی سال گزر چکے ہیں..... شوہر میڈیا پرسن ہیں۔ اپنے گھر کے چھوٹے اور لاڈلے ترین فرد ہیں۔ تعلیم ایم ایس سی نفسیات ہے۔ شادی کے بعد اسی مضمون میں ایک سال کا ڈپلوما چند کمپیوٹر کورس وغیرہ کیے تھے۔

pklibrary.com

"بچپن کا نقشہ میں ایسے کھینچ سکتی ہوں کہ جیسے آپ کوئی انگلش فلم یا فینٹسی کہانی میں خوب صورت بڑے پراسرار گھروں میں پھولوں، تتلیوں، جگنوؤں کے علاوہ چند پراسرار چیزوں کے درمیان وقت کو گزرتا دیکھتے ہیں..... ہمارا بچپن بھی ایسا ہی ڈرامائی، ایڈونچر سے بھرا اور خوب صورت تھا.....

چونکیہ کالونی کا ماحول بہت محفوظ اور سکیورٹی بہت سخت تھی، اس لیے ہم اپنی اپنی سائیکل پر طویل وعریض کالونی کو دریافت کرنے نکل جاتے تھے۔ اتنے بڑے گھروں میں بھی رات کے وقت گھنی جھاڑیوں میں جگنوؤں کے جھنڈ دیکھتے، خوش ہوتے، انہیں پکڑنے کی کوشش کرتے۔

میں نے میٹرک تک سائیکلنگ کی ہے اور مجھے آج بھی اپنی BMX کی کالے رنگ کی سائیکل یاد ہے۔ جو میری یادوں کے آنگن میں کھڑی میرے بچپن کی منتظر ہے، جس نے ہر خوب صورت اور حسین موسم میں طویل سڑکوں پر میرا ساتھ دیا تھا..... فطرت سے قریب رہنے کی وجہ سے حساسیت بہت ہے اور مشاہدہ بھی گہرا ہے.....

خوف اور ڈر میری فطرت میں نہیں ہے مگر میں فطرتاً خاموش طبع اور صلح جو ہوں اور کافی حد تک شرمیلی بھی اسکول میں۔ میری لڑائی ہمیشہ مجھ سے ایک سال چھوٹی بہن "نور" لڑتی تھی۔ حتیٰ کہ بڑے ہو کر بھی کسی شادی کے رش میں کھانا نکال کر لانا بھی نور کا ہی کام ہوتا تھا۔ میں رش سے گھبرا کر ایک کونے میں بیٹھ کر کھانے کا انتظار کرتی تھی۔ یہی حال کالج کینٹین میں ہوتا تھا..... میں کبھی بھی لوگوں کو دھکا دے کر آگے نہیں آتی تھی اور یہ عادت آج تک کام آرہی ہے۔

ہم سب بہن بھائیوں کی سالگرہ بہت دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ بڑے سے باغ کو یا صحن کو غباروں سے سجایا جاتا تھا اور مختلف گیمز کھیلتے جس پر انعام بھی دیا جاتا تھا۔ ابو کو سرپرائز دینے کی عادت تھی۔ وہ ہر سال عید پر سب بچوں کے اسکول میں عید کارڈ بھیجتے اور باقی بچوں کی حیرانی کا رنگ بہت الگ ہوتا تھا۔

میں معصوم زیادہ تھی یہ بات میرے والد، میرے استاد میری ساس سب نے کہی۔ والد سعودیہ جارہے تھے تو انہوں نے امی کو خاص ہدایت کی "عینا" کا خیال رکھنا۔ یہ بہت معصوم ہے، حیدرآباد کے اسکول کی پرنسپل مسز سعیدہ بھی اسی وجہ سے مجھ سے خاص لگاؤ رکھتی تھیں۔

انٹرن شپ کے آخری دنوں میں چند ماہر نفسیات ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جب ڈاکٹر عائشہ نے مجھے پوائنٹ آؤٹ کیا اور سلجھی ہوئی شخصیت کی تعریف کی تو ہماری ہیڈ مسز ممتاز نے ہنستے ہوئے کہا۔ "قرۃ العین وہ سلجھا ہوا معصوم بچہ ہے جسے آپ کسی بھی عمر میں گود لے سکتے ہیں۔" میں پڑھائی میں ایوریج تھی مگر دوسری ایکٹویٹیز میں بہت تیز تھی۔

ہمارے گھر میں ہر کام کے لیے الگ سے مدد گار آتے تھے۔ مگر اس کے باوجود امی نے بچپن سے ہی ہمیں چھوٹے موٹے کام سکھائے تھے جس میں پہلے چائے بنانا اور پھر روٹی بنانا تھی۔ میں ساتویں، آٹھویں کلاس میں تھی تو بہت عمدہ گول روٹی پکا لیتی تھی۔ ہمارے گھر کا ماحول ادبی تھا۔ میرے والد نے نہ صرف دنیا بلکہ دین کی تعلیم بھی اتنی ہی خوب صورتی سے ہمیں دی، ہمارے گھر میں سب رات کو سونے سے پہلے سے لاؤنج میں جمع ہوتے تب حدیث کی کتاب میں سے ابو ایک حدیث پڑھ کر سناتے جسے سب غور سے سنتے تھے۔ ہمارے گھر میں لمبی لمبی نصیحتیں نہیں کی جاتی تھیں بلکہ عملی اقدام زیادہ تھے۔ رزق حلال کمانا، نماز کبھی نہ چھوڑنا چونکہ ابو اس کا عملی نمونہ تھے تو سب بچے اس لائن پر سختی سے چل رہے تھے۔"

"لکھنے کا عمل کب سے جاری ہے، اور کس سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا؟"

"میں تب سے لکھ رہی ہوں جب پہلی بار پنسل

پکڑی تھی... اب اس عمر میں بچے سوائے اپنے تخیل کے کس سے متاثر ہوں گے۔ میں پیدائشی رائٹر ہوں اس لیے کہ میری شخصیت کا نوے فیصد حصہ مجھے اپنے والد سے ملا ہے۔ میں تیسری یا چوتھی کلاس میں تھی تب سے بچوں کی کہانیاں لکھ رہی ہوں اور میری یہ کہانیاں اخبار جہاں کے صفحے بزم اطفال میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اگر پرانے میگزین دیکھیں تو ''قرۃ العین کیانی'' کا نام ضرور نظر آئے گا۔ ہمارے بچپن میں بچوں کے تمام میگزین حتیٰ کہ اخبار میں شائع ہونے والا ہفت روزہ بچوں کا صفحہ بھی ابو گھر لاتے تھے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق فطری تھا۔

ابو کی وجہ سے شاعری سے پہلا تعارف علامہ اقبال سے ہوا۔ ان کی شاعری کی وجہ سے شاعری کا انتخاب اعلا ہوا جو اسکول میں بیت بازی میں اول آنے کی وجہ بنا۔ میری پہلی کہانی ایک شہزادے اور پری کی تھی۔ میں اپنے رجسٹر میں کہانیاں لکھتی تھی اس طرح مجھے ڈائری لکھنے کی بھی عادت ہوگئی۔

میں رات سونے سے پہلے اپنی ڈائری میں نوٹ لکھ کر اور اسے خدا حافظ کہہ کر سوتی تھی۔ آج بھی ہمارے پاس گزرے سالوں کی ڈائریاں موجود ہیں۔ اکثر سوچتی ہوں کہ میرے بعد یہ ڈائریاں ردی کے بھاؤ بکیں گی یا کسی قدیم خزانے کی طرح کسی کے پاس محفوظ رہیں گی۔

ڈائجسٹ کے لیے بھی جب میں ساتویں کلاس میں تھی تو پہلا انتخاب لکھ کر بھیجا تھا جو ابو کی شاعری کی کتاب سے لیا تھا ناصر کاظمی کی غزل تھی..... پہلی تحریر کی خوشی مجھے تو ہونی ہی تھی، ابو کو بہت زیادہ ہوئی تھی۔ گھر والے بھی خوش تھے اور پھر یہ چیزیں روٹین کا حصہ بن گئیں..... پڑھائی کی وجہ سے وقفہ آتا رہا مگر سلسلہ ٹوٹا نہیں۔''

''اپنا نام بنانے میں کتنے سال لگے۔ جدوجہد کا سفر طویل تھا یا کامیابی ملتی چلی گئی؟''

''دیکھیں ہر انسان کا سفر الگ ہوتا ہے۔ اس سفر کا مقصد اور حاصل الگ ہوتا ہے۔ میں چاہے کامیاب ہوں یا ناکام، اپنا راستہ خود بنانے والی ہوں۔ پھر چاہے اس میں کتنا ہی وقت لگے میرا نام اس وقت بھی لوگ جانتے تھے جب میں قرۃ العین کیانی کے نام سے لکھا کرتی تھی۔ کالج میں آکر ڈائجسٹ کے سروے کے لیے لکھنا شروع کیا۔ اس دور میں ناول اور افسانے بھی لکھے جو شائع نہیں کروائے۔ بعد میں ان میں کچھ ایڈٹ کر کے شائع کروائے۔

شادی کے بعد قرۃ العین خرم ہاشمی کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ اور وقفے وقفے سے بچوں کی کہانیاں لکھیں۔ باقاعدگی سے 2013 میں بچوں کے چند مشہور میگزین کے لیے لکھنے کا آغاز کیا میں زیادہ تر جادوئی اور ماورائی کہانیاں لکھتی تھی۔ نت نئے آئیڈیاز پر کام کرتی تو سب تعریف کرتے..... ''مسٹر ابو'' لکھنے پر مجھے خاص طور پر فون کر کے پوچھا گیا آپ کو ایسے آئیڈیاز کہاں سے آتے ہیں؟ بہرحال سفر تو کبھی بھی آسان نہیں ہوتا۔

شروع کی کامیابی کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ آپ آسمان کو چھو رہے ہیں۔ شروع کی کامیابی کے بعد ناکامی کا تسلسل اور مستقل ٹھہر جانے والا وقت بھی دیکھا.....

جدوجہد کرنے والے ہر انسان کی قسمت پر بند تالا لگا ہوا ہوتا ہے۔ کسی کی قسمت کا تالا پہلی ہی کوشش میں 'ٹک' کی آواز سے کھل جاتا ہے اور کچھ لوگ میری طرح ہوتے ہیں۔ جنہیں پہلے اپنے رنگ آلود تالے کا زنگ صاف کر کے کوشش کی، کئی چابیاں استعمال کرنی پڑتی ہیں پھر جا کر وہ تالا کھلتا ہے۔

کچھ کے برے رویے کی وجہ سے میں نے کافی عرصہ کہانیوں میں تجربہ کرنا چھوڑ دیا۔ میگزین کے مزاج اور پیٹرن کے مطابق کام کیا مگر پھر ایک وقت ایسا آیا کہ جب مجھ سے میری مرضی اور پسند کی تحریر لکھوائی جانے لگی..... الحمدللہ، اب بچوں کے کئی میگزین کے ٹائٹل کے لیے میری کہانی منتخب ہوتی ہے۔ اس مقام تک آنے کے لیے بہت سال اور

میں اپنی تحریر شائع ہونے پر سب سے پہلے رب کا شکر ادا کرتی ہوں اور آگے بڑھ جاتی ہوں۔ کسی بھی کامیابی کو میڈل کی طرح سینے پر سجا کر نہیں چلتی۔ اور نہ ہی اسے اپنے آس پاس والوں پر رعب ڈالتی ہوں۔ دراصل میرے لیے منزل سے زیادہ سفر میں خوب صورتی اور کشش ہے میری امی ایک بات ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ ''شو آف کم'' کیا کرو۔ ہمیں یہ راس نہیں ہے۔

میں نے اب تک جتنے بھی اداروں کے ساتھ کام کیا۔ وہ سب اچھی کہانی اور اچھے رائٹر کی تلاش میں ہوتے ہیں، آپ کی تحریر میں دم ہوگا تو وہ اپنی جگہ بنالے گی۔ جہاں تک رابطے رکھنے کی بات ہے تو ایڈیٹر ہوں یا سینئر ترین رائٹرز، یہ لوگ اپنے تجربے اور علم کی بنا پر سمندر جیسے گہرے ہوتے ہیں جو مجھ جیسے رائٹر کو آسانی سے اپنے اندر مدغم کر سکتے ہیں۔ اسی لیے میں بڑوں سے ملتے۔ بات کرتے وقت ہمیشہ فاصلہ رکھتی ہوں کیونکہ یہ سچ ہے کہ باادب بانصیب ہوتا ہے۔''

''ڈائجسٹ کی دنیا میں کب آئیں؟ معاوضہ ملا تھا۔ اور لکھنے پر راغب کس نے کیا؟''

ڈائجسٹ میں لکھنے کا آغاز 2014 سے کیا۔ میں نے شعاع، خواتین اور حنا میں ایک ساتھ افسانے بھیجے۔ مگر 2014 کی جنوری میں پہلا افسانہ حنا ڈائجسٹ میں لگا۔ اور پھر مارچ میں شعاع ڈائجسٹ میں پہلا افسانہ ''پکار'' شائع ہوا۔ اس کے بعد آگے پیچھے شعاع میں افسانے لگنے لگے۔

پہلا افسانہ شائع ہوا تو میں نے سب کو بتایا۔ ابو ان دونوں میرپور آزاد کشمیر میں ماسٹر موٹی فارم کی کمپنی میں جاب کرتے تھے۔ وہ اسی وقت قریبی مارکیٹ میں گئے اور ڈائجسٹ خرید کر لائے اور میرا افسانہ پڑھ کر کہا بیٹا مجھے افسانے کا آغاز بہت عام سا لگا تھا مگر بعد میں وہ بہت اچھا ہو گیا تھا۔ مجھے بہت پسند آیا ہے۔

ادبی پلیٹ فارم اور ادبی افسانے سے متعارف کروایا تھا (میں اپنے محسن ہمیشہ یاد رکھتی ہوں) جہاں مجھے ڈائجسٹ کا مشہور نام فارحہ ارشد بھی ملیں۔ انہوں نے میرے افسانوں پر اچھا فیڈ بیک دیکھ کر کہا کہ مجھے بہت خوشی ہوتی ہے جب ڈائجسٹ رائٹر عالمی سطح پر ادبی کام پیش کر کے یہ ثابت کرتی ہیں کہ ڈائجسٹ رائٹرز کسی بھی طرح کم یا پیچھے نہیں ہیں۔

جہاں تک راغب کرنے والی بات ہے تو میرے لکھنے کے عمل کو تیز اور بہتر بنانے میں سب سے زیادہ کردار ان لوگوں کا ہے جنہوں نے تحریر شائع کرنے کے بجائے مجھے رد کیا۔ بچوں کے ایک ادارے کی طرف سے نامناسب رویے نے دوسری سمت دی اور اسی کی بنیاد پر ایک سال کے اندر میری بچوں کی کہانیوں کی کتاب اعزازی طور پر ایک اشاعتی ادارے نے شائع کی۔

اپنے اندر کی مثبت انرجی کو لوگوں سے بدلہ لینے میں ضائع کرنے کے بجائے خود کو ثابت کرنے میں لگانی چاہیے پہلا معاوضہ بچوں کے میگزین سے ملا تھا..... اور ڈائجسٹ کی دنیا میں پہلا معاوضہ خواتین ڈائجسٹ سے ملا۔ اعزازیہ ملنے کی خوشی بہت ہوئی تھی کیونکہ میرے ذہن میں یہ تھا کہ ادارے کچھ نہیں دیتے۔

بہرحال غیر متوقع چیز کی خوشی زیادہ ہوتی ہے..... مجھے جب بھی پیسے ملتے ہیں، اس میں ایک حصہ اللہ کی راہ کے لیے ضرور نکالتی ہوں۔''

''پلاٹ کب ذہن میں آتا ہے؟''

''میں نے جتنے بھی افسانے لکھے ہیں زیادہ تر کسی نہ کسی واقعے سے متاثر ہو کر یا کسی سوچ سے متاثر ہو کر لکھے ہیں..... کیونکہ بچپن سے گہرا مشاہدہ کرنے کی عادت ہے..... اس لیے عام زندگی میں کوئی بھی بات، چیز یا رویہ فوراً کلک کر جاتا ہے۔ کوئی ایک جملہ، کوئی ایک بات کچھ بھی ایسا جو پورے منظر میں میری توجہ مقناطیس کی طرح کھینچ لیتا ہے۔

pklibrary.com

آجاتے ہیں۔ بہت خاص آئیڈیاز نماز پڑھتے ہوئے یا پھر رات کے آخری پہر میں آتے ہیں۔ میرے لیے تھوڑا مشکل یا تکلیف دہ وقت وہ ہوتا ہے جب دماغ پوری طرح جاگ رہا ہوتا ہے اور آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہوتی ہیں۔ دماغ میں پوری کہانی اتر رہی ہوتی ہے اور میں اندھیرے کمرے میں کہانی کو فلم کی طرح دیکھتی جاؤں۔

میں اپنے ذہن میں آنے والے مختلف آئیڈیاز کی آؤٹ لائن لکھ لیتی ہوں، خاص کر وہ پنچ لائن یا وجہ جو اس کہانی کی بنیاد ہو اس طرح افسانہ نگاری کے لیے بھی اہم پوائنٹ نوٹ کر لیتی ہوں۔ میں تحریر لکھ کر کچھ دن کے لیے چھوڑ دیتی ہوں اور پھر اس کا تنقیدی جائزہ لیتی ہوں۔

میں تحریر بھیج کر اس کے شائع ہونے کا انتظار نہیں کرتی بلکہ اگلے پڑاؤ کی طرف سفر شروع کر دیتی ہوں۔"

"اور جب لکھنے کا موڈ نہ ہو تو؟"

"تب میں موویز دیکھتی ہوں یا کوکنگ اور بیکنگ کی دنیا میں ادھم مچا دیتی ہوں۔ میں انگریزی اور ماورائی یا جادوئی اینیمیٹڈ یا ڈرامی موویز سائنس فکشن، تھرل، ایڈونچر وغیرہ شوق سے دیکھتی ہوں، ہارر موویز بھی شوق سے دیکھتی ہوں مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی میرے ساتھ ہو۔ میری پسندیدہ سیریز "ہیری پوٹر" ہے۔ جس کے سارے پارٹس میں نے ڈاؤن لوڈ کیے ہوتے ہیں۔"

"کیا چیز لکھنے میں مزہ آتا ہے۔ رومانس لکھتے وقت سامنے کون ہوتا ہے؟"

"رومانس لکھتے وقت سوائے شرم کے کچھ سامنے نہیں ہوتا۔ ویسے میرے لیے ایسا لکھنا مشکل ہوتا ہے۔ لکھنا تو دور کی بات میں پڑھتی بھی نہیں ہوں۔ کسی کہانی میں ایسا سین آ بھی جائے تو وہاں سے جمپ لگا کر دوسرے پیراگراف پر جانا پسند کرتی ہوں۔

اپنی چند کہانیوں میں مجبوری میں میاں بیوی کا

آپ نے پوچھا کہ کیا چیز لکھنے میں مزہ آتا ہے تو جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ مجھے سب سے زیادہ مزہ جادوئی اور ماورائی کہانیاں لکھنے میں آتا ہے۔ مجھے پراسرار کردار لکھنے میں مزہ آتا ہے کیونکہ بچپن سے میرے خواب بھی ایسے ہی ہوتے ہیں (جو ستر سے اسی فیصد سچے ہوتے ہیں بلکہ مجھے تو باقاعدہ قسط وار خواب بھی آتے ہیں..... جیسے میرے والد کی وفات سے تین سال پہلے میں نے ان کی موت کا منظر فجر کی اذان کے وقت خواب میں دیکھ لیا تھا اور ان تین سال لاشعوری طور پر رات یا صبح کے وقت بجنے والے فون کی آواز مجھے خوف زدہ کر دیتی تھی۔

جب والد صاحب کا انتقال ہوا تو فجر کا وقت تھا اور صبح جب فون آیا تو اتفاقی طور پر میرا فون سائلنٹ پر تھا۔ حالانکہ میں اپنا فون بھی سائلنٹ پر نہیں رکھتی یقینی آگہی کا ہر درجہ اذیت ناک ہے۔

اسی طرح کچھ سال پہلے ایک قریبی دوست جب ایک مہینے یا دو مہینے کے بعد اپنے مفاد کی خاطر مجھ سے رابطہ کرتی تو اس سے ایک رات پہلے میں خواب میں سانپ دیکھتی تھی۔ ایسا تین بار ہوا۔ پھر وقت نے ثابت کیا کہ انسان کے شر سے زیادہ موذی کسی اور چیز کا زہر نہیں ہے۔"

"ٹی وی سے دور کیوں ہیں جبکہ اسکرپٹ رائٹنگ سے رائٹرز نے بھی نام کمایا اور پیسہ بھی؟"

"بطور لکھاری کے اتنے بڑے میگزین کو انٹرویو دے رہی ہوں ڈرامہ رائٹر نہ ہوتے ہوئے بھی تو اہمیت کام کی ہے خواہ وہ کسی بھی پلیٹ فارم پر کیوں نہ ہو۔ میں نے تین سال پہلے امریکا میں مقیم پاکستانی ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کے کہنے پر اردو فیچر فلم لکھی تھی۔ وہ میری تحریروں کو بہت پسند کرتے ہیں اور میرے کچھ آئیڈیاز پر کام کرنا چاہتے ہیں۔ فلم کا معاوضہ بھی اچھا ملا تھا۔ انہوں نے ایک مقابلے کے لیے لکھی گئی ماورائی کہانی بہت پسند کی

pklibrary.com

ی... ان کا آئیڈیا وہ یا وڈیو میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔
وہ کہانی انگلش میں ترجمہ کر کے دی۔

اگر یہ کام سامنے آتا تو میرا کام انٹرنیشنل لیول پر ہوتا مگر کورونا نے آکر ثابت کیا کہ انسان کے ارادوں اور سوچ سے اوپر رب کی مرضی ہوتی ہے۔ یہاں دو تین ڈائریکٹرز سے بات چلی مگر کبھی ون لائنز ریجیکٹ ہوتے تو کبھی سلیکٹ بھی ہوتے ...... کبھی معاہدہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ سب کچھ ٹھیک ہوتے ہوئے کام رک جاتا ہے۔ میری سوچ ہے کہ میں نے اپنا کام پیش کر دیا ہے۔ اب کسی کو اچھا لگے تو وہ خود رابطہ کرے گا۔

اس دوران ایسا ہوا کہ ساتھ چلنے والوں کو کامیابی ملی تو ان کے رویے بدل گئے اور پھر یہی چیز میرا ٹرننگ پوائنٹ بنی...... کچھ لوگوں کے برے رویوں کے باوجود بہت اچھے لوگ بھی ہیں جو اس حوالے سے پوری طرح رہنمائی کرتے ہیں۔ میں نے مصباح علی سید سے مشورہ کر کے دو چینلوں میں ون لائنز بھیج دیئے۔ ایک چینل سے تقریباً مہینے بعد جواب آیا جو کہ مثبت تھا۔ اور الحمدللہ اب کام شوٹ پر ہے۔ مصباح علی سید اور "فاطمہ نجیب" دو ایسے "پارس" ہیں جو اپنے خلوص سے سونا بنانا جانتے ہیں۔ اللہ نے جس شخص کو آپ کے لیے وسیلہ بنانا ہوگا وہ آپ کو ان تک پہنچا دے گا۔"

"اب تک کیا کیا لکھا...... اور کیا کیا کتابی شکل میں آیا ہے؟"

"میں نے ابتدا بچوں کے ادب سے کی تھی تو میری پہلی کتاب 2016 میں اعزازی طور پر بچوں کی کہانیاں شائع ہوئی تھی۔ اعزازی اس لیے کہا کہ ایک اشاعتی ادارے نے 30 نئے رائٹرز کی کتابیں شائع کی تھیں جس میں سے ایک میری بھی تھی اسی کتاب میں شائع کہانیوں پر "جی سی یونیورسٹی فیصل آباد کی ایک طالبہ" فاطمہ نور نے تھیسز بھی کیا تھا۔

عمیرہ احمد کے اشاعتی ادارے "الف کتاب" کے پہلے سال ایک بڑا مقابلہ منعقد ہوا تھا۔ جس میں شامل سو ناولز میں سے میرا ناول "تو ہی تو کا عالم" ٹاپ 10 میں شامل تھا اور بعد میں وہ کتابی شکل میں شائع ہوا اور اس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ اللہ جسم سے نہیں روح سے محبت کرتا ہے چاہے وہ روح مرد کی ہو عورت کی ہو یا خواجہ سرا کی ہو۔ یہ "خواجہ سرا" کی جدوجہد پر لکھی کہانی ہے۔

ادبی افسانے لکھنے شروع کیے تو ایک انٹرنیشنل پلیٹ فارم سے میرا ایک افسانہ "کہانی گر" انڈیا کے ایک اخبار روزنامہ "لکھنؤ" میں شائع ہوا۔ بعد میں یہ افسانہ صدی کے بہترین افسانہ نگاروں کے انتخاب میں کتاب کی صورت میں بھی شامل ہوا۔ ادبی فارم میں میرا نام سامنے آیا تو ایک مشہور ویب سائٹ "ریختہ" نے میرے سات عدد بہترین افسانے تعارف کے ساتھ پیش کیے۔

ماورائی اور جادوئی ناولٹ پر مشتمل کتاب 'نور ازل' ایک شاعتی ادارے نے مقابلے میں ٹاپ تھری میں آنے پر شائع کی۔ یہ وہی کہانی ہے جسے انگلش میں ترجمہ کر کے فلم کے لیے بھیجا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے لکھاری کی ہے جو ہمیشہ ناکام رہتا ہے پھر اسے ایک پراسرار قبیلہ کی کہانیوں سے بھی جادوئی کتاب ملتی ہے جس کا "انتخاب"، "گروی آنکھوں" کے نام تھا۔ اس لکھاری کو مرنے سے پہلے کتاب کی پہیلی کا راز ڈھونڈنا تھا۔

2020 میں بچوں کے لیے حدیث کہانیوں پر مشتمل کتاب "نیکی کی تلاش" شائع ہوئی اور اسی کتاب سے متاثر ہو کر ایک اور ادارے نے بچوں کے لیے حدیث کہانیاں اور آیت کہانیاں کتاب کے لیے لکھوائیں۔ یہ تمام کہانیاں اب تک بچوں کے تمام مشہور میگزین میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان شاء اللہ یہ کتابیں جلد شائع ہوں گی۔

2020 کے آخر میں ہی اسلام آباد کے ایک ادارے نے تجربے کے طور پر میگزین میں شائع کہانی "رنگ بدلتی روشنی" بچوں کو سنائی جسے بچوں نے بہت پسند کیا تو اسی ادارے نے اسے کتاب میں شائع کیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

pklibrary.com

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

فرحانہ مہناز......اسلام آباد

''کہنی سنی'' میں مدیر صاحب سے بالکل متفق ہیں۔ سالوں کی گردش اب بہت تیزی سے رواں ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا پڑھا تو مجھے بے اختیار ہی وہ دن یاد آگیا۔ مجھے ڈینگی بخار ہوگیا۔ بخار کے بعد کمزوری تھی میں نے فون پر اپنے دیور ایڈوکیٹ محمد اکرم ملک (یہ گوجرہ لاء ایسوسی ایشن کے ہیڈ ہیں) کو اپنی طبیعت کے متعلق بتایا، شام پانچ بجے میری بات ہوئی، اس وقت وہ فیصل آباد بچوں کو ننھیال چھوڑنے آیا تھا۔ میری طبیعت کا پتا چلا تو رات ایک بجے اسلام آباد کے لیے بیٹھ گیا۔ صبح چھ بجے اکرم ہمارے گھر پہنچا۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوکر اکرم نے کہا ''فرحی، فیصل مسجد میں ڈاکٹر صاحب کی نماز جنازہ ہے۔ میں ٹیکسی پر جاؤں یا میٹرو بہتر رہے گی؟''

میں نے کہا ٹیکسی ٹھیک رہے گی۔ پھر ساتھ یہ بولی ''رہنے دو اکیلے کیسے جاؤ گے (فراز صاحب سوات شادی

پر گئے ہوئے تھے) ... ڈھائی بجے، اکرم مجھے بتا کر فیصل مسجد چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی کالی گھٹائیں آئیں اور ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ بارش اتنی تیز کہ اولے برسنے لگے۔ متین اور صحیٰ اولے اٹھانے لگے۔ اور مجھے یہی فکر، پتا نہیں کیسے پہنچا ہوگا۔ (اف نہ جاتا) فکر مند سوچ پانچ بجے گھر آیا تو سارے کپڑے بارش میں بھیگے ہوئے تھے۔ سردی سے کپکپا رہا تھا۔ میں نے پوچھا نماز جنازہ ادا کی؟ کہنے لگا ہاں! اتنی بارش میں بھی وہاں بہت رش تھا۔ ہلکی پھوار میں نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ (نیک لوگوں کی نماز جنازہ ایسی پھوار میں ہوتی ہے) واپس بائیکیا پر آیا۔ اس لیے کپڑے پانی سے تر تھے۔ میں نے جلدی سے فراز کا سوٹ دیا، لائٹ آف تھی۔ میں نے چولہے پر کپڑے سکھائے۔ چائے بنا کر دی وہ بچوں کے درمیان کمبل لے کر بیٹھ گیا۔ آٹھ بجے فراز آئے کھانا کھایا۔ اس دوران کپڑے بھی سکھا دیے۔ فراز گوجرہ جانے کے لیے اسے اڈے پر چھوڑنے چلے گئے۔ اور میں سوچنے لگی۔ اس عظیم انسان کی نماز جنازہ جس نے ادا کرنی تھی۔ وہ کسی بھی حیلے ان کے انتقال سے پہلے ہی سفر گامزن ہوگیا۔ سچ ہے قدم خود ہی اٹھنے لگ جاتے ہیں۔ چاہے کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ ہوں۔ گوجرہ میں بیٹھے ایک شخص نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی نماز جنازہ ادا کرنی تھی سو کرلی۔ کیا خیال ہے؟'' یہ کہنی سنی پر تبصرہ تھا۔

شمارے کی طرف بڑھیں۔ نعیمہ ناز کا نام دیکھتے ہی دل چاہتا ہے کہ سب سے پہلے پڑھوں۔ ان کی نانی دادی کی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ ان کے ہیرو، ہیروئن بھی دادی کی اور سے ایک دوسرے کو دیکھتے اچھے لگتے ہیں۔ ''محبت کی کہانی'' میں ایبک کے جذبات اپنی ماں کے لیے بہت کھرے لگے۔ نور کا فیصلہ بھی اچھا لگا زبیر کو چھوڑنے کا اولاد کو زنجیر پڑ جائے تو کھولنا مشکل ہوتا ہے۔ ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے۔'' مراد بہت اچھا انسان ہے۔ بالکل اپنی ماں کی پرچھائی۔ لیکن یہ اقرا کیا ڈرامے کر رہی ہے۔ ''رنگ ریز میرے'' پچھلی دو قسطوں سے زیاد کا کردار عجیب لگا۔ پلیز ہم نے پہلے بھی کہا۔ حریم کے ساتھ کچھ برا نہ ہو۔ کیتھی کے لیے حیان ہی بہتر ہے) نازیہ رزاق کی کہانی سنسنی خیز اور دلچسپ تھی۔ گوہر کی محبت اچھی لگی

اور آخری الفاظ مسکرانے پر مجبور کر گئے۔ بحیثیت ہومیو پیتھک ڈاکٹر مجھے ڈاکٹر رضوان احمد کی باتیں بہت اچھی اور سچی لگیں۔ انہوں نے جو طریقہ ہومیو پیتھک کا بتایا سو فیصد ٹھیک ہے۔ ناہید اسمٰعیل کا تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ افسانے چاروں اپنا رنگ جمائے ہوئے تھے۔ غرض نومبر کا شمارہ سارا ہی آپ کی محنت کا ثبوت تھا۔ بہت شکریہ۔

ج: پیاری مہناز! ڈاکٹر قدیر ہمارے لیے قدرت کا انعام تھے، انہوں نے پاکستان کے دفاع کو ناقابل تسخیر بنادیا مگر ہم نے ان کے ساتھ وہی کیا جو پاکستان کے دوسرے محسنوں کے ساتھ ہوا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ بہت سادہ اور درویش صفت انسان تھے۔

زیاد کا کردار آپ کو عجیب کیوں لگا۔ کیتھی نے زیاد کو اتنا چاہا کہ اس کے رنگ میں رنگ گئی۔ اپنا مذہب بھی چھوڑ دیا، وہ زیاد سے اتنی محبت کرتی تھی تو اتنا تو اس کا حق بنتا ہے کہ زیاد اس سے بے رخی نہ برتے۔ جبکہ حریم کے تو نخرے ہی ختم نہیں ہو رہے۔

صدف ناز انصاری، مقدس ناز انصاری،

طوبیٰ شوال انصاری.....ملتان

ہم تو ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ سے بھرپور لطف اندوز ہو رہے تھے پر نومبر کے خواتین ڈائجسٹ کی آمد نے اس سے بے گانہ کر دیا۔ میچ سے یاد آیا آپ نے ہمارے ملتان کی پی ایس ایل میں کامیابی کا تذکرہ اپنے رسالوں میں کیوں نہیں کیا۔ ہمیں بہت برا لگا، آپ کے کسی بھی صفحے پر اس کا ذکر نہ ہونا (ہمارا یہ شکوہ بھی خواتین ادارے سے دلی وابستگی کا ثبوت ہے جناب) سرورق پر ریا خان براجمان تھیں جو شادی سے قبل ریا ملک کہلاتی تھیں۔ انہوں نے ایک دہائی قبل اپنے ماڈلنگ کیریئر کا آغاز کیا۔ یہ چند ایک کیوٹ سے بچوں کی مما بھی ہیں اور اس سے پہلے اکتوبر 2017ء کے خواتین پر نظر آئی تھیں۔ آپی! آپ نے رسالے کی قیمت تو بڑھائی مگر صفحات اتنے ہی۔ ہم سمجھے پہلے کی طرح 290 یا 322 اوراق ہوں گے لیکن ناجی.....ہومیو پیتھک ڈاکٹر رضوان احمد سے مفید ملاقات کی۔ سرہا اصغر کے انٹرویو پہ پہلی تصویر غلطی سے مزنہ وقاص کی لگ گئی۔ آپ نے بتایا ''رنگ ریز میرے'' اختتامی مراحل میں ہے تو لگتا ہے نمرہ احمد کا نیا ناول تب ہی شروع ہوگا۔ ساتھ ہی آئندہ سمیرا حمید کے نئے ناول کی خوش خبری بھی سنائی شکریہ آپ کا۔ پسندیدہ نعیمہ ناز کی کہانی۔'' بھول بھلیاں سی راہیں'' لاجواب محبت کی کہانی میں (سدرۃ المنتہیٰ) بڑے نازک (صابرین) موڑ آتے ہیں اور پھر انسان پوچھتا ہے کسی طرح چھوڑ دوں تمہیں (نازیہ رزاق) قرۃ العین خرم ہاشمی افسانے اور مکمل ناول دونوں ہی باکمال لکھتی ہیں۔ گل پری مرزا کا کچن لائق داد اور یہ کیا بیوٹی بکس پر عمران خان کی سابقہ اہلیہ جمائما گولڈ اسمتھ کی فوٹو؟ اور ہاں آپی پچھلے مہینے خواتین کا ٹائٹل Best Ever لگا باوجود اس کے کہ ماڈل فرینہ اعجاز تھیں جو اس سال تیسری دفعہ خواتین کے سرورق کی زینت بنیں۔

ج: صدف، مقدس اور طوبیٰ خواتین سے ہمیں آپ کی محبت میں ذرا سا بھی شک نہیں ہے اور ہم دل سے اس محبت کی قدر بھی کرتے ہیں۔ ملتان ہمیں بھی بہت عزیز ہے۔ ہماری پیاری دوست اقبال بانو، اور نگہت عبداللہ کا تعلق بھی ملتان سے ہے۔ پی ایس ایل میں ملتان کی کامیابی کا تذکرہ نہ کرنا ہماری کوتاہی ہے۔ دراصل ہمیں کرکٹ سے ذرا بھی دل چسپی نہیں۔ اس لیے ہمیں پتا ہی نہیں چلتا کون جیتا، کون ہارا۔

آپ پرچے کو جس باریک بینی سے آپ پڑھتی ہیں۔ اس سے آپ لوگوں محبت کے ساتھ ساتھ ذہانت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

نازیہ محسن.....اوسلو ناروے

مجھے خواتین ڈائجسٹ اور شعاع بہت پسند ہے۔ میں آٹھویں کلاس سے ان کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ ماشاء اللہ بہت زبردست تحریریں ہوتی ہیں، پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے اور بہت کچھ سیکھنے کو بھی ملتا ہے۔ ام طیفور سے ملاقات اچھی لگی۔ راحت جبیں کا ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' کا ہر ماہ بے تابی سے انتظار کیا جاتا ہے۔ زمین کے گھر کے حالات دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔ اس کی ایک قسط میں جس میں ثمینہ کچرا اکٹھا کر رہی ہوتی ہے اور سوچتی ہے کہ کچرا بھی ان کی غربت، بے بسی کو ظاہر کر رہا ہے کہ نہ اس میں سبزی کے چھلکے ہیں نہ پھل وغیرہ کے۔ میں نے اس پر بہت سوچا کہ ہم جو کچرا جمع

pklibrary.com

ہوگا گلہ کرتے ہیں اگر ہم غور کریں تو پھر اتب ہی سچ ہوتا ہے جب ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی ڈھیروں نعمتیں ہوتی ہیں۔
راحت جبیں کا لکھنے کا انداز بہت پسند ہے۔

فائقہ رابعہ کا پس چہ باید کرد بہت دلچسپ تھا، مجھے لگا کہ ہر خاندان میں کوئی نہ کوئی ایسا ہوتا ہے جس کو مہمان بن کے خدمتیں کروانے کا طریقہ آتا ہے مگر خود میزبان بنے، یہ توفیق نہیں ہوتی۔

میرے ساتھ خود ایسا ہو چکا ہے ایک قریبی رشتہ دار ہمارے گھر ہر ویک اینڈ پر اپنے بچوں کے ساتھ تشریف لاتے، چھٹیاں گرمیوں کی ہوں یا سردیوں کی یا عید ہمارے گھر کئی کئی دن گزارے۔ میری الماری سے کافی سوٹ ان کے سامان میں منتقل ہو جاتے کہ جب دوبارہ آئیں گے، واپس لے آئیں گے پھر ایک دن ہم بہنوں نے بھی ان کے گھر جانے کا اور رات رکنے کا پروگرام بنایا۔

دوسرے دن وہ آنٹی صبح ناشتہ کرا کے ہم سے بولیں "میری طبیعت ٹھیک نہیں، میں دوبارہ سونے جا رہی ہوں۔ اگر کچھ کھانا ہو تو کچن میں جا کر خود بنا لینا۔" اس کے بعد وہ پورا دن کمرے سے برآمد نہیں ہوئیں، ہم لوگ خود بھی ابھی بچے ہی تھے۔ بھلا کیا بنا سکتے تھے۔ شام کو بھوکے پیاسے گھر واپس آئے، امی سے خوب ڈانٹ بھی پڑی کہ ہو گیا شوق پورا۔

عنبرین ابدال کی میرا بھرم بھی بہت پسند آئی۔ روایتی ساس بہو کی آپس میں رشتے کے درمیان چلنے والی کدورت اور وجوہات کو اچھی طرح بیان کیا گیا۔ راشدہ رفعت کی محبت کی دعا بھی پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ اجیہ کے حالات بہت مشکل تھے۔ والدین اللہ کی بہت بڑی نعمت ہیں جب یہ نہیں رہتے تو رشتہ داروں اور عزیزوں کا رویہ پہلے جیسا نہیں رہتا۔ حمیرا شفیع کی وجہ تنازع بھی زبردست تھی۔ حمیرا شفیع آپ نے جس طرح سے بہت بڑے مسئلے کو ہلکے پھلکے انداز میں تھوڑا امزاح کا ٹچ بھی دیا، پڑھ کر مزا آگیا۔ فرزانہ کھرل کی دور کے درختوں تک بھی بہت اچھی تحریر تھی۔ منظر کشی بھی زبردست تھی۔ ایسا لگا کہ ہم بھی کرداروں کے ساتھ گھوم رہے ہیں۔ مجھے رنل کے خاندان کی رسم سن کر بہت حیرت ہوئی۔ ایک فضول رسم کی وجہ سے میران اور رنل کا اتنا خوب صورت رشتہ ختم ہو گیا۔ میں خود بھی گجرات سے ہوں لیکن اس رسم کا مجھے علم نہیں تھا۔ تقریباً تیس سال پہلے دلہن کے ساتھ رخصتی کے ٹائم بہن بھائی یا کوئی کزن جایا کرتا تھا۔ لیکن وہ دلہن کے کمرے میں نہیں سوتے تھے۔ اب یہ رسم ختم ہو گئی ہے شکر ہے۔

عفت سحر طاہر کا "رنگ ریز میرے" بھی میرا فیورٹ ناول ہے جس میں تحریم، زلفی، پھپھو، عباد کے کردار مزے کے ہیں۔

تحریم کے کردار میں اس کا عدم تحفظ اور زیاد کو کھو دینے کا ڈر، کیتھی کی کا کال کو چھپانے سے احساس ندامت، دل اور دماغ کی کشمکش کو بڑے خوب صورت طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

فاریہ کامران کی ہاری ہوئی زندگی میں پریسا بخاری نے کزن سے حسد میں ایک محبت کرنے والے جوڑے کو جدا کر دیا۔ اپنی طرف سے بہت ہوشیاری کی مگر پھر بھی خسارے کا سودا کیا۔

نظیر فاطمہ کی "صحیح جوڑ" بہت خوب صورت تحریر تھی۔ طیبہ کی ماں کی سوچ بہت جاہلانہ تھی کہ پہلے ہی رشتہ کو ہاں کی جائے، اس کہانی میں ایک سبق تھا کہ بچوں کی شادی کسی دباؤ یا عمر گزر جانے کے ڈر سے نہیں کرنی چاہیے بلکہ اچھی طرح چھان پھٹک کر کرنا چاہیے۔ شازیہ الطاف کی "حقیقت" میں نند بھابھی کے درمیان کھٹے میٹھے رشتے کو خوب صورت انداز میں بیان کیا گیا۔ فرح بھٹو کی تحریر اچھی مگر حقیقت سے بہت دور محسوس ہوئی۔ آپ کا باورچی خانہ میں حمیرا رضا کی آمد بھی پڑھ کر مزا آیا۔

مجھے رسالہ بہت لیٹ ملتا ہے اس لیے تبصرہ لیٹ ہو گیا۔ آپ مجھے پاکستان سے ناروے شعاع خواتین اور کرن منگوانے کا طریقہ بتا دیں۔ بہت مہربانی ہوگی۔

ج: پیاری نازیہ! آپ نے ہمیں اتنی دور سے یاد کیا بہت خوشی ہوئی۔ ہمیں احساس ہے کہ پاکستان سے باہر رہنے والوں کے لیے پرچے کا حصول بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے تاخیر سے ملنے کے باوجود آپ کا تبصرہ شامل کر رہے ہیں۔

پرچا پاکستان سے منگوانے کا طریقہ ہم ہر ماہ پرچے میں دیتے ہیں۔ آپ کے لیے یہاں بھی لکھ رہے ہیں۔

pklibrary.com

0010000015680030 الائیڈ بینک لمیٹڈ، عید گاہ برانچ کراچی۔
آن لائن کے لیے۔
Pk44 ABP A 001000001568003
کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو۔ اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہوا تو 500 روپے زیادہ روانہ کریں کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک 500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔ ایک پرچا سالانہ 18000 روپے۔
مزید معلومات کے لیے آپ اس واٹس ایپ نمبر پر کال کرلیں۔ 0317-2266944

سندس مصطفیٰ بخاری.....خیر پور میرس

بات کی جائے خاندان کے مرد و عورتوں کی تو ان میں صرف میری امی ہی پڑھی لکھی ہیں امی اپنی جوانی سے ہی ڈائجسٹ پڑھتی آئی ہیں۔ امی کے لیے یہ ڈائجسٹ ان کے دادا ابو لے کر آتے تھے۔ فرزانہ کھرل امی کی فیورٹ ہیں امی ان کی ہر کہانی دل سے پڑھتی ہیں۔
سب سے پہلے ''کہنی سنتی'' پڑھی۔ فرح بخاری کے شوہر کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا، اللہ تعالیٰ سید مظہر عباس کی مغفرت فرمائے (آمین)۔ اس کے بعد ''کرن کرن روشنی'' پڑھی جس میں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ ''ہمارے نام'' کی آخر میں تعریف کروں گی کیونکہ وہ میرا فیورٹ سلسلہ ہے۔ ''موسم کے پکوان'' میں زیادہ شوق سے پڑھتی ہوں اور ٹرائی بھی کرتی ہوں پر صرف میٹھی ڈشز۔ کچھ دن پہلے انڈوں والی مٹھائی بنائی تھی، اب سوچ رہی ہوں کہ کھوئے کے لڈو بناؤں گی پر پہلے عروج آجائے۔ عروج میری کزن ہے۔ کزن کم، بیسٹ فرینڈ زیادہ۔ آپ کا باورچی خانہ پڑھا بہت پسند آیا۔ حمیرا رضا کیا سائرہ رضا کی بہن ہیں۔ بھئی ایک بات تو بتانا بھول ہی گئی۔ سردیوں میں عروج ہمارے ہاں رہنے آتی ہے کیونکہ یہاں ہم تینوں رات کو دو یا تین بجے تک جاگتے ہیں۔ ٹی وی دیکھتے ہیں۔ سردیوں کے یہ دن ہمارے لیے بہت یادگار دن ہوتے ہیں۔ ہم زیادہ تر ڈائجسٹ رائٹرز کے ڈرامے شوق سے دیکھتے ہیں۔ رات کو دیر سے جاگنے سے یاد آیا سارا بہن) اور میں یعنی (پیاری بی بی سندس) جاگتے ہیں۔
ام طیفور سے مل کر بہت اچھا لگا۔ شاہین آپی اس طرح ہر ماہ رائٹر سے ملواتی رہیے گا۔ بات کی جائے مکمل ناول کی تو ''محبت کی دعا'' راشدہ رفعت کو بھی ہم دل سے پڑھتے ہیں پر جب فرزانہ کھرل ہو تو سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ جس طرح ''وہ میرے کیسری پھول'' نے سحر میں جکڑ لیا تھا اس طرح اب ''دور کے درختوں تک'' نے بھی اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے۔ فرزانہ آپی! میری ایک ریکویسٹ ہے کہ ایک قسط وار ناول لکھیں۔ ناولٹ مجھے دونوں ہی پسند آئے ہیں۔ رائٹرز ہی دونوں پسندیدہ ہیں پریت کی ریت واہ بھئی فرح بخاری جی! آپ تو جب آتی ہیں چھا جاتی ہیں۔ ''صحیح جوڑ'' نظیر فاطمہ کا بھی بہت اچھا تھا۔ افسانے سارے ہی بہت اچھے تھے پر مجھے ''وجہ تنازع'' حمیرا شفیع اور شازیہ الطاف ہاشمی کا بہت پسند آیا۔ باقی قانتہ رابعہ، عنبرین ابدال، عاصمہ نورین، ہاجرہ ریحان اور ماریہ کا مران کے بھی اچھے تھے۔ غزل اتاف ابرک اور انعم جمیل کی پسند آئی۔ ''خبریں وبریں'' میں واصفہ سہیل جی بہت ہنساتی ہیں۔ ''ازدواجی الجھنیں'' میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ اب آتے ہیں ''ہمارے نام'' کی طرف، مجھے سب سے زیادہ ثمینہ اکرم، زینب نور، حمیرا گل اور اقرا جلبانی، فرحانہ مہناز، رمشا روشن، جسم بشیر کے خطوط کا انتظار ہوتا ہے اور بھی بہنوں کے خطوط اچھے ہوتے ہیں۔ راحت جبیں اور عنت سحر کی کہانی اس لیے نہیں پڑھی ہے کیونکہ بابا جانی اور بھائی کراچی جارہے ہیں۔ عباد (کزن) کی برتھ ڈے پر، اس لیے سوچا جلدی خط لکھ کر پوسٹ کروادوں پھر کون لے کر جائے گا۔ پیاری ماریہ آپ کا پروفائل کیا ہے بتائیں تاکہ ہم آپ کو ڈھونڈ سکیں۔ ''سفر تمام ہوا'' پڑھ کر میں بہت روئی، رخ چوہدری کا بہت دکھ ہوا۔

ج: پیاری سندس! آپ نے اتنی محنت سے اتنا طویل خط لکھا پھر اسے پوسٹ کرایا اس لیے تاخیر سے ملنے کے باوجود آپ کا خط شاملِ اشاعت ہے۔ اپنی امی کو ہمارا سلام کہیے گا۔ ہمیں آپ کا خط بہت اچھا لگا۔ آئندہ بھی شرکت کرتی رہیے گا۔

گوشی جمال.....منڈی ہزمان

سب سے پہلے یہ بات بتانا ضروری ہے کہ پچھلے ماہ میں نے خط لکھا تھا اور بذات خود پوسٹ کیا جا کر لیکن یہ

بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ موصوفہ کلرک ڈاک خانہ جو سانولے رنگ پر گہری ریڈ لپ اسٹک لگا کر سفید دانتوں سے مضحکہ خیز مسکراہٹ سجائے اچھی خاصی زہر لگ رہی تھیں مجھے اس نے کسی اور شہر رجسٹری نہ ارسال کر دی ہو جیسے وہ جلدی جلدی کام سمیٹنے کے چکر میں لگ رہی تھی یا پھر آپ کو خط لیٹ موصول ہوا ہو۔ اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے میں ہمیں خاصی دقت محسوس ہو رہی ہے۔ بہرکیف جن بہنوں نے کمی محسوس کی ان کا شکریہ۔ آج کل موسٹلی ٹائٹل دلہنوں سے سجے موصول ہو رہے ہیں، جس شمارے کو بھی اٹھالیں۔ خوشی کا اچھا خاصا تاثر دیتے ہیں اور کچھ لمحے ہم جیسے کنوارے لوگوں کو ساکت کر جاتے ہیں۔ ٹائٹل بہت دیدہ زیب تھا۔ آہ! ماہ دسمبر آ گیا 2021 اختتام پذیر ہونے کو ہے۔ ٹائم گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔ سال کے اختتام پر ہم یہ ضرور سوچتے ہیں اس سال ہمیں کیا ملا؟ اس طرف بھی دھیان دے لینا چاہیے کہ اس سال ہم نے کسی کو کیا دیا ہے؟ خوشی؟ آنسو یا بے حد راحت و سکون، یہ تو مکافات عمل ہے، جو بوئیں گے وہی کاٹیں گے۔ کسی کو دی ایک معمولی سی اعانت، خوشی، شاید اسے سال بھر کے غم بھلا دے۔ پچھلے ماہ ہم سے بھی ہماری ایک بہت پیاری ہستی جدا ہو گئیں۔

میری خالہ اماں کی اچانک وفات، ہم سب صدمے سے بے حال۔

دس اکتوبر کی شام کو خالہ زبیدہ کی اکلوتی دختر ارشاد عرف شادو کی کال موصول ہوئی۔ گڈی آپا پہلے تو اٹینڈ نہیں کر رہی تھیں کیونکہ آپا شادو کے روز کے فری منٹ جب تک وہ ختم نہ ہو جائیں، ان کا فون کسی نہ کسی گھر کھڑکتا رہتا ہے۔ لیکن بار بار ان کی کالوں سے بے زار ہو کر اماں نے کن اکھیوں سے گڈی آپا اور منجھلی کی طرف دیکھا۔

"ارے لڑکیوں! فون اٹینڈ کرو، کوئی ایمرجنسی بھی ہو سکتی ہے۔" جیسے ہی گڈی آپا نے کال اٹینڈ کی ساتھ ہی نان اسٹاپ ٹیپ ریکارڈ آن ہو گیا۔

"اے مسرت! اچھا نہ کی کڑیو! میں صادق آباد سے "دھنتھار" گاڑی پر بیٹھ گئی ہوں۔ بکسا کپڑوں کا بھر کر، رمضان کے لیے ہفتہ بھر کے سالن فریج میں پڑے ہیں۔ اماں کی طبیعت بہت خراب ہے، وہ آخری سانسوں پر ہے۔ ساتھ شادو آپا کی سانسیں بھی عروج پر۔

ہائے میری بہن زبیدہ کو کیا ہو گیا۔ اماں نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "مجھے جلدی سے گاؤں 38 میں کوئی لے جائے۔"

"اماں! حوصلہ کریں اب تو اچھی خاصی شام ہو گئی ہے، صبح چلیں گے۔" آپا گڈی تنک کر بولیں۔

"اے! گڈی مجھ سے اب اس کمبخت اسکوٹر پر نہیں بیٹھا جائے گا۔ سفر لمبا ہے جمشید سے کہو کار رینٹ پر لے لے۔"

"اچھا اچھا کار پر ہی چلے چلیں گے۔" اسی دم جمشید برآمدے میں وارد ہوا۔ اماں کی بے چینی ایسے ہی نہ تھی، یہ دلوں کے رشتے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ گھر کے چکر کاٹ کاٹ کر اماں نے پاؤں شل کر لیے۔ بڑی مشکل سے زوبی نے ملک شیک پلا کر سلا دیا۔

رات ساڑھے گیارہ پر بڑے بھیا کی کال آئی۔ میرا دل عجیب سا ہو گیا۔ "اماں اور باقی رشتہ داروں کو اطلاع کر دو۔ خالہ زبیدہ فوت ہو گئی ہیں۔"

میری ٹانگوں سے جان نکل گئی۔ دونوں آپا منہ پہ دوپٹے دھرے زار و قطار روئے جا رہی ہیں اور حوصلہ نہ ہو پا رہا ان سے کہ اماں کو کیسے یہ خبر دیں۔

اماں کی سسکی کانوں میں پڑی تو دیکھا وہ دروازے پر کھڑی تھیں۔ یہ ایک قیامت کی رات تھی۔

خالہ اماں ہم سے بہت پیار کرتی تھیں، ان کی جدائی کا صدمہ بہت جان لیوا تھا۔ اس وجہ سے نومبر کے شمارے میں خط لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ اب نومبر کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ مستقل سلسلوں کو پڑھ کر کچھ طبیعت بہتر محسوس ہوئی۔ ورنہ پورے ماہ سے گھر کا ماحول افسردگی لیے ہوئے تھا۔ ایسے میں تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوا شمارہ۔ "سرہا اصغر" کیوٹ سی لڑکی، ارے یہ کیا بھئی؟ پہلی تصویر تو مزنہ وقاص کی ہے باقی "سرہا اصغر" ہی تھیں۔ "ہمارے نام" اس بار بہت مختصر، میری شمولیت تو نہیں تھی باقی سب کہاں بزی تھیں؟ "رنگ ریز میرے" کا واقعی اب اینڈ ہو جانا چاہیے۔ "بیوٹی بکس" میں "جمائما خان" براجمان، سردیوں کے لحاظ سے اچھی ٹپس۔

ج: پیاری گوشی! آپ کا پچھلا خط ہمیں اس خط کے ساتھ ہی ملا۔ اس میں ان گہری لپ اسٹک والی خاتون کی غلطی نہیں بلکہ غلطی سے آپ کا خط افسانوں کے ڈھیر میں

pklibrary.com

ورنہ ایسا ممکن نہیں کہ گوشی خط لکھے اور شامل نہ ہو۔

آپ کی خالہ کی وفات کا بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کی والدہ کو صبر عطا فرمائے۔ ماں باپ کے بعد بہن بھائیوں کا رشتہ ہی اپنا اور عزیز ہوتا ہے۔

پچھلے خط میں آپ نے اپنی آپا کے بارے میں جو لکھا۔ اسے پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ ہم فیصلہ نہ کر سکے کہ اس مسئلہ کو شائع کریں یا نہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کا مسئلہ عدنان صاحب کو دے دیں۔

صدف نثار.....راولپنڈی

پہلی بات یہ کہ جیسے کہ میں نے پہلے ذکر کیا تھا کہ کچھ عرصے پہلے میرا جواں سال بیس سال کا بھائی کینسر جیسے مرض کی وجہ سے.....

اب اگر یہ کہوں کہ ہم بھائی کے پیچھے بڑا بھاگے۔ اس کے علاج کے لیے ڈاکٹر حکیم، پنسار، روحانی علاج، دم، درود، تعویذ سب کیا۔ خود سانس بھول گئے تو یہ ایک چھوٹی اور عام سی بات ہے۔ کسی بھی خاندان میں..... اللہ نہ کرے ایسا مسئلہ ہو تو ایسے مریض کے لیے ماں، باپ، بہن بھائی یہ سب کرتے ہی ہیں۔ لہٰذا ہم نے بھی کیا۔ میرے بھائی کو جگر اور معدے کا کینسر ہوا۔ نو مہینے وہ کچھ کھا نہ سکا۔ گھر کا ایک فرد ہمارے سامنے بھوک پیاس کا شکار ہو۔ اور ہم کچھ نہ کر سکیں یہ کیسی تکلیف ہے۔ میں سمجھ سکتی ہوں یا وہ جس پر گزری ہو۔ ڈاکٹر بھی اتنا ظالم میرے تین مہینے سے بھوکے، کمزور بھائی کے سامنے کہہ دیا کہ اس لڑکے کے بچنے کی امید نہیں۔ بہن بھائی بہت چھوٹے تھے جب ہمارے فادر ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ انہوں نے دوسری شادی کر لی۔ میرے اس بڑے بھائی نے تعلیم چھوڑ دی۔ مزدوری شروع کر دی۔ چھوٹے چھوٹے کام کیے۔ ہم چار بہن بھائی تھے۔ بڑے بھیا میں اور پھر دو چھوٹے بھائی۔ ابو کے جانے کے بعد امی نے کپڑے سیے، بھائی نے مزدوری کی۔ محنت کی۔ ہماری معاشی حالات بے حد خراب رہے۔

میں نے جیسے ہی بی اے کیا تو اسکول میں نوکری شروع کر دی۔ گھر پر ٹیوشن دی۔ بچے تو آتے ہی تھے۔ ساتھ تعلیم جاری رکھی۔ سب ٹھیک ہونا شروع ہو گیا۔ سب بھائی کو یہ کینسر کی تکلیف ہو گئی۔ میں اور میرے بڑے بھیا، ہم بہن بھائی تھے۔ کبھی کبھی وہ میرے لیے باپ ثابت ہوتے کبھی وہ میرے لیے بہن ثابت ہوتے۔ ہم نے مل کر بڑی مشکلات کا سامنا کیا تھا۔

یکم فروری 2017 کو بھائی ہمیں چھوڑ گئے۔ قل کے بعد خاندان کا کوئی فرد ہمارے گھر نہ آیا۔ دوست احباب ہمیں چھوڑ گئے۔

خیر آپ کے قیمتی وقت کا احساس ہے مجھے۔ بس یوں سمجھیے دکھوں کے ایک دلدل میں، میں میرے گھر والے گرے۔ جب گرے تو ایک قافلہ ہمارے اردگرد نکلے تو تنہا تھے۔ آج تک تنہا ہیں۔

اعلا سرکاری ملازم کی اولاد ہونے کے باوجود ہم نے بہت غریبی میں زندگی گزاری، زندگی تھی یا سزا یہ تو معلوم ہی نہ ہو پایا۔ بچپن تو آیا ہی نہیں مگر پھر بھی..... امنگیں تھیں دل میں۔ اب تو نہ دل ہے نہ امنگیں ہیں۔ زخم زخم ہے دل بھی۔ روح بھی۔ میرا بڑا بھائی۔ اس کے جانے کے بعد..... حالات پھر سے شدید خراب ہو گئے۔ بھائی کے بعد..... اب بڑی میں تھی۔ میری ماں کی حالت..... آپ سمجھ سکتی ہیں۔ شوہر کی بے وفائی۔ اپنوں نے ساتھ چھوڑا۔ ساری زندگی کپڑے سی کر اولاد پالی۔ اولاد جوان ہوئی تو بڑا بیٹا بھوک پیاس سے، کینسر سے جان سے گیا۔ ان کی ذہنی حالت تو کیا۔ جسمانی حالت بھی شدید خراب ہو چکی ہے۔ ڈیپریشن کی مریضہ، وہ خوب صورت ترین جو بہت مضبوط ہوا کرتی تھیں۔ آج یہ حالت ہے کہ ایک پتا ہلنے سے ڈر جاتی ہیں۔

پہلے گھر میں بڑا میرا بھائی تھا بڑا والا۔ اب تو میں ہوئی نا۔ ذمہ داریاں سب مجھ پر۔

میں نے تین چار تحریریں لکھی ہیں۔ پبلش نہیں ہوئیں۔ شاید قابل اشاعت نہیں۔ پسند نہیں آئیں۔ کوئی بات نہیں۔ اب میں اور محنت کروں گی ان شاء اللہ، مجھے آپ ایک اور موقع دیں۔ زیادہ محنت کروں گی اور دھیان سے لکھوں گی کہانیاں۔

بقیہ صفحہ نمبر 250 پر

pkdigest.com

نرمین اسکول میں پڑھنے والی ایک غریب لڑکی ہے۔ اس کا باپ شکر قندی اور مونگ پھلی کی ریڑھی لگاتا ہے۔ بیوی کی بیماری کی وجہ سے وہ اپنی دکان منشی اکرم کے پاس گروی رکھتا ہے اور سود بھرتا ہے۔

نرمین اور افشاں اسکول سے واپسی پر باتیں کرتی آتی ہیں، راستے میں مراد کا رکشہ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اس میں بیٹھ کہتی ہے، میں تو رکشہ چلاؤں گی۔ اسی وقت سامنے والے گھر کا دروازہ کھلتا ہے، مراد کے باہر نکلنے پر دونوں بھاگ جاتی ہیں۔ نرمین اپنا بیگ بھول جاتی ہے۔

گھر پہنچ کر بیگ کا خیال آتا ہے۔ وہ ماں سے کہتی ہے کہ کتا پیچھے لگ گیا تھا، بیگ گر گیا راستے میں۔ فرخ کے ہمراہ ثمینہ اسے بیگ لینے بھیجتی ہے لیکن وہاں رکشہ نہیں ہوتا۔ فرخ کہتا ہے کہ وہ لا دے گا، رکشہ والا اس کا استاد ہے۔

مراد اس کا بیگ گھر دے جاتا ہے لیکن بیگ کھولنے پر اسے نرمین کا نام پتا چل جاتا ہے۔ وہ نرمین کے بہن بھائی کو پیسے دیتا ہے مونگ پھلی کھانے کے لیے۔

وہ فرخ کے گھر جاتی ہے۔ فرخ کے کمرے کے دروازے میں آٹومیٹک لاک لگا ہوا ہے، وہ بند ہو جاتا ہے۔ نرمین ایک دم چیختی ہے۔ ثمرین جو بہن کو بلانے آتی ہے اس کی چیخ سن کر گھر سے باہر نکلتی ہے، جہاں خالی آ رہی تھیں، وہ ان کو بتاتی ہے۔

راحت جبیں

زندگی ہم تجھے گزاریں گے

pklibrary.com

منشی اکرم، انور حسین کے گھر آتا ہے جہاں نرمین کو دیکھ کر اس کی نیت پھسل جاتی ہے۔ وہ اس کو پانچ سو روپے دے کر جاتا ہے اور انور حسین سے اس کا رشتہ مانگتا ہے۔ انور حسین انکار کر دیتا ہے۔
ہوٹل میں مراد کو انور حسین ملتا ہے، وہ اسے اپنے رکشہ پر گھر چھوڑ دیتا ہے۔

pklibrary.com

ہے، ہاتھ میں لے کر وہ سب خرید کر اس کے گھر دے جاتا ہے۔
افشاں رکھ لیتی ہے لیکن نرمین ڈر کے مارے ثمینہ کو سب بتا دیتی ہے۔
مراد کاکے سے کہتا ہے کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ کاکا کہتا ہے کہ وہ اور منشی رشتہ لے جائیں گے۔
ملک صاحب کے بیٹی کی شادی میں پھاتا اور رشیداں کام کر رہی ہیں۔
ثریا کو تھر کتا دیکھ کر رشیداں کو غصہ آیا ہے۔
نرمین پانچ سو کی ٹیوشن پڑھانے لگتی ہے۔ انور حسین ثمینہ کے منع کرنے کے باوجود اجازت دے دیتا ہے۔ وہ نمبردار کے گھر بھی ہو آتا ہے۔
ثریا ملک صاحب کے گھر سے کھانا چوری کر کے لے کر آتی ہے۔ وہاں اس کی ملاقات بشیر سے ہوتی ہے۔
رشیداں کو ملک صاحب کے گھر سے چاول ملتے ہیں۔ رفیق اسے گالیاں بکتا ہے۔
مراد کو بخار ہو جاتا ہے۔ کاکا اسے دیکھنے آتا ہے اور مشورہ دیتا ہے کہ اسے اب شادی کر لینی چاہیے۔ وہ انور حسین کی بیٹی نرمین کا کہتا ہے۔ کاکا رشتے کے لیے منشی کو لے جانے کا بھی کہتا ہے۔ منشی ہامی بھر لیتا ہے۔
مراد اور کاکا، انور حسین کے گھر منشی کا انتظار کر کے چلے جاتے ہیں۔ منشی بھی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ مراد کو بھی یہیں آنا تھا تو وہ انور حسین سے کہتا کہ تو نے یا تیری بیٹی نے مراد کو پھنسایا ہے۔
مراد منشی کو گھونسا مارتا ہے۔ اس کی ناک سے خون نکلتا ہے۔ کاکا زبردستی مراد کو لے جاتا ہے منشی بھی دھمکیاں دیتا چلا جاتا ہے۔
مراد فرخ کو بتاتا ہے کہ وہ نرمین کے لیے رشتہ لے گیا تھا۔ اور منشی کا بھی بتایا ہے۔ فرخ صدمے سے وہاں سے آجاتا ہے۔
ثریا بشیر سے ملنے باغ میں جاتی ہے وہ دوبارہ رشتہ لانے کی بات کرتا ہے۔
رشیداں ثریا کے لیے رشتہ دیکھتی ہے وہ لوگ آئے بیٹھے تھے کہ ثریا بشیر سے مل کر آتی ہے وہ انکار کر کے چلے جاتے ہیں۔ افشاں نرمین کو زبردستی مراد کی گلی سے لے کر آتی ہے مراد کے ملنے پر اسے خوش خبری سناتی ہے کہ نرمین کے ابا مراد کو ہاں کہنے والے ہیں۔
فرخ اپنی ماں سے نرمین کی بات کرتا ہے وہ اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیتی ہیں۔ وہ غصے میں نرمین کے گھر جاتا ہے جہاں افشاں اسے نرمین کی شادی کی خبر سناتی ہے۔
منشی انور حسین سے پورے پیسے دینے کا کہتا ہے۔ وہ پریشان گھر آتا ہے ثمینہ اسے کہتی ہے کہ فوراً مراد سے نرمین کا نکاح کر دو، انور حسین منشی سے کچھ وقت مانگ لیتا ہے۔
رفیق رشیداں سے کہتا ہے کہ اسے اسپتال لے جائے۔ کیوں کہ اس کے زخم پک رہے تھے۔ نرمین ٹیوشن پڑھانا چھوڑ دیتی ہے۔ مراد گھر پہنچتا ہے تو اس کا سامان باہر پڑا ہوتا ہے۔
کاکا اس کے گھر میں رنگ و روغن کروا دیتا ہے۔ فرخ نرمین کو مراد سے شادی نہ کرنے کا کہتا ہے۔ نرمین اسے گھر سے بھگا دیتی ہے۔ دروازے پر مراد آتا ہے۔ اس وقت ثمینہ اور افشاں کی امی بھی آجاتی ہیں۔ مراد بچوں کے لیے پزا لے کر آتا ہے۔ ثمینہ کہتی ہے کہ نرمین وہ تیرا بہت خیال رکھے گا، بڑے دل والا ہے۔ وہ ثمینہ سے نرمین کو بازار لے جانے کا کہتا ہے۔ افشاں اور اس کی امی کے ساتھ ثمینہ، نرمین کو بھیج دیتی ہے۔ اسی دوران منشی آجاتا ہے، ثمینہ اسے دروازے سے ہی ٹرخا دیتی ہے۔ منشی کو گلی سے نکلتے ہوئے مراد کا رکشہ نظر آتا ہی، وہ انتقامی کارروائی کا سوچتا ہے۔
رشیداں کے ٹوکنے پر ثریا اس پر گرم چائے پھینک دیتی ہے۔ رفیق کے زخم سڑ جاتے ہیں۔ رشیداں اس کے بھائی کو

زمین کے گھر میں بارات کے استقبال کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ زمین دلہن بن چکی تھی۔ انور حسین بارات کا انتظار کر رہا تھا کہ کاکا آ کے بتاتا ہے کہ مراد کو پولیس پکڑ لے گئی۔

شادی کے گھر میں یہ خبر بجلی بن کر گرتی ہے کہ مراد کو پولس پکڑ کر لے گئی ہے۔

رفیق کے مرنے کے بعد اس کا بھائی شفیق اپنے بیٹے سے ثریا کا نکاح کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ ثریا کو عین وقت پر پتا چلتا ہے کہ اس کی شادی بشیر سے نہیں کسی اور سے ہو رہی ہے تو وہ غصہ کرتی ہے۔ رشیداں کے دیے سوٹ کو آگ میں جھونک دیتی ہے اور بشیر سے رابطہ کر کے عین شادی کے وقت گھر سے بھاگ جاتی ہے، اقصیٰ کو دھمکا کر جاتی ہے۔

نکاح کے لیے آنے والوں کو پتا لگتا ہے تو سب باتیں بناتے ہیں۔

منشی، انور حسین کو دھمکیاں دیتا ہے کہ وہ اس کے سارے بچوں کو اور اسے جیل بھیج دے گا، وغیرہ وغیرہ۔ انور حسین مان جاتا ہے۔ ثمینہ اور خدیجہ زمین سے کہتی ہیں کہ وہ بھاگ جائے لیکن زمین باپ کی حالت دیکھ کر منشی سے شادی پر رضا مند ہو جاتی ہے۔

ثریا کے بشیر کے ساتھ بھاگ جانے پر بارات واپس چلی جاتی ہے۔ کاکے کو یہ سن کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ انور حسین، زمین کا نکاح منشی سے کرنے پر راضی ہے۔ خدیجہ گھر آتی ہیں تو فرخ بہن کے گھر سے واپس آ چکا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ منشی کو مراد کے نکاح کی خبر اسی نے دی تھی۔ خدیجہ اسے مارتی ہیں۔

کاکا مراد کو جا کر بتاتا ہے کہ منشی کے دھمکانے پر انور حسین، زمین کا نکاح منشی سے کرنے پر راضی ہے۔ مراد کو غصہ آتا ہے۔

صبح ہو جاتی ہے منشی نہیں آتا۔ خبر آتی ہے کہ منشی کو کسی نے قتل کر دیا۔ منشی کی بیوی اسپتال میں بیان دیتی ہے کہ وہ نہیں جانتی کہ حملہ آور کون تھے۔ منشی بچ جاتا ہے۔ نسیمہ کے بھائی اس کا علاج کرواتے ہیں۔ بشیر نسیمہ کو بچانے کے لیے منشی کو مارتا ہے۔ بشیر کے گھر پہنچ کر پتا چلتا ہے کہ بشیر پہلے سے شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی ثریا کو مارتی ہے۔

مراد جیل سے زمین کو پیسے بھیج کر یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ اس مشکل گھڑی میں اس کے ساتھ ہے۔ فرخ کہتا ہے کہ اگر اسے پیسے چاہیے تھے تو وہ اس سے کہتی...... کہ یہ پیسے نہیں اس کا کھویا ہوا راستہ ہے۔ زمین ان پیسوں سے سامان خرید کر ریڑھی لگا لیتی ہے۔ پکوڑے، چنے، آلو کی ٹکی وغیرہ۔ ثمینہ کے منع کرنے کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر اٹل ہوتی ہے۔

وہ اسکول کے پاس ریڑھی لگاتی ہے۔ اس کا سامان ایک گھنٹے کے اندر اندر بک جاتا ہے۔ فرخ اسے ریڑھی لگائے دیکھتا ہے تو بہت برا مناتا ہے۔

ثریا اور بشیر ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ رفیق علی کا بھائی ان کا مکان بیچ دیتا ہے۔ وہ ایک جگہ باڑے میں جھونپڑی ڈال لیتی ہیں۔

زمین مراد کے رکشے میں پیپر دینے جاتی ہے۔ خدیجہ خالہ اپنی بہن کے گھر سے واپس آتی ہیں تو انہیں پتا چلتا ہے وہ حیران رہ جاتی ہیں۔

منشی زمین کو ریڑھی لگائے دیکھتا ہے تو اسے تنگ کرتا ہے۔ منشی کے نہ پیش ہونے پر چند یکطرفہ پیشیوں کے بعد مراد کے حق میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔ مراد رہا ہو جاتا ہے۔

تیرہویں قسط

ایک لمحے کو انور حسین کا وجود بھی تھرتھرا گیا۔

"وہ ایک ناکام باپ ہے وہ کبھی اپنے بچوں کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی بیٹی کو منشی سے بھی نہیں بچا سکا

pklibrary.com

ایک لمحے کی خاموشی ہوئی۔
اسی خاموشی میں انور حسین نے اپنے ہاتھ پر بیٹی کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ وہ اس کے کندھے سے لپٹی دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ جکڑے اپنے خوف پر قابو پا رہی تھی یا اس کا خوف کم کر رہی تھی۔
''یہ کیا ہوا ابو جی.....'' ایک لمحے کی خاموشی نرمین کے سوال نے توڑ دی۔ اور جواب میں آسمان پر پھلجھڑیاں چھوٹ گئیں۔ آتش بازی نے آسمان پر رنگ ہی رنگ بکھیر دیے۔ تیز روشنی میں آسمان بقعہ نور ہوا اور اصلی ستارے چھپ گئے۔
دونوں برابر بیٹھے مبہوت سے منظر دیکھنے لگے۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔
باپ بیٹی کی ہنسی ایک سی تھی۔ بچپن جیسی کھلکھلاتی بے فکر اور خوب صورت۔
''چلیں ابو جی مہندی آ گئی ہے اور آپ نے تو ابھی کپڑے بھی نہیں بدلے۔'' نرمین کھڑی ہو کر کپڑے جھاڑنے لگی۔ ایک معمولی ہنسی انور حسین کا سارا خوف بہا لے گئی۔
''ہاں تو نے تو ابھی تیار بھی ہونا ہے۔''
''آپ نے بھی تو کپڑے نہیں بدلے۔''
باپ بیٹی اچھے دوستوں کی طرح ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے باتیں کرتے گھر کی طرف چل دیے۔
''ہم حذیفہ اور طلحہ کی شادی اتنی ہی دھوم دھام سے کریں گے۔'' نرمین نے ڈھول کی تھاپ پر ناچتے لڑکوں کو دیکھ کر خواہش ظاہر کی..... اردگرد کے گھروں کی چھتیں عورتوں سے بھری تھیں۔ ہر کوئی منڈیر سے لٹکا یہ شور شرابا ذوق و شوق سے دیکھ رہا تھا۔ ڈھول کی تھاپ کے پاس مہندی کا دولہا کھڑا تھا اور ماں، بہنیں، چاچیاں، پھوپھیاں، خالائیں روپے وار وار نہ تھکتی تھیں۔
''اس سے پہلے تو تم رخصت ہو گی..... اور کیا پتا تمہارا دولہا ایسی دھوم دھام نہ کرے۔'' وہ ہنسا۔ نرمین مضمحل سا مسکرائی۔
''تم نے مراد کو کیوں چھوڑا؟''
نرمین کے قدم رک گئے۔ باپ بیٹی دوست بن گئے تھے اور دوستوں میں لحاظ نہیں ہوتا۔
''میں نے اسے آپ لوگوں کی خاطر چھوڑا تھا ابو جی! سوچا تھا اپنے بہن بھائیوں کو دوسروں کے ٹکڑوں پر نہیں پالوں گی۔ پتا ہوتا کہ آپ لوگوں کو دوسروں کے ٹکڑے ہی پسند ہیں تو کبھی نہ چھوڑتی۔''
کس صفائی سے اس نے طنز کے تیر برسائے اور ہاتھ چھڑا کر گھر کے اندر بھاگ گئی۔
انور حسین کے قدم من بھر کے ہو گئے۔ ایک قدم اٹھانا بھی محال تھا۔ وہ خاموشی سے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔
گھر خالی تھا۔ سب عورتیں مہندی کے لیے جا چکی تھیں۔
نرمین کو لگا وہ اب کھل کر اور سب سے چھپ کر رو سکتی ہے۔ مگر کب سے اس کی منتظر ثمینہ بازو سے کھینچتی اسے کمرے میں لے گئی۔ جہاں عورتیں تیار ہوئی تھیں، اتارے گئے کپڑے مہمانوں کے بیگ کے ساتھ کمرہ میک اپ اور پرفیوم کی خوشبوؤں سے بھرا ہوا تھا۔
''کہاں گئی تھی؟'' ثمینہ نے دانت پیسے۔
''ابو کے ساتھ تھی۔'' اس نے بازو چھڑایا۔
''اور تمہارے ابو کہاں گئے تھے؟''

تیرے ساتھ تھے۔" پلنگ پر پڑے ایک طرف کرکے نرمین بیٹھ گئی۔
"تم باپ بیٹی مل کر مجھے پاگل کر دو گے۔ تمہیں ذرا بھی اندازہ ہے ہم دوسروں کے گھر میں رہ رہے ہیں۔"
نرمین کے لب مسکرائے۔ بے حد طنزیہ اور استہزاء بھری مسکراہٹ جو کہتی تھی۔
"مجھے تو شروع سے اندازہ تھا۔"
"آپ کو اب خیال آیا ہے۔"
ایک لفظ نہیں کہا مگر ثمینہ نے سب سن لیا وہ تلملا گئی۔
"میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔"
نرمین نے جواب نہیں دیا خاموشی سے چپل اتار کر لیٹ گئی۔
"مجھ سے تھپڑ کھاؤ گی۔"
تب ہی ایک لڑکی اپنا شرارہ سنبھالتی آئی۔
"پھوپھو! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔ سب باہر بلا رہے ہیں۔"
"ابھی آتی ہوں۔" ثمینہ نے سنبھل کر جواب دیا لڑکی واپس بھاگ گئی۔
"جلدی تیار ہو کر آ جانا مہندی شروع ہو گئی ہے۔"
"مجھے نہیں آنا۔" نرمین نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔
ثمینہ دروازے تک جا کر پلٹی۔
"نمو! میرے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھ، تماشا نہ بنا، لوگ پہلے ہی تیرے بارے میں بہت باتیں کر رہے ہیں۔"
"کرنے دو پروا نہیں ہے۔" اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ کون سی باتیں؟
ثمینہ کا ضبط جواب دے گیا۔ جڑے ہوئے ہاتھ کھلے اور نرمین کے سر پر چپیڑ پڑی۔
"پڑی رہ یہیں، تو ہے ہی اس قابل اتھری منہ زور اپنی من مانی کرتی ہے۔ اپنی مرضی کرنے والیوں کو کچھ نہیں ملتا۔"
ثمینہ غصے سے بھری آنسو ضبط کرتی وہاں سے چلی گئی۔
نرمین نے بے حد حیرت سے اسے جاتے دیکھا۔
وقت کا پہیہ الٹا چل گیا تھا۔ پہلے ماں دوست تھی۔ سپورٹر تھی۔ باپ خود سے دور لگتا تھا۔ اب ماں دور چلی گئی تھی۔
نرمین نے دونوں ہتھیلیوں سے گیلی آنکھیں رگڑیں۔
غصے سے اٹھ کر کپڑے بدلے، ادھر ادھر بکھری میک اپ کی چیزوں سے چہرہ رنگا۔ دوپٹہ سر پر ٹکا کر جب آئینے میں خود کو دیکھا تو دل کی دہلیز پر اداسی آ گری۔
سبز کامدار پٹی والا میرون دوپٹہ۔
کسی نے ہولے سے اس کا کندھا تھپتھپا کر رضامندی پوچھی تھی۔
نرمین نے بے اختیار اپنے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"نمو آپا! آ جائیں، بہت مزا آ رہا ہے۔" فضہ بھاگتی ہوئی آئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ سہارا کمزور تھا۔ مگر ننھا سا ہاتھ اسے یادوں کی کھائی میں پھسل کر گرنے سے بچا گیا۔
دولہا کے سر سے سو کا نوٹ وارتی ثمینہ نے نرمین کو آتے دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔ سہیل نے سب سے

چھپا کر۔۔۔ سوسو کے نوٹوں والی گڈی ثمینہ کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ تاکہ وارنے کے دوران اس کی بہن شرمندہ نہ ہو۔
ثمینہ نے مسکرا کر دوسرا نوٹ نکالا ہاتھ اٹھایا۔
لڑکے کی ماں نے بیٹے کے سر پر گڈی کھول دی۔
ڈھول کی تھاپ اور تیز ہوئی اور بچوں نے ہلا بول دیا۔
ثمینہ کا ہاتھ فضا میں معلق ہو گیا۔
طلحہ اور حذیفہ سب کے ساتھ مل کر پیسے چن رہے تھے۔
ثمینہ نے آہستہ سے ہاتھ پیچھے کیا اور عقب میں ہو گئی۔
اسے ادراک ہو گیا تھا۔
وہ وارنے والوں میں سے نہیں، زمین سے چننے والوں میں سے تھی۔

☆☆☆

''اچھا وہ بچے پیدا کرے گی اور میں بانجھ مروں گی۔''
ثریا کا بس نہ چلتا تھا شرط رکھنے والی اور شرط ماننے والے دونوں کے پرخچے اڑا دے۔
''وہ تمہارے بچے پیدا کرے گی اور میں کیا کروں گی۔ اس کی دائی بنوں گی، چھلے کرواؤں گی، اس کے بچوں کے پوتڑے دھوؤں گی۔''
چلا چلا کر ثریا کا گلا بیٹھ گیا۔
وہ جو پہلے بات کو مذاق میں ٹال رہا تھا۔ سنجیدہ ہو گیا۔
وہ ثریا کو بتانا چاہتا تھا، اس نے سکینہ کی یہ بات نہیں مانی۔ سکینہ گھر کی ملکہ ہو گی۔ کوئی کام نہیں کرے گی۔ سارا خرچا سکینہ کے ہاتھ میں ہو گا۔ وہ سکینہ کی ساری شرطیں مانتا گیا۔
''مگر ثریا ماں نہیں بنے گی۔'' بشیر یہ بات نہیں مان سکتا تھا۔
وہ یہ بات ثریا کو بتانا چاہتا تھا مگر ثریا نے اس کی سنی ہی کہاں؟ پیلی بھڑ بن کے ڈنک مارنے لگی۔
پھر بشیر کو بھی تاؤ آ گیا۔ پہلے گالم گلوچ پھر ہاتھا پائی۔
اور آخر میں بشیر نے پوری قوت سے ٹانگ ماری اور ثریا چارپائی سے نیچے جا گری وہ تن فن کرتا دروازہ زور سے مار کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔
اس کے پاس آپشن تھا۔ ثریا کے پاس نہیں تھا۔ فرق بس اتنا تھا۔ وہ وہیں اوندھی گری بلکتی رہی۔
اس کی ذات میں شور بہت تھا۔ اسے گھٹ گھٹ کر رونا نہیں آتا تھا۔ وہ منحوس بلیوں کی طرح آوازیں نکال نکال کر روتی۔ بین کرتی، بددعائیں دیتی وہ ثریا تھی رشیداں نہیں۔
''کیوں، مار کھائی ہے۔'' رسولاں نے تڑخ کر پوچھا۔
رشیداں خاموشی سے السی کی پینیاں بنا رہی تھی۔ السی کو صاف کرنا پیسنا، پنیاں بنانا کوئی آسان کام تھوڑی تھا۔ وہ سارا دن اپنی سوچوں، اپنے خیالوں سے علی بخش کو چھانٹتی خود کو صاف کرتی اور رفیق کو لگتا وہ اب بھی علی بخش کو اپنے پلو میں چھپائے پھرتی ہے۔ وہ باقی کا دن رات رشیداں کو پیٹتا رہتا، اپنی باتوں اپنے طعنوں اپنی گالیوں سے اگلے دن وہ پھر سے وجود کی پینیاں گھڑتی اٹھ جاتی۔
''تو کیا کروں؟'' رشیداں نے نیچی نظروں سے صحن میں اڑتی ثریا کو دیکھا۔
جس دن رشیداں کو مار پڑتی وہ اتنی ہی خوش ہوتی تھی۔

pklibrary.com

''میں چپیڑ لگاؤں گی وہ ڈنڈا اٹھالے گا۔ گھر کا جھگڑا کوٹھے چڑھے گا، دنیا تماشا دیکھے گی۔ دنیا کو تماشا نہیں دکھاتے رسولاں۔''

''تماشا دیکھنے والے تو گھر میں موجود ہیں۔''

رسولاں نے کھا جانے والی نظروں سے ثریا کو دیکھا جو چارپائی دیوار کے ساتھ کھینچ اس پر چڑھی پڑوس کی سہیلی سے بات کر رہی تھی۔

''جب طاقت سے مقابلہ نہ ہو ادھر صبر کا بوٹا لگا دو اللہ گھنی چھاؤں دے گا۔''

''مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ تیرا صبر ان پر پڑ نہ جائے۔'' رسولاں نے دہل کر کہا تھا۔

ثریا اور شدت سے رونے لگی۔

''تیرا صبر مجھ پر پڑ گیا ہے رشیداں..... دیکھ میں مار کھا رہی ہوں اور وہ بند کمرے میں مجھ پر ہنس رہی ہے تیرا صبر مجھ پر پڑ گیا ہے۔''

☆☆☆

''اس کی زبان ایک ہی بار کیوں نہیں کاٹ دیتے۔ آدھی رات کو تماشا شروع ہو جاتا ہے۔ کیسی منحوس آواز میں روتی ہے۔ آس پڑوس میں بھی آواز جاتی ہوگی۔'' بچے کو تھپکتے سکینہ کے لہجے میں ناگواری تھی۔

''تمہاری زبان نہ کاٹ دوں۔'' بشیر اسی پر چڑھ دوڑا۔

''آہستہ بولو۔ عبداللہ اٹھ جائے گا۔'' ہلکا سا ڈانٹ کر اس نے عبداللہ کو مزید قریب کر لیا۔

''ہر بات میں زبان چلاتی ہے۔ ہر بات میں لڑتی ہے۔ جان عذاب میں آ گئی ہے، جب سے اسے گھر لایا ہوں۔'' وہ عبداللہ کے دوسری طرف بیٹھ گیا۔

سکینہ کو یہ سن کر خاصی خوشی ہوئی۔ کہ ثریا آہستہ آہستہ اس کے لیے عذاب بنتی جا رہی ہے۔

''اچھا پریشان مت ہو۔ صبح کام پر بھی جانا ہے۔ سکون سے سو جاؤ۔'' سکینہ نے ہمدردی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''میں نے بھی اسے کچھ زیادہ ہی سر پر چڑھا لیا ہے۔''

ہر وہ جملہ جو سکینہ چاہتی تھی۔ بشیر کے لبوں سے ادا ہو رہا ہے۔

لگتا ہے ثریا تمہارے دن گنے جا چکے۔

''صبح جلدی جگا دینا۔ اگلے چار دن کوٹھی میں ہی رہوں گا۔ ڈبل شفٹ لگانی ہے۔''

''سکون سے سو جاؤ، جگا دوں گی۔''

سکینہ کی نرم انگلیاں اس کے بالوں کا مساج کرنے لگیں۔

بشیر نے آنکھیں بند کر لیں۔

''سکینہ سچ میں بہت اچھی ہے، ثریا تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔''

☆☆☆

نیلے سوٹ کی فٹنگ کمال تھی۔ نرم و ملائم کپڑا کمر پر جھولتے شیمپو، کنڈیشنر لگے بال، بکھری چمکتی رنگت، گلابی ملائم ہونٹ۔ انصٰی نے اتنی حیرت سے خود کو دیکھا۔ اچھی خوراک، آرام، بے فکری سوکھی سی انصٰی ایک گداز بدن والی خوب صورت لڑکی کا روپ دھار چکی تھی۔

گویا برا وقت گزر گیا تھا۔ اب اس کا خوب صورت وقت اور شاندار مستقبل اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''کاش آپا ثریا! تم مجھے اس طرح دیکھتیں جو کچھ تم نے بدنامی کے بدلے حاصل کیا تقدیر نے کس پیار سے میری جھولی میں ڈالا۔''

تیز بیل نے اس کا سارا فسوں توڑ ڈالا۔

''اب کون آ گیا؟'' اس نے بددل ہو کر دوپٹہ کھولا اور کندھے پر ڈال لیا۔ جب تک اس نے الماری سے ڈبہ کھول کر نئی چپل نکال کر پہنی تب تک مراد دروازہ کھول چکا تھا۔

افشاں کی چہکتی آواز کمرے تک آنے لگی۔

اس کی عادت تھی۔ دروازے پر ہی مراد سے باتیں بگھارنی شروع کر دیتی۔ نجانے کون سی راز و نیاز کی باتیں تھیں۔ جو اقصیٰ کو دیکھتے ہی چپ لگ جاتی یا موضوع بدل جاتا اقصیٰ کا موڈ خراب ہونے لگا۔

''اتنے اچھے نمبر لیے ہیں نرمین نے مجھے تو اپنے رزلٹ سے زیادہ اس کے رزلٹ کی خوشی ہے۔ مراد بھائی اس نے کتنے تھوڑے سے دن محنت کی تھی۔''

مٹھائی کی پلیٹ افشاں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ دروازے میں مراد کے مقابل کھڑی تھی۔

''اس نے اپنا رزلٹ دیکھ لیا ہوگا نا۔'' یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ وہ آمنے سامنے کھڑے ہوں اور نرمین کی بات نہ ہو۔

''ہاں ضرور دیکھ لیا ہوگا۔'' مراد بے تحاشا خوش تھا۔ جیسے نرمین کی کامیابی اس کی اپنی کامیابی ہو۔

''تو پھر منہ میٹھا کریں۔'' افشاں نے پلیٹ سے رومال ہٹایا۔

''کیوں نہیں؟'' مراد برفی کا ٹکڑا اٹھاتے اٹھاتے رکا۔

''تم سے ایک بات کہوں؟''

''بولیں۔''

''اقصیٰ کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتانا مطلب نرمین کے بارے میں۔''

''کیوں؟'' افشاں حیران ہوئی۔

''جب تک یہ باب دوبارہ نہیں کھلتا اسے بند ہی رہنے دو۔''

''آپ کو اب بھی امید ہے۔''

''مجھے یقین ہے۔''

''ارے۔'' وہ کھلکھلائی۔ ''تو اس خوشی میں کر لیں منہ میٹھا۔''

مراد جھک کر افشاں کے ہاتھ سے مٹھائی کھا رہا تھا۔ باہر سے آتی دھوپ نے اس منظر کو جگمگا کر اقصیٰ کی آنکھوں میں دھواں سا بھر دیا..... کہ اندر ہی اندر سلگنے کا عمل تو نجانے کب سے شروع تھا۔

''یہ کس خوشی میں مٹھائی کھلا رہی ہو۔ تمہاری منگنی ہو گئی کیا؟'' مراد کے سامنے اس بات پر افشاں کو شرم سی آ گئی۔

''خوامخواہ میں۔'' وہ جلدی سے اقصیٰ کی طرف مڑی۔

''میرا رزلٹ آیا ہے میں پاس ہو گئی ہوں۔''

''اچھا مبارک ہو کتنے نمبر لیے۔''

افشاں نے خوشی خوشی بتایا۔

اقصیٰ کو ہنسی آ گئی۔

نمبر تھے۔ ہے نا بھائی.....'' اس نے فخر سے مراد کو دیکھا۔
افشاں شرمندہ ہوگئی۔
ان کے گھر نمبروں کی دوڑ کہاں تھی۔ بس بچے پاس ہوجاتے تو خوشی منالی جاتی۔ مراد کو بھی اقصیٰ کا لہجہ و انداز اچھا نہیں لگا اور نہ ہی افشاں کی خجالت بھری مسکراہٹ۔
''بھئی پاس ہوگئی ہو اس بات پر انعام تو بنتا ہے، بولو کیا لوگی؟'' وہ وہیں دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔
''کچھ نہیں مراد بھائی.....'' افشاں کی چہکتی آواز بجھ سی گئی۔
''ہو ہی نہیں سکتا۔'' مراد نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور پاس آ کر افشاں کو دینے لگا۔
اقصیٰ تلملا گئی مگر بظاہر ہنس کر بولی۔
''رکھ لو۔ نمبر اچھے آتے تو ہزار کا نوٹ ملتا۔''
مراد نے ہاتھ پکڑ کر نوٹ افشاں کی ہتھیلی پر رکھ کر مٹھی بند کر کے دوسرے ہاتھ سے ایک برادرانہ شفقت سے اس کا سر تھپتھپایا۔
''جانتی ہو نا، میرا اور تمہارا کیا تعلق بن گیا تھا۔''
افشاں نے نظریں اٹھا کر مراد کو دیکھا اور اقصیٰ نے دونوں کو۔
''بتا رہی ہوں مراد بھائی! اس شادی میں میں آپ کی طرف سے شریک ہوں گی۔ بہن بن کر سارے نیگ لوں گی۔''
وہ پلیٹیں جھپکاتی تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔
''مراد بھائی! یہ کس تعلق کی بات ہو رہی تھی؟'' اقصیٰ کا انداز بہت عجیب تھا۔
''کتنی بے وقوف ہو اقصیٰ! کوئی اس طرح کسی کے منہ پر کہتا ہے۔ افشاں کو کتنا برا لگا ہے۔''
''اس سے زیادہ تو لگتا ہے آپ کو برا لگا ہے۔'' مارے غصے اور دکھ سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ بھائی نے پہلی بار ڈانٹا تھا اور وہ بھی کسی اور کی خاطر.....
''اس طرح کسی کے منہ پر نہیں کہہ دیتے۔''
''ہاں، میں تو گاؤں سے جاہل گنوار آئی ہوں۔ مجھے کیا پتا شہروں میں کیسے بات کرتے ہیں۔'' وہ روتی ہوئی کمرے میں بھاگ گئی۔
مراد ہکا بکا رہ گیا۔
اقصیٰ کا ردعمل شدید اور غیر ضروری تھا۔
''لیکن میں نے بس بات سمجھائی تھی ڈانٹا تو نہیں تھا۔ پھر اتنا کیوں رونے لگی۔''

☆☆☆

''قسم لے لیں خالہ! ایسی بد دماغ سی لڑکی ہے۔ بات تک نہیں کرنی آتی، کیسے منہ پھاڑ کر کہہ دیا اتنے سے نمبروں پر مٹھائی بانٹنے آ گئیں۔ نمبر کم ہیں تو کیا ہوا؟ پاس تو ہوگئی نا.....''
خدیجہ نے افشاں کو مسکرا کر دیکھا جو کب سے فریج کے پاس کھڑی دل گرفتی سے بولے جا رہی تھی۔ خدیجہ فرخ کے لیے چائے بنا رہی تھیں۔ جو ایک طرف بیٹھا بریانی کھا رہا تھا۔ افشاں کی لائی ہوئی مٹھائی بھی اس کے سامنے میز پر رکھی تھی۔

"ٹھیک تو ہی ہے۔"
"کیا فرخ تم بھی یہی کہو گے۔ خدا کی قسم مراد بھائی کا خیال نہ ہوتو اسے منہ بھی نہ لگاؤں۔"
"وہ کون سا تمہارا رشتے دار لگتا ہے جو اس کا خیال کرتی ہو؟" فرخ نے بے زاری سے کہتے پانی کا گلاس اٹھایا۔
"سہیلی کا منگیتر تو ہے نا۔"
"نہ وہ منگنی رہی اور نہ تمہاری سہیلی۔" فرخ نے گھونٹ بھر کے گلاس پٹخا۔
"جی نہیں کوئی منگنی ختم نہیں ہوئی۔ مراد بھائی اب بھی اس کا انتظار کررہے ہیں۔" افشاں نے تنک کر کہا۔
"کرتے ہی رہیں گے۔" فرخ بدبدایا۔
"نرمین کا رزلٹ کیسا رہا؟" خدیجہ نے بات بدلی۔
"بہت اچھے نمبر لیے ہیں۔ کاش وہ یہاں ہوتی تو ہم تینوں کالج میں داخلہ لیتیں۔" افشاں نے جوش میں بتایا۔
"تینوں کون؟" خدیجہ چائے چھاننے لگیں۔
"میں، نرمین اور اقصیٰ۔"
"وہ کالج میں داخلہ کیوں لے گی۔ اس نے تو وہاں بھی جا کر ریڑھی لگالی ہوگی۔" فرخ اٹھا اور تلخی سے کہہ کر اپنا کپ اٹھالیا۔
خدیجہ نے بغور بیٹے کو دیکھا جو کچن سے نکل رہا تھا۔
"یہ کتنا عجیب سا ہوگیا؟" افشاں کو بھی اس کے انداز بدلے بدلے لگ رہے تھے۔
"اپنی امی کو مبارک باد دینا آگے داخلہ تو لوگی نا۔"
"ہاں، ہاں ضرور لوں گی......"
"اچھی بات ہے۔" انہوں نے افشاں کا کپ اس کے سامنے رکھا۔
"خالہ اب آپ —— کھیر پکا کر محلے میں نہیں بانٹیں۔"
"کیا کروں؟ پہلے تو فرخ دے آتا تھا۔ اب بڑا ہوگیا ہے تو کہتا ہے اچھا لگتا ہوں یوں پلیٹیں اٹھا اٹھا گھروں میں دیتا پھروں۔"
"لو کل تک تو ہمارے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔" افشاں ہنسی۔
"نہیں بیٹا! اب جوان ہوگیا ہے۔ مجھے بھی اچھا نہیں لگتا اس طرح ہر کسی کے گھر جائے۔" خدیجہ نے رسانیت سے سمجھایا "تم بھی سیانی ہوگئی ہو۔ احتیاط کیا کرو۔"
"جی خالہ! نرمین نے اپنا رزلٹ دیکھ لیا ہوگا نا......؟" اس کی تان گھوم پھر نرمین پر ٹوٹی۔

☆☆☆

نرمین کمرے میں داخل ہوئی تو سارا گھر وہیں جمع تھا بارات واپس آ گئی تھی۔ تو سب لوگ تھکے ہارے یہاں وہاں لڑھکے...... چائے چائے کررہے تھے۔ شادی والا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا مگر اکثر مہمان سہیل کے گھر ٹھہرے تھے۔
"ماموں! آپ نے بلایا؟"
"ہاں ہاں یہاں بیٹھو میرے پاس کیوں سب سے الگ تھلگ رہتی ہو بچے! لگتا ہے ابھی تک دل نہیں لگا۔" انہوں نے بے حد شفقت سے اپنے پاس جگہ بنائی۔
"کبھی اتنے دن اپنے گھر سے دور نہیں رہی ماموں۔" نرمین بیٹھنے کے لیے آگے بڑھی...... کہ پیالیوں سے بھری ٹرے لے کر آتی نازیہ باجی نے روک لیا۔

pklibrary.com

نمو! یہ ذرا چائے تو اٹھا اٹھا کر سب کو دینا۔"
بات تو معمولی تھی۔ مگر سہیل کے دوسری طرف بیٹھی ثمینہ نے محسوس کیا کہ نازیہ نے جان بوجھ کر نرمین کو روکا ہے۔
نرمین نے سب سے پہلے پیالی اٹھا کر ماموں کو دی۔
"جیتی رہو۔ تمہارا میٹرک کا رزلٹ کب آئے گا۔"
"پتا نہیں ماموں۔"
"میٹرک کا رزلٹ وہ تو آ گیا۔" اپنے موبائل میں بنائی بیگم کی تصویریں دیکھتے ابرار بھائی چونک گئے حالانکہ بیگم سامنے چائے کی ٹرے لیے کھڑی تھی..... اور میک اپ زدہ حسین بیگم کو دیکھ کر وہ دعا کر رہے تھے۔
"کاش تم سچ میں بھی اتنی ہی حسین ہوتیں۔"
"کیا کہہ رہے ہیں؟" نازیہ نے تنک کر پوچھا۔
ابرار گڑبڑا گئے۔
"یا اللہ! بیگمات سوچیں پڑھنے پر بھی قادر ہوتی ہیں۔"
"میں تو کہہ رہا تھا۔ تم میک اپ کے بغیر بھی خوب صورت لگتی ہو۔"
بیگم جو شرما میں باقیوں کے قہقہے بے ساختہ تھے۔
بزرگوں کی نہاتی نظروں نے دل کھول کر گھورا۔
"ساہیوال بورڈ کے رزلٹ کی بات ہو رہی ہے۔" نازیہ نے شرمندگی اور شرم سے سرخ ہوتے ہوئے شوہر کو ٹوک کر ان کے حواس بحال کیے۔
"ہاں وہ تو آج ہی آیا ہے۔ نمو اپنا نمبر دو....."
"میرے پاس تو موبائل نہیں ہے۔" نرمین ان سے زیادہ گڑبڑا گئی۔
"رول نمبر پوچھ رہا ہوں۔"
نرمین کا دل چاہا بہانا بنا دے۔ چند دنوں کی محنت کا نتیجہ نجانے کیا نکلے اگرچہ پرچے تو اچھے ہوئے تھے۔
اسے چپ دیکھ کر ثمینہ نے جلدی سے نمبر بتا دیا۔ ابرار بھائی نے نیٹ آن کر کے رزلٹ دیکھا۔
نرمین کا دل اس کی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔
ابرار نے سنجیدگی سے سر اٹھا کر نمو کو دیکھا۔
"نمو! تو تو فیل ہو گئی۔"
سب کے سب ایک لمحے کو چپ کر گئے۔
شرمندگی سے نرمین کا برا حال ہو گیا۔ کاش زمین پھٹتی اور وہ اس میں سما جاتی۔ تب ہی ایک ہاتھ اس کے سر پر آ رکا۔
"میری نمو! فیل نہیں ہو سکتی۔ یہ بہت بہادر ہے۔ بہت لائق ہے۔"
نرمین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
"امتحان بہادری سے نہیں محنت سے پاس ہوتے ہیں۔" سعدیہ بھابھی نے اپنے حصے کا کپ اٹھایا۔ انہیں ویسے بھی نرمین ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔
"کوئی بات نہیں اگلی بار زیادہ محنت کرنا۔" مامی نے تسلی دی۔ تو ابرار بھائی قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔
"بہت اچھے نمبر لیے ہیں پگلی! تم پاس ہو گئی ہو۔"
نرمین چیخ مار کر اپنے عقب میں کھڑے باپ سے لپٹ گئی۔ ثمینہ ناراض تھی۔ اس سے مگر نرمین نے زور سے جھپی ڈال لی۔ بچے خوشی سے لڈیاں ڈالنے لگے۔

''میں تمہیں بتا رہا ہوں ثمینہ! تمہاری یہ بیٹی سب سے الگ ہے۔''
''الگ لوگ بہت دکھ اٹھاتے ہیں بھیا۔'' ثمینہ آہستگی سے گویا ہوئی۔
''دکھ ہی تو انسان کو کندن بناتے ہیں۔ اور جب انسان کندن بن جائے تو اس کے حصے کی خوشیاں کوئی نہیں روک سکتا۔''
سہیل نے تعریف کی تھی انور حسین کی آنکھوں میں فخر سا در آیا۔
وہ بیٹا نہیں، بیٹی تھی، مگر انور حسین اس پر فخر کر سکتا تھا۔
''ہماری آپی بہت بہادر اور محنتی ہیں۔'' طلحہ نے عقب سے نرمین کے گلے میں بازو ڈال دیے۔ ''جب ہم بھوکے رہتے تھے تو آپی ہمارے لیے۔''
''اب کیا ارادہ ہے بچے.....'' ماموں نے بات کاٹ کر بات بدل بھی دی۔
''میں نے کالج میں داخلہ لینا تھا ماموں.....'' نرمین نے طلحہ کو بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے ماں کوشا کی نظروں سے دیکھا۔
ثمینہ نظریں چرا گئی۔
''فکر نہ کرو۔ میں پتا کرتا ہوں کالج میں کب داخلے شروع ہو رہے ہیں۔''
کچھ لوگوں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ مگر کچھ نے بہت چونک کر سہیل کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

''تمہاری پسند کی بریانی اور دہی بھلے لایا ہوں۔'' مراد نے چوتھی بار دروازہ کھٹکھٹایا۔ حالانکہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اقصیٰ کس بات پر اس سے ناراض ہوئی۔ اتنی معمولی بات پر کون ناراض ہوتا ہے۔
مگر اقصیٰ کو عادت تھی۔ وہ اسی طرح معمولی باتوں پر منہ موڑ کر ناراض ہو کر کھیتوں کے کنارے جا کر بیٹھ جاتی اور رشیداں اسے آوازیں دے دے کر تھک جاتی۔ پھر ہار کر اقصیٰ کو بازو سے پکڑ کر چولہے کے پاس بٹھا کر پہلا نوالہ اپنے ہاتھ سے کھلاتی۔
مراد کی آواز میں بھی وہی فکر تھی۔ جو رشیداں کے لہجے میں تھی۔
''ٹھیک ہے پھر میں کام سے جا رہا ہوں رات کو دیر سے آؤں گا۔''
اقصیٰ تیزی سے اٹھی اور دروازے کا لاک کھول دیا۔
مراد وہیں کھڑا تھا۔ اقصیٰ نے منہ پھلا لیا۔
''اچھا بھائی کو نخرے دکھائے جا رہے ہیں۔'' وہ ہنسا۔
اقصیٰ جا کر پلنگ کے کنارے بیٹھ گئی۔
''غصہ کس بات پر ہے۔''
''آپ اس لڑکی کو مجھ سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔''
''کس لڑکی کو؟''
''افشاں کو۔''
''ہو ہی نہیں سکتا جو میرے دل میں تمہارے لیے محبت ہے وہ کسی اور کے لیے کیسے ہو سکتی ہے۔''
اقصیٰ صاف صاف پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کا افشاں کے ساتھ چکر چل رہا ہے مگر لحاظ مانع تھا کھل کر نہیں پوچھ سکتی تھی۔
''آپ میرے بھائی ہو۔ آپ کو میرا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ آپ نے اس کی خاطر مجھے ہی ڈانٹ دیا۔''
''میں نے کب ڈانٹا، صرف سمجھایا تھا۔ اتنی آؤٹ اسپوکن مت ہو جاؤ کہ اس سے کسی کا دل دکھے کیونکہ

''بھائی! آپ بالکل اماں جیسی باتیں کرتے ہو؟'' اقصیٰ جھنجھلائی۔
''مجھے اماں کی باتیں یاد نہیں ہیں۔ یا بہت کم یاد آتی ہیں۔ لیکن میں ابا کا کہا ایک لفظ نہیں بھولا مجھے ابا حرف حرف یاد ہے۔'' وہ کھو سا گیا۔
''ان دونوں کی باتیں اچھوتی ہیں۔'' اقصیٰ کا لہجہ تیز تھا۔
مراد نے چونک کر دیکھا۔
''ایک حرف نہیں پڑھا مگر کتابی باتیں کرتے تھے۔ یہ دنیا اسی کی ہے جو آگے بڑھ کر اسے لے لے۔ صبر تحمل برداشت سے کچھ نہیں ملتا بس پستے رہو، ترستے رہو اور مر جاؤ.....''
اقصیٰ کے لہجے میں بلا کی تلخی تھی۔
مراد پریشان سا ہو گیا۔
''یہ کس کو اپنا رول ماڈل بنا لیا ہے؟''
اقصیٰ یہ نہیں بتا سکتی تھی اس کے ناپختہ ذہن نے ثریا اور رشیداں کی زندگی کا موازنہ اپنی سوچ سمجھ کے مطابق کیا تھا۔
رشیداں جو ساری عمر شوہر کی مار کھانے اور مشقت کے بعد قبر میں پڑی تھی۔ اور ثریا۔
اس نے تصور میں کئی بار ثریا کو اپنے محبت کرنے والے شوہر کے ساتھ ٹائلوں والے خوب صورت گھر میں راج کرتے دیکھا تھا۔
بات کسی اور طرف نکل گئی تھی۔ اس لیے مراد نے پلٹ دی۔
''آؤ کھانا کھالیں، اندر سے دروازہ اچھی طرح بند کر لینا۔ شاید تھوڑی دیر ہو جائے۔''
مراد کھڑا ہو گیا۔
اقصیٰ کے منہ سے ہی سہی..... لیکن وہ اپنے ماں باپ کے خلاف ایک حرف نہیں سن سکتا تھا۔
''بھائی! مجھے ایک موبائل لے دیں۔''
''اس کی کیا ضرورت پڑ گئی؟''
''گھر میں اکیلی ہوتی ہوں۔ کوئی ضرورت پڑ جائے تو آپ کو کال کیسے کروں گی؟ آپ نے مالک مکان کے گھر جانے سے بھی منع کیا ہے۔''
''یہ بھی ہے۔'' مراد کو نرمین والا موبائل یاد آیا۔
(مگر نہیں..... وہ اسی کا ہے)
''میں بندوبست کرتا ہوں۔''
''ٹھیک ہے۔'' وہ مسکرائی۔
''بہت چالاک ہو۔ یہ اپنے ماننے کی قیمت وصول کی ہے۔'' مراد نے اس کے سر پر چپت لگائی۔
''یہی سمجھ لیں۔''
''اس طرح تو میں بہت جلد کنگال ہو جاؤں گا۔'' وہ بے چارگی سے گویا ہوا۔
''تو مجھے مت ناراض کیا کریں۔'' اقصیٰ اٹھلائی۔
''اب تو پوری کوشش کرنی پڑے گی اور دیکھو، افشاں سے چڑا مت کرو۔ ہمارا اس شہر میں کوئی بھی نہیں ہے۔ اب تم ہو تو مجھے ان لوگوں کی ضرورت ہے۔''
مراد نے کھڑے ہوتے ہوئے سمجھایا۔

"بس اتنی سی بات ہے؟"
"اور کیا بات ہوگی۔"
"آجائیں، کھانا گرم کرتی ہوں۔" اقصیٰ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
کھانے کے بعد مراد چلا گیا۔
اقصیٰ نے دروازے، کھڑکیاں بند کیں اور اپنے کمرے میں آ گئی۔
مراد کو اس کی فکر رہتی تھی کہ وہ گھر میں تنہا ہے۔
مگر اقصیٰ کو ڈر نہیں لگتا تھا۔
یہ تنہائی اس سے بہت کم ڈراؤنی تھی جو اس نے کھیتوں کے کنارے گیدڑوں کی آوازیں سنتے بھوگی تھی۔
اقصیٰ نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا اور دوپٹہ اتار کر کرسی پر رکھ دیا۔ دوپٹہ اوڑھنے کی عادت بچپن سے ہی تھی۔ ماں اسے کبھی سر نگار رکھنے نہیں دیتی تھی۔ رفیق کے سامنے بھی نہیں۔ اس لیے وہ مراد کے سامنے اوڑھ کر رکھتی۔ مراد نے ایک بار سراہا تھا، اسے اقصیٰ کی یہ عادت اچھی لگتی ہے۔
اقصیٰ نے دراز کھول کر لپ اسٹک نکالی۔ ساری شاپنگ میں اس نے یہ دو لپ اسٹکس بطور خاص لی تھیں۔
اس نے سرخ رنگ کو دیکھا اور اپنے گلابی مائل گداز ہونٹوں کو۔
"کتنی بار کہا ہے، کنواری لڑکیاں اتنی گوڑھی سرخی نہیں لگاتیں۔"
"تو کیا تیری عمر میں لگائیں گے، یہی تو عمر ہوتی ہے۔"
رشیداں کو عادت تھی ہر وقت ٹوکنے کی۔
اور ثریا اس کی ٹوکا ٹوکی کو جوتے کی نوک پر رکھتی تھی۔
اقصیٰ کا دل للچاتا..... مگر رشیداں کے ڈر سے کبھی ہاتھ نہ لگایا۔
اور اب نہ رشیداں تھی نہ اس کی ٹوکا ٹوکی۔
اقصیٰ نے گہری سانس لے کر لپ اسٹک لگانی شروع کر دی۔
صبر..... خواہشوں کی موت ہے۔
تحمل..... زیاں کا احساس۔
برداشت..... دوسروں کو اجازت دینا کہ آؤ مجھے روند کر رکھ دو۔
اور اقصیٰ کو ان تین لفظوں سے نفرت تھی۔
اس کا چہرہ سرخ ہونٹوں کے ساتھ دمکنے لگا تھا۔

☆☆☆

کس دقت سے وہ خود کو کمرے سے باہر آنے پر آمادہ کر سکی تھی، ورنہ دل تو جیسے بھڑک بھڑک کر راکھ ہوا جاتا تھا۔
گھر، شوہر، بچہ ہر عورت کی طرح وہ بھی تو یہی خواب لے کر یہاں آئی تھی۔ خواب جو کرچی کرچی ہو کر اسے لہولہان کر رہے تھے۔
کچن یوں اوندھا پڑا تھا جیسے دو افراد نے نہیں، پورے گھر نے ناشتہ کیا ہو۔
اور کھانے کو کوئی ایک چیز بھی نہ تھی۔ بریڈ، سالن، آٹا، کچھ بھی نہیں۔
دوپہر ہو رہی تھی اور سکینہ تسلی اور اطمینان سے برآمدے میں بچی سنوری بیٹھی، موبائل پر ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔
"میں مر گئی تھی تو کچھ بنا ہی لیتی۔" ثریا کچن سے نکلی۔
"بشیر نے آنا نہیں تھا، میں نے اور عبداللہ نے کھا لیا ہے اور کس کے لیے بناتی۔" وہ بغیر متوجہ ہوئے بولی۔

''اور جو میں تمہارے تھوتھنے کے لیے پکاتی رہی ہوں وہ.....'' ثریا کو غصہ آیا۔
''میرے لیے نہیں، بشیر کے لیے پکاتی تھی۔ اب اپنے لیے بھی کچھ بنالو۔''
''کچھ چھوڑا ہو تو بناؤں، پیسے دو۔''
''پیسوں کا کیا کرو گی؟'' سکینہ نے چونک کر موبائل سے نظریں ہٹائیں۔
''زہر منگواؤں گی۔''
''پیسے ضائع کرنے کا فائدہ..... وہ تو بشیر تمہیں خود ہی دے دے گا۔''
سکینہ ہنسنے لگی۔
''کہہ رہا تھا، خواہ مخواہ چڑیل گلے ڈال لی ہے۔ سکینہ! اچھی خاصی تمہارے ساتھ زندگی گزر رہی تھی۔''
''تو ٹھیک ہے، سنبھال اپنا گھر۔ گھر تمہارا..... شوہر اور بچہ تمہارا.....'' ثریا غصے میں بڑبڑاتی دروازے تک گئی اور کھول کر باہر جھانکنے لگی۔ ماجد کچھ گاہکوں کو بھگتا رہا تھا۔
ثریا کو دیکھ کر جلدی جلدی نمٹا کر بھاگا۔
''سلام بھابھی! کچھ چاہیے؟''
''ڈبل روٹی اور دو انڈے دے دو۔''
بھابھی نمبر ایک نے بے حد حیرت سے اس منظر کو دیکھا۔
''پیسے کون دے گا؟''
''تیرا خصم دے گا۔'' سکینہ کے سوال پر ثریا نے تڑخ کر جواب دیا اور ساتھ ہی ماجد سے کہا۔ ''کھاتہ کھول لو۔''
''ابھی لایا۔''
وہ منٹوں میں ڈبل روٹی اور انڈے دے گیا۔ سکینہ نے حیرت سے شاپر کو دیکھا۔ ثریا نے بسکٹ نہیں کہے تھے مگر شاپر میں دو بسکٹ کے پیکٹ بھی تھے، جس کا حساب کسی کھاتے میں نہیں لکھا جانا تھا۔
(یہ کیا چل رہا ہے) سکینہ متحیر تھی۔
ثریا نے ناشتہ بنایا اور ٹرے کمرے میں لے گئی۔
سکینہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اسے کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ثریا نے خود اپنے لیے گڑھے کھودنے شروع کر دیے تھے۔ اسے بس خاموشی کے ساتھ بیٹھ کر ثریا کی واپسی کے دن گننے تھے۔

☆☆☆

بکائن کی پتیوں نے جھڑ جھڑ کر صحن میں ہوا کے سنگ کلکلی کھیلنی شروع کر دی تھی۔ خزاں کی خوش گوار ہلکی سرد ہوا درختوں پر جھومتی نئے موسموں کا سندیسہ سناتی تو درخت بخوشی اپنا پیرہن بدلنے کو تیار ہو جاتے۔
دیکھنے والوں کے جذبات و احساسات پر اداسی کی دھند چھا جاتی۔ مگر نئے موسموں کو خوش آمدید کہنے کے لیے پرانے موسموں کو خدا حافظ کہنا پڑتا ہے، انہیں وداع کرنا پڑتا ہے۔
ان ہی خزاں رسیدہ پتوں پر وہ چاروں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اونچی تانوں میں نظم پڑتے، گول گھومتے کھیل رہے تھے۔
بادل گرجے..... بادل گرجے
سنتے ہو کیا؟ سنتے ہو کیا؟
تم بھیگے..... ہم بھیگے..... سب بھیگے.....
وہ ایک دم ہاتھ چھوڑ کر نیچے بیٹھ جاتے جو لیٹ ہو جاتا، اس کی پٹائی لگتی۔
باپ کے پاؤں دباتی نرمین نے چپکے سے ماں کو دیکھا۔

وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹی چھوہارے کاٹ رہی تھی۔ جو نیر مین ...

آج نئے دولہا دلہن کی دعوت تھی۔

"شادی تو ختم ہوگئی، اب گھر چلیں۔" بہت دیر سے لفظوں کو تولتی نرمین نے کہہ ڈالا۔

انور حسین نے چونک کر نرمین، پھر ثمینہ کو دیکھا۔

"گھر کا خیال دل سے نکال دو، میرا بھائی بہت مان سے یہاں لے کر آیا ہے۔ دیکھا نہیں سب کتنی قدر کرتے ہیں، کتنا خیال رکھتے ہیں۔ بھتیجے، ان کی بیویاں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ اب واپسی ناممکن ہے۔ بھائی نے کہا ہے، وہ یہیں بچوں کے داخلے کا بندوبست کردیں گے۔"

ثمینہ نے حتمی انداز میں کہا۔

"ماموں نے ابھی تک گھر میں کسی کو نہیں بتایا کہ ہم یہاں مستقل رہنے آگئے ہیں۔" نرمین کا لہجہ تیز تھا۔

"پتا کریں امی! کہیں ارادہ تو نہیں بدل گیا۔"

"میں نے منع کیا تھا کہ کچھ دن رک کر دیکھ لیں۔ تمہارے ابو کی حالت...... اور دیکھ لیں بچوں کا دل لگتا ہے کہ نہیں...... اور دیکھ لو، وہ یہاں بہت خوش ہیں۔"

بادل گرجے...... بادل گرجے

"بس بھی کرو۔" نازیہ جھنجلا کر کچن سے نکلی۔ "گھنٹے بھر سے دماغ کھایا ہوا ہے۔ شور کر کر کے تھکتے نہیں ہو۔"

بچے ایک دم چپ کر گئے۔

"ثمرین، فضہ! اتنی بڑی ہوگئیں، چلو وہ جھاڑو اٹھاؤ اور سارا صحن صاف کردو۔ مہمان آنے والے ہیں اور اگر مہمانوں کے آنے پر تم لوگوں کی آواز نکلی تو دیکھنا، میں کرتی کیا ہوں؟"

نرمین نے ماں کو دیکھا۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے، صبح سے کام کر کر کے تھک گئی ہے۔ تمہیں تو توفیق ہی نہیں کسی کا ہاتھ ہی بٹا دو۔ میں ہی جا کر دیکھتی ہوں۔" ثمینہ جلدی سے اٹھ گئی۔

"ہمارے گھر سے تو ابھی تک شادی ختم نہیں ہوئی۔" نازیہ با آواز بلند بڑبڑاتی دوبارہ کچن میں گھس گئی۔

نرمین نے دوبارہ باپ کے پاؤں دبانا شروع کردیے۔ ٹپ ٹپ آنسو اس کے ہاتھوں پر گرنے لگے۔

انور حسین نے آنکھیں بند کرلیں...... مگر آنکھوں کے کپکپاتے پپوٹے بتاتے تھے وہ کتنا مضطرب ہے۔

☆☆☆

"اتنا غصہ کیوں کر رہی ہو؟" پیڑے بناتی سعدیہ نے اندر آتی نازیہ سے پوچھا۔

وہ روٹی پکانے کی تیاری کر رہی تھی۔ کھیر ٹھنڈی کرنے کو فریج میں رکھ دی تھی۔

"کیا کروں؟ صبح سے کام کر کر کے مرگئی ہوں۔ ایک جگہ صاف کرتی ہوں، دوسری جگہ گند ڈال جاتے ہیں۔"

اس نے سلاد کے لیے سبزیاں نکالنی شروع کردیں۔

"تھوڑے دنوں کی بات ہے، چلے جائیں گے۔"

"مجھے تو آثار نہیں لگتے۔"

"ہائے ایسا تو نہ کہو، میں تو روٹیاں پکا پکا کر مرجاؤں گی۔" سعدیہ دہل گئی۔

"تمہیں بھی بڑا شوق ہے، جب پھوپھو کہتی ہیں کہ روٹیاں میں پکا دیتی ہوں، بڑے لاڈ سے کہتی ہو۔ نہیں نہیں پھوپھو جی، میں ہوں نا۔"

ثمینہ کے قدم دروازے میں ہی ٹھٹک گئے۔

''ابھی تک تو کسی نے نہیں مگر مجھے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ اس دن ابا جی (سسر سہیل کو وہ ابا جی کہتی تھی) کہہ نہیں رہے تھے، میں نرمین کے کالج کا پتا کرتا ہوں۔ تم لکھ لینا، بیمار شوہر کا بہانا کر کے پھوپھو یہیں ٹک جائیں گی۔ شوہر بیمار بھی ہے اور نکما بھی۔ ایک تک چڑھی لڑکی اور دوسرے شیطان کے چیلے۔''

ثمینہ کے پسینے چھوٹ گئے۔ میٹھے میٹھے لہجوں کے پیچھے کیسا زہر چھپا تھا۔

''ہائے اللہ، ایک نہ دو پورے سات جی ہیں۔ ہم تو کنگال ہو جائیں گے۔''

''بھئی میں نہیں پکا رہی روٹی۔ پھوپھو سے کہتی ہوں، خود ہی پکا دیں گی۔''

سعدیہ نے پیڑا پرات میں چھوڑا۔

ثمینہ تیزی سے اندر آ گئی۔

''سعدیہ بیٹا! بھچو ہارے اور بادام کاٹ دیے ہیں۔''

دونوں گڑگڑا سی گئیں۔ ثمینہ نے پلیٹ رکھی اور واپس مڑ گئی۔

''ہائے اللہ، انہوں نے کہیں سن تو نہیں لیا۔'' سعدیہ نے پریشانی سے نازیہ کا چہرہ دیکھا۔

''مجھے پروا نہیں۔'' نازیہ نے لاپروائی سے سر جھٹکا۔

ثمینہ دل گرفتی سے آ کر باہر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

اسے بھائی کے خلوص پر شبہ نہیں تھا مگر وہ یہ بھول گئی۔ گھر میں اور لوگ بھی تھے، وہ ان کے آنے پر کیسا محسوس کریں گے۔

''جیسا بھی محسوس کریں، مجھے کیا؟ میں خود تو نہیں آئی۔ میرا بھائی مجھے لے کر آیا ہے۔ خود ہی گھر والوں سے بات کرے گا۔''

اس نے خود کو تسلی دی۔

اور جب دوسروں کے گھر رہنا ہو تو چار باتیں سننی بھی پڑ جاتی ہیں۔ وہاں تھوڑا کچھ برداشت کیا تھا۔

ثمینہ نے اٹھ کر جھاڑو اٹھائی اور صحن میں دینے لگی۔ ثمرین کام ادھورا چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔

☆☆☆

نرمین کے ہاتھ برعت سے روٹیاں بیل رہے تھے۔ اس کی روٹی نرم، پھولی ہوئی اور گول تھی۔ سعدیہ نے ستائش سے دیکھا۔

''مجھے تو لگا تھا، تمہیں کچھ کرنا نہیں آتا۔''

نرمین نے ایک نظر اسے دیکھا اور خاموش رہی۔ وہ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ اسے کیا کچھ کرنا آتا ہے۔ وہ تو نازیہ نے کہا کہ وہ بہت تھک گئی ہے۔ اسے روٹیاں بنانی آتی ہیں تو بنا دے، تو وہ ٹال نہ سکی۔ مہمان بھی آنے والے تھے۔ نازیہ میز سیٹ کرنے لگی۔

''تمہیں تو اب جا کر ایڈمیشن لینا ہوگا۔''

''جی۔''

''بچوں کی بھی بہت چھٹیاں ہو گئیں۔ کافی حرج ہو گیا ہے۔ بہت محنت کرنا پڑے گی۔'' ٹرے میں گلاس نکالتی سعدیہ نہ جانے کیا پوچھنا چاہ رہی تھی۔

نرمین نے الجھ کر دیکھا۔ تب ہی نازیہ آ گئی۔

''نمو! روٹیاں بن گئیں؟''

''جی، دیکھ لیں۔ اتنی کافی ہیں۔''

''اچھا، اب ایک چھوٹا سا کام کرنا۔ بچوں کو تھوڑی دیر کے لیے کنٹرول کر لینا۔ وہ کھانے کی میز پر بہت ادھم مچاتے ہیں۔ مہمانوں کو کھانا کھلا کر پھر ہم سب بھی کھالیں گے۔''

''اور کیا؟ دلہن کی تو مت مار دیتے ہیں۔ کوئی اس کی چوڑیاں چھیڑ رہا ہے، کوئی دوپٹہ اتار رہا ہے۔'' سعدیہ نے ہنستے ہنستے کہا۔

''لڑکیو! جلدی کرلو۔ مہمان آگئے ہیں۔'' مامی سائرہ نے جھانک کر دیکھا۔

''سب کچھ ہوگیا ہے۔'' نازیہ نے تسلی دے کر نرمین کو دیکھا۔

''فکر نہ کریں نازیہ باجی! میں انہیں سنبھال لوں گی۔''

وہ آہستہ سے کہہ کر ہاتھ دھو کر باہر آگئی۔ بڑے سے ہال نما کمرے میں ثمینہ مہمانوں سے مل رہی تھی اور بچے سب سے پیچھے کھڑے اپنی باری کے منتظر تھے۔ نرمین نے مہمانوں کو سلام کیا اور بچوں کو بہلا پھسلا کر چھوٹے کمرے میں آگئی، جہاں انور حسین لیٹا تھا۔ بچے باہر جانے کو مچل رہے تھے۔ نرمین نے بری طرح ڈانٹ دیا۔ طلحہ اور حذیفہ باپ کے کمبل میں ناراض ہو کر چھپ گئے۔

ثمرین اور فضہ ایک چارپائی پر چڑھ کر بیٹھ گئیں۔

انور حسین نے دیکھا، نرمین نہ جانے کس بات پر الجھی ہوئی اور ناراض تھی۔

''نمو! مہمان آگئے؟''

''جی۔'' نرمین نے مختصر کہا۔ ''آپ نہیں جائیں گے؟''

''ابرار بلانے آیا تھا مگر میرا دل نہیں کر رہا۔''

نرمین خاموشی سے فضہ اور ثمرین کے پاس بیٹھ گئی۔

''آپا! دلہن دیکھنی ہے۔'' تھوڑی دیر کے بعد فضہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''چپ کر کے لیٹو۔'' نرمین نے ڈانٹ کر رکھ دیا۔

''آپا!'' طلحہ کمبل میں منمنایا۔

''اب تمہیں کیا ہے؟''

''بھوک لگی ہے۔''

''مل جائے گا کھانا۔ یہاں آکر سب کی عادتیں خراب ہوگئی ہیں۔'' وہ بھی ڈانٹ کھا کر خاموش ہوگیا۔

انور حسین نے دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

بہت دیر کے بعد ثمینہ کو احساس ہوا کہ بچے غائب ہیں تو بے چینی سے کھڑی ہوگئی۔ مہمان کھانا کھا کر وہ کھیر کھا رہے تھے جس میں سعدیہ چھوہارے اور بادام ڈالنا بھول گئی تھی اور بعد میں اوپر سے ڈالے گئے تھے۔

''کیا ہوا؟'' مامی سائرہ نے پوچھا۔

''میں بچوں کو دیکھ لوں۔''

''ہاں، ہاں۔ جاؤ، انہیں کھانا وانا کھلاؤ۔'' سہیل نے خوش دلی سے کہا۔

''بھئی ثمینہ! اور کتنے دن رکو گی؟'' کسی رشتے دار عورت نے پوچھا۔

ثمینہ نے ٹھٹک کر بھائی کو دیکھا۔

''برسوں بعد چکر لگا ہے، اتنی جلدی جانے تھوڑی دوں گی اپنی نند کو۔'' سائرہ مامی نے پیار سے کہا۔

''میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ جانے سے پہلے میں نے بھی دعوت کرنی ہے۔ اب کے گئی تو نہ جانے

''فکر نہ کرو بے بے! ثمینہ اب یہیں ہے۔ جب دل چاہے دعوت دے دینا۔'' سہیل نے ہنس کر کہا۔
''کیا مطلب؟'' بھابھی سعدیہ نے حیرت سے دریافت کیا۔
''مطلب یہ کہ میری بہن اب یہیں میرے ساتھ رہے گی۔ اپنے خاندان کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔''
پورے کمرے میں یوں سناٹا ہوا کہ سوئی بھی گرے تو آواز آئے۔
ثمینہ نے اس خاموشی کی اوٹ سے جھانکتی سرگوشیوں کو سنا اور کمرے میں آ گئی۔
بچے سو چکے تھے۔ نرمین گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔
انور حسین چھت کو گھور رہا تھا۔
''نرمین! بچوں نے کھانا کھا لیا۔''
''نہیں۔'' نرمین نے سر نہیں اٹھایا۔
''حد کرتی ہو۔ یہاں آ کر تو ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ گئی ہو۔ کم از کم انہیں کھانا تو کھلا دیتیں۔ دس چیزیں پکی ہیں اور بچے بھوکے سو گئے۔'' وہ اسی پر بگڑنے لگی۔
نرمین نے چپ سادھ لی۔ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ اتنا خیال تھا تو رشتے داروں کی جی حضوری سے وقت نکال کر پہلے دیکھ جاتیں۔ کہا تو بس اتنا ہی.....
''بھابھی نے کہا تھا بعد میں کھلا دیں گے۔''
''بھابھی!'' کچھ کہتے کہتے ثمینہ نے لب بھینچ لیے۔ ''بچوں کو جگاؤ، میں کھانا لاتی ہوں۔''
''اب انہیں سونے دو۔ نیند مہربان ہو تو بھوک محسوس نہیں ہوتی۔''
انور حسن کا لہجہ مدھم اور شکست خوردہ تھا۔
''جاؤ، اپنے ابو کو کھانا کھلا دو۔ انہیں دوا بھی کھانی ہے۔'' ثمینہ ہار کر پائنتی کی طرف بیٹھی۔
''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' انور حسین نے بات ہی ختم کر دی۔
ثمینہ کو اپنے کھانا کھانے اور سب کے ساتھ بیٹھ کر ہنسنے بولنے پر شرم آنے لگی۔
نرمین نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔
(ابھی تو آغاز ہے امی!)

☆☆☆

''یہ آپ نے کیا کہا ابو! پھوپھو اور سارے گھر والے ہمیشہ یہیں رہیں گے۔''
مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد ساری فیملی دوبارہ جمع ہو گئی۔ جس کے بارے میں نازیہ اب فخریہ کہتی تھی، دیکھا پہلے ہی بتا دیا تھا۔
''اس میں اتنی پریشانی والی کون سی بات ہے۔'' سہیل نے دونوں بیٹوں کو گھورا جو منہ میں اپنی اپنی بیویوں کی زبان لے کر بیٹھ گئے تھے۔ سائرہ چپ تھیں۔ پریشان تو وہ بھی تھیں مگر شوہر کے سامنے کچھ کہنے کی ہمت نہ تھی۔
''میری مصیبتوں کی ماری بہن کو میری ضرورت ہے تو پیچھے ہٹ جاؤں۔ ساتھ نہ دوں۔''
''ساتھ دیں..... مگر اس طرح پورا خاندان اٹھا کر یہاں لے آنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ کہاں رہیں گے۔ کھائیں گے کہاں سے۔ بچوں کی تعلیم..... لڑکیوں کی شادی،..... ہم کون سا بہت امیر ہیں، سب کیسے ہوگا؟''
ابرار بولتا چلا گیا۔ سب نے تائید میں سر ہلایا۔
''پیسہ نہیں، دل ہونا چاہیے۔ سب ہو جاتا ہے۔''

چھوٹے کے منہ میں بھی بیوی کا شہد کا کھا کر زبان آ گئی۔
''فکر نہ کرو، تم لوگوں سے نہیں لوں گا۔'' سہیل کو غصہ آ گیا۔
''اتنے کمرے تو نہیں ہیں گھر میں، سات لوگ کہاں ٹھہریں گے۔''
سائرہ منمنائی۔
''بہت بڑا صحن ہے۔ ایک کمرہ ادھر ڈال دوں گا۔ مل ملا کر انور حسین کو دکان ڈال دیں گے۔ اپنے بچوں کا خرچا نکال لے گا۔''
سہیل نے چٹکیوں میں حل پیش کیا۔
''اور اس سب کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا؟''
''تمہاری جیبوں سے نہیں نکلواؤں گا۔ وہاں انور حسین کا مکان ہے، وہ بیچ کر سب کر لوں گا۔'' یہ خیال بھی سہیل کے دماغ میں بیٹوں کے تیور دیکھ کر ہی آیا تھا۔ ورنہ ان کا ارادہ اس مکان کو کرائے پر چڑھانے کا تھا۔
''بیمار بندہ ہے انور حسین! کم از کم میری نظروں کے سامنے تو رہے گا۔ میں جن حالوں میں انہیں دیکھ کر آیا ہوں، اس کے بعد انہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔''
''کوئی بیمار نہیں ہیں پھوپھا جی! ہٹے کٹے ایویں ڈرامے کر رہے ہیں۔'' نازیہ تنک کر بولی۔
''تم لوگوں کے پیٹ میں کیوں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ میرا گھر ہے، میری مرضی جسے دل چاہے رکھوں، جسے دل چاہے نکال دوں۔'' سہیل بھڑک اٹھے۔
رات کی تاریکی میں آوازیں بلند ہونے لگیں۔
ہر کسی کا اپنا نقطۂ نظر تھا۔
ہر کوئی اپنی جگہ ٹھیک تھا۔
رات ڈھلتی رہی..... ڈوبتی ابھرتی..... منمناتی..... گرجتی ہر قسم کی آوازیں پردے چاک کرتی رہیں۔
پردے جو آنکھوں پر تھے.....
پردے جو دلوں پر تھے.....
(اور یہ تو آغاز ہے امی! ہجرت ہر کسی کو راس نہیں آتی)

☆☆☆

اقصیٰ نے خود دیکھا مراد نے سارا سودا اسے لا کر دیا تھا، مگر وہ کسی برانڈ کے لوگو والا سفید شاپر خاموشی سے بیٹھک میں ہی رکھ دیا تھا۔
''کیوں؟''
اس کے پاس کرنے کو کچھ نہ تھا۔ تجسس، ٹوہ اور پھر منظر کو اپنے مطلب کے معنی پہنانا۔ شاپر میں بہت خوب صورت برانڈڈ سوٹ تھا، ساتھ میں میچنگ چوڑیاں.....
''یہ کس کے لیے؟'' وہ ٹھٹک گئی۔
مراد نہا کر نکل رہا تھا۔ اقصیٰ کچن میں گھس کر سودا سنبھالنے لگی۔
''کیا پتا میرے لیے ہو، کوئی سرپرائز دینا چاہتے ہوں۔''
خوش فہمیوں کی ننھی منی پنیری لگاتے اس نے کام ختم کیا۔
مگر وہ اس کے لیے نہیں تھا۔ شاپر غائب تھا۔ وہ منتظر ہی رہی۔

وہ نرمین کے پاس ہونے کا تحفہ تھا۔ جو اس کے موبائل کے ساتھ رکھ دیا گیا تھا۔

☆☆☆

صبح تازہ نکلے مکھن کی طرح تازہ، شفاف اور سفید تھی۔

نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرنے تک ثمینہ نے بہت دیر انتظار کیا۔ چائے کے کپ کے ساتھ دو ابلے انڈے جو انور حسین کے لیے آیا کرتے تھے کہ اسے دوا کھانی ہوتی تھی، آج غائب تھے۔

بچیاں بھوکی تھیں مگر پارے کا سبق یاد کر رہی تھیں۔

انور حسین لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا ورد کر رہا تھا۔

اسے ذہنی اور جسمانی طاقت چاہیے تھی جو ابلے ہوئے انڈوں اور چائے کے کپ میں نہیں تھی۔ یہ طاقت اسے صرف رب پر یقین ہی دلا سکتا تھا۔

نرمین کہیں نہیں تھی۔

اور باہر نکلنے میں آج جھجک مانع تھی۔ ثمینہ نے خواہ مخواہ اٹھ کر سوئے ہوئے طلحہ اور حذیفہ پر کمبل ٹھیک کیا اور باہر نکل آئی۔ کھلے صحن کے آخر میں بنے کمرے میں چھوٹے بڑے پتیلے، پتیلیوں اور جھوٹے برتنوں کا ڈھیر تھا۔

نرمین خاموشی سے انہیں دھو رہی تھی۔

اس نے اپنی حیثیت کا تعین کر لیا تھا، جب یہاں رہنا تھا تو کھانا پینا حلال تو کرنا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

ثمینہ نظریں چرا کر بھائی کے کمرے میں آ گئی۔

سائرہ کمبل میں کسی گویا وائبریشن پر لگی تھیں۔ رات بھر کی بحث کے بعد کپکپی کا بخار ہو گیا تھا۔ وہ سچ میں پریشان تھیں۔ ایک طرف بیٹے بہوئیں دوسری طرف شوہر۔ انہیں نند سے کوئی پرخاش نہ تھی، مگر اس طرح یہاں رکھنا گویا اپنے گھر کا سکون برباد کرنے مترادف تھا۔

"صبح سے کسی نے کمرے میں جھانکا تک نہیں، بندہ چائے کا کپ ہی بنا کر دے دے۔"

وہ اپنی بہوؤں کو کوس رہی تھیں جن کے کمروں کے دروازے ابھی تک بند تھے۔

شرمندہ ثمینہ ہو گئی۔

"بھابھی! میں ابھی لاتی ہوں۔"

"اللہ تمہارا بھلا کرے، بچوں کو بھی ناشتہ کروا دو۔"

ثمینہ کچن میں آ گئی۔ چائے کی دیگچی چڑھائی۔ سائرہ کے لیے انڈے ابالے۔ بچوں کو اور انور حسین کو رات کے بچے چاول گرم کر کے چائے کے ساتھ دے دیے۔

ناشتے کے بعد ماں بیٹی نے اسی خاموشی سے گھر سمیٹنا اور صفائی شروع کر دی۔

نہ جانے حالات انسان کی حیثیت کا تعین کرتے ہیں یا انسان خود.....

نرمین نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ وہ حالات سے لڑ سکتی تھی۔ ماں باپ سے نہیں۔

☆☆☆

سفید لشکارے مارتی ویگن دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ آس پڑوس کی عورتیں جھانک جھانک کر دیکھ رہی تھیں۔ مراد نے اسے لے کر پہلی سیٹ پر بٹھا دیا۔

"بہت بہت مبارک ہو بھائی! دیکھا میں کتنی خوش قسمت ثابت ہوئی ہوں۔"

pklibrary.com

"یہ تو ہے۔ آج میرا دیرینہ خواب پورا ہوا ہے۔"
خوشی سے نہال مراد نے خواہ مخواہ ہارن بجایا۔
"سارے پیسے دے دیے۔"
"نہیں، کچھ قسطوں میں دوں گا۔"
"رکشہ بیچ دو۔" اقصیٰ نے مشورہ دیا۔
"نہیں۔" مراد نے تیزی سے انکار کیا۔
"اب اسے رکھ کر کیا کرو گے؟" اقصیٰ نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"میرے پاس کسی کی امانت ہے۔" وہ مبہم سا مسکرایا۔
"کس کی؟"
"دور گئے مسافر کی۔ لیکن مجھے یقین ہے، میری دعائیں اسے واپس لے آئیں گی۔"
اقصیٰ الجھ کر دیکھنے لگی۔
"اب باتیں ہی کرتی رہو گی، چلو اماں، ابا کی قبر سے ہو کر آتے ہیں۔"
"میں نہیں جا رہی۔" اقصیٰ نے رکھائی سے انکار کر دیا۔
"تمہیں وہ یاد نہیں آتے؟"
"انہیں یاد کرنے کے لیے قبر پر جانا ضروری تھوڑی ہے۔"
"میں تو جاؤں گا۔ تمہیں ایک چکر دلوا کے گھر چھوڑ دیتا ہوں، یا پھر افشاں کی طرف چلی جاؤ۔"
"نہیں، گھر ہی ٹھیک ہے۔"
"جیسے تمہاری مرضی۔ مجھے لگتا ہے تمہاری افشاں سے دوستی نہیں ہو سکی۔"
مراد نے بسم اللہ پڑھ کر ویگن اسٹارٹ کی۔
"مجھے سہیلیاں بنانی نہیں آتیں اور نہ میری کوئی سہیلی تھی۔"
"کالج جا کر ضرور بنانا ورنہ مشکل ہو گی۔"
وہ دانستہ اس گلی کا موڑ مڑا تھا۔
عادتاً ہارن پر ہاتھ رکھا تھا مگر پاؤں بریک پر چلا گیا۔
خاموش ویران گھر کا دروازہ کھلا تھا اور وہاں کچھ لوگ کھڑے تھے۔
"کیا ہوا بھائی؟"
"میں ابھی آتا ہوں۔" وہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلا۔
"اف..... افشاں کو دیکھے بغیر تو بھائی کا بھی کوئی کام نہیں ہوتا۔"
اقصیٰ غصے سے بڑبڑائی۔
گھر میں افشاں کے والد کسی کے ساتھ کھڑے تھے۔
"چاچا! یہ کیا ہو رہا ہے؟"
"مکان بیچنا ہے انور حسین نے..... تو پراپرٹی ڈیلر دیکھنے آیا ہے....."
مراد کا دل سینے میں دھڑکنا بھول گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ثانیہ مرتضیٰ

نشانے باز

''دس ہزار سے ایک روپیہ بھی کم نہیں۔'' ارسہ نے اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے کوئی دسویں بار یہ جملہ دہرایا تھا۔

''دس ہزار..... دس سال کی تو تم ہو نہیں اور دس ہزار مانگ رہی ہو۔ چلو ایسا کرتے ہیں تمہاری عمر کے حساب سے ہر سال کے سو روپے دے دیں گے۔ یہ پورے نو سو ہو جائیں گے۔ اب ٹھیک ہے نا۔'' اپنی طرف سے تو دولہا کے کزن نے بڑی دانش مندانہ بات کی تھی مگر سامنے بھی ارسہ تھی۔

''آپ کو کیا مسئلہ ہے۔ آپ سے تھوڑی لے

pklibrary.com

رہی ہوں میں۔ میں تو اپنے اکلوتے بہنوئی سے لے رہی ہوں۔ آخر کار اکلوتی سالی ہوں، اتنا تو حق بنتا ہے نا۔'' ارسہ تو طے کر کے آئی تھی کہ آج تو وہ اپنا پرس گرم کر کے ہی اٹھے گی۔

''توبہ توبہ..... دس ہزار میں تو ہم پورا مہینہ ''رج'' کے دودھ پی لیں، ہمیں یہ ڈیل منظور نہیں۔'' ایک اور کزن نے ''حق کزن'' ادا کیا تھا۔

''ڈیل تو آپ کو منظور کرنی پڑے گی۔ ورنہ.....''

''اچھا..... اچھا چھوڑو یہ لو دس ہزار اور جان چھوڑو۔'' اسفند نے بٹوے میں سے ہزار ہزار کے دس نوٹ نکال کر ارسہ کے ہاتھ پر رکھے کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ چڑیل اتنی آسانی سے ٹلنے والی نہیں ہے۔

''اسفند بھائی! زندہ باد۔'' ارسہ نے دودھ کا گلاس اسفند کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے نعرہ لگایا۔

بمشکل دو ہی گھونٹ اسفند کے حلق سے اترے تھے اور اس کے اندر ہمت نہ تھی کہ وہ پورا گلاس ختم کرتا۔ گلاس ٹیبل پر رکھتے ہی اس نے پیچھے مڑ کر اس لڑکی کو دیکھا تھا جس کے چہرے پر اس وقت مسکراہٹ بلکہ ظالم مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

☆☆☆

''چلو چلو، جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے۔ رخصتی کرو، اب مغرب ہونے والی ہے۔'' ماموں نے عصر سے ہی مغرب ہونے کا رولا ڈالا ہوا تھا۔ بارات نے تین چار گھنٹوں کا راستہ طے کرنا تھا لہٰذا ان کی کوشش تھی کہ جلد از جلد رخصتی ہو جائے۔

اور رخصتی کے وقت دلہن والوں نے تو ایسا رونا مچایا کہ اگر وہ لوگ کراچی میں ہوتے تو ایک آدھ ''اربن فلڈ'' آ ہی جاتا۔

بالآخر چار گھنٹوں کے طویل سفر کے بعد دلہن کی گاڑی ایک بڑی سی حویلی میں آ کر رکی تھی۔ پورا علاقہ پٹاخوں کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔ آخر کو شیخ عبداللہ کے اکلوتے پوتے کی شادی تھی۔ دلہن کو کمرے میں آرام سے بٹھا دیا گیا۔ اسفند کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی لیکن جیسے ہی اس کی نظر اپنی چڑیل جیسی بہن ندا پر پڑی تو اس کی مسکراہٹ مدھم پڑ جاتی۔

''ہٹو آگے سے..... ابا جی آ رہے ہیں۔ سب سے پہلے منہ دکھائی کی رسم ابا جی ہی کریں گے۔'' اسفند کے ابا جی نے اپنے ابا جی کے آنے کی خبر سنائی تو کمرے میں موجود باقی سارے نفوس چپ ہو گئے۔

''ماشاءاللہ..... ماشاءاللہ، اللہ خوش رکھے، ہمیشہ آباد رہو۔'' دادا ابا نے دلہن کے ہاتھ پر منہ دکھائی رکھتے ہوئے دعا دی۔

''چلو اب تم سارے لوگ بھی جلدی سے رسمیں نپٹاؤ۔ ہماری بیٹی تھک گئی ہوگی، اسے آرام کرنے دو پھر۔'' دادا ابا بارعب آواز میں کہتے ہوئے کمرے سے چل دیئے۔ جاتے جاتے انہوں نے اسفند پر بھی ایک گھوری ڈالی تھی۔ ان کے پیچھے پیچھے ندا بھی کمرے سے نکل گئی۔

''دادا ابا۔'' ندا نے باہر نکلتے ہی ان سے سرگوشی کی۔

''صبح بات کریں گے بیٹا! ابھی بہت دیر ہو گئی ہے۔ تم بھی آرام کرو۔'' دادا ابا اپنے کمرے میں چلے گئے تھے جبکہ ندا کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

آخر کار صبح آ ہی گئی تھی۔ سب ناشتے کی میز پر موجود تھے۔

''اسفند! ناشتہ کر کے میرے کمرے میں آنا، تم سے کام ہے۔'' دادا ابا نے ناشتہ کرتے ہی اسفند کو حکم دیا، جسے سنتے ہی چائے پیتے اسفند کو زور کا اچھو لگا تھا۔

''کیا ہو گیا بیٹا! آرام سے ناشتہ کرو۔ کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا۔'' امی نے پانی کا گلاس اسفند کو پکڑایا۔

pklibrary.com

"جی، دادا ابا! میں آتا ہوں۔" پانی کا گھونٹ بھر کر اسفند نے دادا ابا کو جواب دیا اور پھر جلدی جلدی ناشتہ کر کے ان کے کمرے میں پہنچا۔ ندا وہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔

"آیئے..... آیئے بھائی! میں اور دادا ابا کب سے آپ کا انتظار کر رہے تھے، اتنی دیر لگا دی آپ نے۔"

"کتنی سنگ دل ہے یہ لڑکی۔ کاش میں نے اس کی بات مان لی ہوتی تو آج مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔" اسفند کو ہفتہ پہلے کی وہ شام یاد آ گئی جب.....

"بھائی! یہ سینڈل کتنی پیاری ہے نا۔ یہ میں لے لوں۔" شادی کی شاپنگ کا آخری چکر تھا۔ ندا کی ساری شاپنگ مکمل تو ہو چکی تھی مگر اب دکان پر اپنی پسند کی سینڈل دیکھ کر اس کا دل مچل گیا تھا۔ ندا کی آواز امی کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے کچھ بھی اور لینے کی۔ پہلے ہی بہت کچھ لے چکی ہو تم۔ خبردار اسفند! اسے کچھ بھی اور لے کر دیا۔ غضب خدا کا، الماری بھری پڑی ہے کپڑوں، جوتوں سے اور اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ اندازہ بھی ہے کہ پہلے ہی کتنا خرچا ہو چکا ہے۔" امی نے مارکیٹ میں ہی اسے لتاڑ دیا تھا۔

"بھائی پلیز، یہ سینڈل میرے مہندی کے کپڑوں سے میچ ہو رہی ہے۔ لے دیں۔" وہ بھی ایک نمبر کی ڈھیٹ تھی۔

"ویسے بھی تین ہزار کی تو ہے۔" ندا نے تین ہزار ایسے بولا جیسے تین سو کی ہو۔

"کیا، تین ہزار..... میرے پاس اتنے فالتو پیسے نہیں ہیں۔" اسفند نے بھی تین ہزار کا سن کر ہری جھنڈی دکھائی تھی۔

"دیکھ لیں بھائی! کبھی مجھ سے بھی کام پڑ سکتا ہے۔ ویسے بھی آپ کی شادی نزدیک ہے اور دادا ابا نے مجھے ٹاسک سونپا ہوا ہے۔ یاد ہے نا وہ۔ پھر مجھ سے گلا نہ کرنا۔" ندا نے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔

"چلو، تب کی تب دیکھ لیں گے۔" اسفند نے اس وقت تو بات مذاق میں اڑا دی تھی مگر اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ بہنوں سے کبھی بھی پنگا نہیں لینا چاہیے۔ خاص طور پر ندا جیسی بہنوں سے۔

☆☆☆

"کن سوچوں میں پڑ گئے برخوردار۔" اس کی سوچ کی لہروں کو دادا ابا کی آواز نے توڑا تھا۔

"کچھ نہیں دادا ابا..... ایسے ہی۔" اسفند کھسیانی سی ہنسی ہنسا۔

"ہاں ندا بیٹا! اب بتاؤ، کل کیا کچھ ہوا۔" دادا ابا ندا کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کیا بتاؤں آپ کو دادا ابا..... آپ نے کتنا سمجھا کے بھیجا تھا بھائی کو مگر تین چار کلو تو دور کی بات یہ تو تین چار گھونٹ بھی نہ پی سکے۔ ان لوگوں کی کیا دوڑیں لگی تھی دودھ کے لیے یہ تو پورا گلاس بھی نہ ختم کر پائے..... چچ چچ۔" ندا نے افسوس کا اظہار کیا۔

"اور تو اور تین گھونٹ دودھ کے پیسے اور پورے دس ہزار اپنی سالی کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ یہ کوئی بات ہوئی بھلا۔" ندا نے خوب مرچ مسالا لگا کر بات سنائی تھی۔ دادا ابا کا تو صدمے اور افسوس کے مارے برا حال تھا۔

"میری بات بھی سن لیں دادا ابا..... میں تو اپنی پوری تیاری سے گیا تھا۔ صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا کہ آپ کا حکم تھا کہ وہاں میں نے تین سے چار کلو دودھ پینا ہے۔ مگر آپ کو تو پتا ہے کہ مجھے الائچی نہیں پسند انہوں نے دودھ میں الائچیاں ڈالی ہوئی تھیں۔ دو گھونٹ پیتے ہی مجھے ابکائیاں آنے لگیں۔ میں مزید ان سے کوئی فرمائش نہیں کر سکا۔" اسفند نے معصوم اور مظلوم شکل بنا کر اپنی صفائی پیش کی۔

"بس مجھے کچھ نہیں سننا۔ تم نے تو میری ناک کٹوا دی۔ ارے پیسوں کو تو چھوڑو، دس کے بجائے بیس دے دیتے مگر میں نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ اگر

pklibrary.com

وہ رسم کرتے وقت کوئی شرط رکھتے ہیں تو تم نے بھی برابر کی شرط رکھنی ہے۔ ان سے کہتے کہ میں نے چار کلو دودھ پینا ہے تو ان کی بھی دوڑیں لگتی۔ وہ تو ایک ہی گلاس لے کر آئے ہوں گے۔ آخر کو انہیں بھی پتا چلتا کہ شیخ عبداللہ کا پوتا ان کا داماد بنا ہے۔'' دادا ابا کو اپنے ارادے پورے نہ ہونے کا بے حد افسوس تھا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نے ایسے ہی تم سے کہہ دیا تھا یہ شرط رکھنے کو۔ ہم کوئی اتنے گئے گزرے نہیں ہیں کہ تمہارے لیے دودھ نہ لا سکیں۔ مگر شادی میں اگر دلہن والوں کی طرف سے شرطیں رکھی جاتی ہیں تو دولہا والوں کو بھی حق ہے کہ وہ اپنی شرط منوائیں۔ میں کہتا ہوں حق ہے کہ نہیں۔'' اسفند کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر دادا ابا غصے سے بولے۔

''ح..... جی دادا ابا بالکل حق ہے۔'' اسفند تو بھیگی بلی بنا ہوا تھا اور ندا۔ اس کے تو دانت ہی اندر نہیں ہو رہے تھے اب جا کر کہیں اسے اپنی سینڈل کا دکھ بھولا تھا۔

''حق..... ہاہ، وہ بھی کیا دن ہوتے تھے، ہمارے وقتوں میں جب شادیاں ہوتی تھیں۔ کیا رسم و رواج ہوتے تھے۔ آج کل تو تم لوگوں نے اپنی الگ ہی رسمیں نکالی ہوئی ہیں۔ ایک ہمارا وقت تھا۔''

لو جی اب دادا ابا نے کوئی ایک سے سولہویں بار (بلا مبالغہ) اپنے بھائی کی شادی کا قصہ سنانا تھا۔ اسفند دل ہی دل میں بولتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا کیونکہ اب کم از کم ایک گھنٹے تک چھٹی ناممکن تھی۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے بڑے بھائی کی شادی تھی۔ یہی کوئی ستر، پچھتر سال پہلے کی بات ہے، میں بھی اس وقت دس بارہ سال کا بچہ تھا۔ ہم سارے گاؤں والے بڑی خوشی خوشی بارات لے کر صبح سویرے نکل پڑے۔ بارات دوسرے گاؤں میں جانی تھی۔ تقریباً پورا گاؤں ہی بارات کے ہمراہ تھا۔ گاؤں کیا یہی ساٹھ ستر لوگ ہوں گے۔ اس زمانے میں اتنی آبادی جو نہ ہوتی تھی۔''

''اف اللہ..... دادا بھی نا، حرف بہ حرف کہانی سناتے ہیں۔ تھوڑی مختصر کر کے سنائیں۔ ویسے بھی ایک سو پندرہ بار پہلے بھی سن ہی چکا ہوں۔'' اسفند نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ بے چارہ اسفند چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد بات ختم ہو اور وہ جائے، آخر کو اس کی شادی شدہ زندگی کا پہلا دن تھا۔

''خیر ہم لوگ جب گاؤں میں داخل ہوئے تو سامنے میری بھابھی کے دو بھائی کھڑے تھے۔ ان کے گاؤں کی رسم تھی کہ بارات لے جانے سے پہلے لڑکے والوں کو لڑکی والوں کی شرط ماننی پڑتی تھی چاہے وہ کتنی ہی مشکل کیوں نہ ہو۔

اب میری بھابھی کے بھائیوں نے کہا کہ یہ سامنے جو سب سے اونچا اخروٹ کا درخت ہے اس پر ہم نے ایک سکہ باندھا ہوا ہے، اس کو فائر کر کے گرا دو۔ تب ہی یہاں سے آگے آنا۔ سکہ بہت چھوٹا تھا نشانی کے طور پر انہوں نے سرخ رنگ کا کپڑا اس کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ پھر کیا تھا ایک ایک کر کے سب نے نشانے لگانے شروع کیے لیکن ایک تو سکہ بہت چھوٹا تھا، اوپر سے درخت بھی بہت اونچا۔ بہت سے لوگوں نے کوشش کی مگر نشانہ چوک جاتا۔'' تھوڑی دیر کے لیے دادا ابا نے پانی پینے کا وقفہ کیا اور پھر کہانی وہیں سے شروع کی۔

''ہاں..... تو سب لوگوں نے اپنی اپنی کوششیں کی مگر بے سود۔ صبح سے شام ہونے کو آ گئی۔ بارات کے ساتھ آئی عورتیں اور بچے ہم نے واپس گھروں کو بھیج دیے تھے۔''

''تو کیا دادا ابا! دلہن کے بھائی بھی وہیں آپ کے ساتھ موجود تھے۔'' اگرچہ اسفند کو معلوم تھا کہ وہ وہاں نہیں تھے لیکن کہیں دادا ابا کو محسوس نہ ہو کہ ان دونوں کو اس قصے سے دلچسپی نہیں اس لیے سوال پوچھ لیا۔

''نہیں بیٹا! وہ تو اسی وقت واپس چلے گئے تھے۔ تو اب شام سے رات ہو گئی۔ کھانے کو ہمارے

pklibrary.com

پاس کچھ نہیں تھا۔ قریبی نہر سے پانی پی کر گزارا کیا اور رات وہیں بسر کی۔ صبح ہوئی تو پھر سے سب نے زور آزمائی شروع کی۔"

"تو دادا! آپ لوگ درخت پر چڑھ کر سکہ اتار دیتے۔ انہیں کون سا کوئی پتا چل جانا تھا۔" اسفند نے پھر لب کشائی کی۔

"نا بیٹا۔ یہ بے غیرتیاں تم لوگوں کی ینگ جنریشن میں پائی جاتی ہیں۔ ہمارے وقتوں میں وعدے کی پاس داری بہت اہم تھی۔ اپنی جان سے زیادہ لوگوں کو اپنی زبان اور وعدے کا پاس ہوتا تھا۔"

"اچھا تو کہانی بیچ ہی میں رہ گئی۔ دوسری شام بھی آ گئی۔ اب تو ہماری انتڑیوں نے بھی جواب دینا شروع کر دیا۔ پھر میرے بھائی جن کی شادی تھی انہوں نے رائفل اٹھائی اور کہا کہ اب اس وقت تک یہاں سے نہ ہلوں گا جب تک سکہ گرا نہ دوں۔ اللہ اللہ کر کے ان کا نشانہ لگا اور ہم سب نے سکھ کا سانس لیا۔ باراتی بارات لے کر آگے چلے۔"

"دادا ابا! آپ لوگوں کو غصہ تو بہت آیا ہوگا، ان پر جو انہوں نے ایسی عجیب و غریب شرط رکھی۔" اب کی بار ندا بولی۔

"نہیں بیٹا! غصہ کیسا۔ یہ رسمیں اور رواج شادی بیاہ کی رونق بڑھاتے ہیں اور پھر سالوں یاد رہتے ہیں۔ اللہ مغفرت فرمائے بھائی بھابھی کی، دنیا سے چلے گئے ہیں لیکن ان کی شادی کا قصہ اب تک ہمیں یاد ہے۔" بھائی کو یاد کر کے دادا ابا غمگین ہو گئے۔

"اچھا دادا! آگے تو بتائیں پھر آپ لوگوں نے کیا کیا دلہن والوں کے ساتھ۔" دادا کو چپ دیکھا تو اسفند بول اٹھا۔

"ہاں...... وہاں پہنچ کر ہم نے ان سے کہا کہ ہم دنوں کے بھوکے ہیں، ہمارے لیے سات موٹے تازے بکرے ذبح کر کے پکائے جائیں جو کہ صرف ہم کھائیں گے۔ پھر ہم چالیس پچاس بندوں نے وہ سارے بکرے ہڑپ کیے۔ عورتیں اور بچے تو ساتھ تھے نہیں صرف مرد حضرات اور کچھ نوجوان تھے۔"

"چلو اب تم دونوں جاؤ میں اخبار پڑھنے لگا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ اسفند اپنی جان چھوٹنے پر وہاں سے فرار ہوتا ندا بول پڑی۔

"پردادا ابا...... بھائی کی سزا تو رہ ہی گئی۔"

"دل تو چاہ رہا ہے ابھی کے ابھی تمہاری گردن دبوچ لوں پر۔" اسفند نے دل میں سوچتے ہوئے ندا پر صرف گھوری ہی ڈالی۔

"اوہ اچھا یاد دلایا بیٹا! وہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ اسفند تمہاری سزا یہ ہے کہ تم نے روزانہ تین دن تک تین تین کلو دودھ پینا ہے اور اب کی بار کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔ اور ندا تم نے اس کی نگرانی کرنی ہے اور رپورٹ مجھے دینی ہے۔"

"جی جی دادا ابا کیوں نہیں۔" "اب پتا چلے گا بچو ایک گلاس دودھ کا تو پیا نہیں جاتا روزانہ تین کلو دودھ پلا کر الٹیاں نہ کروائیں تو دیکھنا۔" ندا دل ہی دل میں مسکرائی۔

اس کے بعد کیا ہوا...... دادا ابا کو تو یہ رپورٹ مل گئی تھی کہ اسفند نے سزا پوری کر لی ہے البتہ اسفند نے چھپڑ میں ندا کے ساتھ معاملات طے کر لیے تھے۔ ویسے بھی تین کلو دودھ نہ پینے کے بدلے تین ہزار کی سینڈل دلانے کا سودا برا نہیں تھا۔

بقول دادا ابا کے وہ آج کل کی نوجوان نسل میں سے تھا اس کے نزدیک ضروری تو نہیں تھا کہ ہر وعدہ پورا کیا جاتا۔

pklibrary.com

فلک حسن

سیاہ بخت

رات کے تقریباً گیارہ بجے میرے فون کی گھنٹی بجی تھی۔

یہ گرمیوں کی رات تھی اور میں انگلش کی کتاب تھامے کورس کو ایک رات میں مکمل کرنے کے مشن پہ تھا۔ کمرے میں ہر طرف نوٹس بکھرے ہوئے تھے میں نے ہمیشہ سے امتحانات کو کبھی سیریس نہیں لیا۔ بس آخر کے دنوں میں کچھ پڑھا اور پاس کرلیا۔

''ہیلو!'' میں نے کال اٹینڈ کی تھی۔

ایک پیغام دینے کے بعد کال کاٹ دی گئی تھی۔

خبر افسوس ناک تھی مگر میرے لیے نہیں۔ مجھے تو امتحان کا خوف کھائے جا رہا تھا اور مجھے پہلی بار لگا تھا کہ امتحان کی تیاری پہلے سے شروع کر دینی چاہیے تھی۔

نانی اماں اب دنیا میں نہیں رہی تھیں اور مجھے حکم ملا تھا کہ یہ پیغام ماموں کے گھر بھی پہنچانا ہے۔ ماموں کا گھر ہمارے گھر کے ساتھ ہی تھا۔ جاتے ہوئے دس منٹ ہی لگتے تھے۔ میں ماموں کے گھر کی طرف چل پڑا۔

مجھے نانو کے فوت ہونے کا دکھ تو تھا مگر اتنا نہیں کیونکہ پچھلے دس دنوں سے وہ ہسپتال میں داخل تھیں اور فالج نے ان کے پورے جسم کو ناکارہ کر دیا تھا۔ بس کسی طرح سانس جسم میں اٹکی ہوئی تھی۔

''کیا..... دادی اب نہیں رہیں؟'' نیلو نے افسردہ ہو کر کہا تھا جیسے ابھی رو دے گی۔

مجھے یہ رویہ غیر معمولی لگا تھا جیسے وہ اداکاری کر رہی ہو یا شاید اسے واقعی دکھ تھا۔

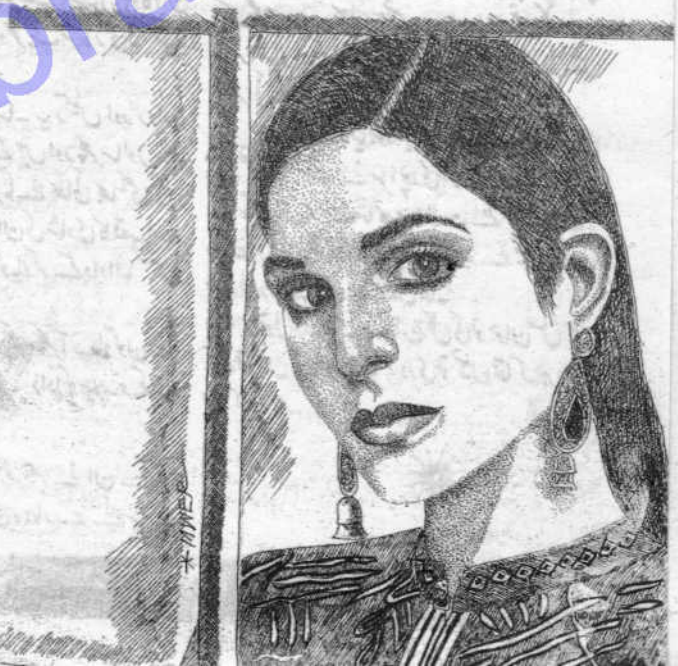

pklibrary.com

pklibrary.com

دورہ پڑنے سے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اس وقت نیلو ایک سال کی تھی۔

اور اب وہ اپنے چاچو کے پاس دادی کے ساتھ رہ رہی تھی۔

''ہاں نانو کی حالت کا تو آپ کو پتا ہی تھا بس اللہ مغفرت فرمائے۔'' میں اطلاع دینے کے بعد واپس آ گیا تھا۔

☆☆☆

میں احمر اور میرے بڑے بھائی ارشد کے علاوہ میری تین بہنیں رخسانہ، فرزانہ اور ریحانہ ہیں۔ ہمارے گاؤں میں ہم قافیہ نام رکھنے کا کافی پرانا رواج ہے شاید دوسری جگہوں پر بھی ایسا ہوتا ہو۔

میری امی شہناز کے بقول میرا نام بھی بڑے بھائی کے نام سے ملتا جلتا رکھا ہے۔ ہم قافیہ تو نہیں ہے خیر اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ کہیں نام ملانے کی چکر میں کوئی الٹا سیدھا نام نہیں رکھا۔

ریحانہ سب سے چھوٹی ہے جو پانچویں کلاس میں پڑھتی ہے۔ رخسانہ اور فرزانہ نے آٹھویں کے بعد اسکول چھوڑ دیا تھا یا چھڑوا دیا تھا، ویسے بھی ابو کے بقول بیٹیوں نے کون سی نوکری کرنی ہے بس گھر ہی میں تو رہنا ہے اتنا پڑھ کے کیا کرنا ہے۔

ارشد بھائی نے بمشکل پانچ جماعتیں ہی پڑھی تھیں یہ ابو اور ماموں کی مار بھی انہیں اسکول میں نہیں ٹکا سکی تھی۔ میں پڑھائی میں کافی اچھا تھا۔ بچپن میں میری اسکول میں پوزیشن بھی آتی تھی یہ اور بات کہ ہماری کلاس میں بمشکل آٹھ دس لڑکے تھے مگر پھر بھی یہ ایک معرکہ تھا جو میں سر کرتا تھا۔

☆☆☆

پینٹ شرٹ میں ملبوس سگریٹ کے کش لگاتی وہ لڑکی تمام نظروں کا محور تھی۔ اس کی وجہ صرف اس کا سگریٹ پینا نہیں تھا، موٹی بھوری آنکھیں، پونی میں قید بالوں سے آزاد لٹ بائیں رخسار پر براجمان تھی۔ وہ ایک پرکشش لڑکی تھی جس پر اگر ایک بار نظر پڑے تو

میں پچھلے کچھ دنوں سے اسے پارک میں دیکھ رہا تھا اپنے بڑھتے وزن کے پیش نظر میں نے کچھ دن پہلے ہی ورزش شروع کی تھی اور تب سے میں اسے دیکھ رہا تھا۔ جاگنگ ٹریک پر وہ دو راؤنڈ مکمل کرنے کے بعد لوہے کے بنے بینچ پر بیٹھ کر ایک سگریٹ پیتی تھی۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا تھا اور بغیر کچھ بولے گردن سے ہاں کا اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ خیالات میں گم ہو گئی تھی۔ اس کے رویے میں رکھائی تھی۔ ہاں بالکل ہونا بھی چاہیے آپ کسی اجنبی سے تپاک سے ملنے کی امید تو نہیں کر سکتے مگر پھر بھی مجھے اس کا رویہ کچھ زیادہ ہی چبھا تھا۔

''کیا میں آپ سے کچھ بات کر سکتا ہوں۔'' میں نے ہمت کر کے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس نے پلٹ کر مجھے اوپر سے نیچے تک بغور دیکھا تھا اور پھر کچھ سوچنے کے بعد بولی تھی۔

''ہاں کہیے!''

میں نے چہرے پر ظاہر ہوتی پریشانی کے آثار کو چھپانے کے لیے جھوٹی مسکراہٹ کا سہارا لیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے بات شروع کروں؟

''آپ سگریٹ کیوں پیتی ہیں۔''

مجھے جب کچھ نہ سوجھا تو میں نے یہ سوال داغا تھا۔

وہ میری پریشانی کو بھانپ گئی تھی۔ اس نے چہرے پہ آئی لٹ کو کان کے پیچھے ٹھکانے لگایا تھا۔

''بس ویسے ہی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ یہاں ورزش کے لیے آتی ہیں؟ میں روزانہ آپ کو دیکھتا ہوں۔'' میری واقعی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کہنا ہے اور میں کیا کہہ رہا ہوں۔

رعب کا شکار ہو چکا تھا۔

میں پچھلے ہفتے سے اس سے بات کرنے کی کوششوں میں تھا اور آج جب بات کرنے میں کامیابی ہوئی تو گویا تمام باتیں ختم ہو گئی ہوں۔ ہوتا ہے نا کبھی کبھار ایسا کہ تمام خیالات اچانک آپ کے دماغ سے اڑ جاتے ہیں اور الفاظ گلے میں اٹک جاتے ہیں، بستر مرگ پر پڑے کسی شخص کی سانسوں کی طرح۔

''ہاں میں واک کرنے آتی ہوں۔'' مختصر جواب۔

''اچھا.....!'' میں اٹھ کھڑا ہوا تھا میرے پاس لفظوں کا ذخیرہ جیسے ختم ہو چکا تھا۔

☆☆☆

دادی کے جانے کے بعد میری زندگی مزید بدتر ہو چکی تھی جو تھوڑا بہت دادو کا آسرا تھا، وہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ زندگی بھی کتنی عجیب ہے یہ ان لوگوں سے بھی امتحان لیتی ہے جو امتحان کے معنی تک نہیں جانتے۔ یہی کچھ میرے ساتھ ہو رہا تھا، خدا جانے یہ امتحان تھا یا کچھ اور.....

ہمیشہ سے محرومیوں کا شکار لڑکی اب ایک نئے عذاب سے دوچار تھی۔

جانے یہ آزمائشیں یا قسمت کے چکر جو بھی ہیں کب ختم ہوں گے۔ میں چارپائی پر لیٹے بخار سے کراہتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ کیا میرے حالات بدلیں گے؟ یا باقی کی تمام عمر بھی یونہی.....؟

میں ایک سال کی تھی جب میرے ابو اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے مجھ سے بڑا میرا بھائی عرفان اڑھائی سال کا تھا۔ جس کو سب افی کہہ کر پکارتے تھے۔

میرا اصل نام انیلا تھا جو بگڑ کر نیلو ہو گیا تھا۔

جوان مرد کے مرنے پر پورا کنبہ غم سے نڈھال تھا مگر یہ تو ابھی شروعات تھیں۔ مصیبتوں نے جیسے اس گھر کو تاڑ لیا تھا۔

فوتگی پر جاتیں تو اپنے آفتاب کو روتیں۔ اب دادو کے پاس اپنے بیٹے کی دو نشانیاں تھیں۔ میں اور افی۔

میرے دو چاچو تھے ایک ذوالفقار جو ابو سے بڑے تھے اور دوسرے مختیار جو ابو سے چھوٹے تھے۔ ابو کی وفات کے ایک سال بعد دادو نے چاچو مختیار کا طے شدہ رشتہ ختم کر دیا۔ دادو چاہتی تھیں کہ میری امی کی شادی مختیار سے ہو جائے تاکہ ہمیں بھی سہارا مل جائے اور امی کو بھی مگر شاید قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔

امی نے اس شادی سے صاف انکار کر دیا۔

''میں نے مختیار کو ہمیشہ اپنا بھائی سمجھا ہے میرے لیے یہ ممکن نہیں۔''

امی کو بہت سمجھایا گیا مگر امی بضد رہیں زیادہ دباؤ ڈالنے پر امی اپنے بھائی کے گھر چلی گئیں۔

ایک ماہ بعد دادو امی کو دوبارہ واپس لے آئیں مگر پھر وہ ہوا جس کا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔

کچھ دنوں بعد امی نے چاچو مختیار پر الزام لگا دیا کہ اس نے میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی ہے۔ بات آگے بڑھی اور پھر عدالت تک چلی گئی۔

چاچو کو پانچ سال کی قید اور جرمانہ ہوا اور امی ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔

تب سے ہمیں دادو نے بہت ناز اور پیار سے پالا تھا۔ دادو نے پوری کوشش کی کہ ہمیں کبھی ماں باپ کی کمی نہ ہو اور دادو ایک حد تک اس میں کامیاب بھی رہیں مگر پھر بھی ایک خلا رہا ایسی محبت کا خلا جو ماں باپ کے وجود سے ہی ممکن ہے۔

ہم نے سولہ سال دادو کے ساتھ گزارے اور پھر ایک سال پہلے دادو کے مکان کی چھت گرنے کے بعد ہم چاچو مختیار کے گھر شفٹ ہو گئے جو ساتھ والی گلی میں تھا ان کا اپنا ایک کمرہ تھا اور ایک سردیوں میں آگ جلانے کے لیے کچا کوٹھا تھا جس میں دو چارپائی مشکل سے سماتی تھیں۔

ہم اس کچے کوٹھے میں شفٹ ہو گئے۔

چاچی بلقیس ہمارے یہاں آنے سے بالکل

معلوم ہوتا تھا، وہ بات بات پر دو چار باتیں ہمیں سنا دیتی تھیں۔ ان ہی باتوں سے بچنے کے لیے میں نے سارا کام کرنا شروع کردیا۔ صبح جلدی اٹھ کر نماز پڑھنا، جھاڑو لگانا، برتن دھونا، کھانا پکانا اب میں نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔

اس سے فائدہ یہ ہوا کہ چاچی کے رویے میں بہتری آئی اور مجھے بھی کچھ سکون میسر ہوا۔ تین مہینے پہلے دادو کی طبیعت بہت زیادہ بگڑنے لگی تھی ان میں چلنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ واش روم تک بھی نہیں جاسکتی تھیں۔

دادو کے کام کرنا واش روم لے جانا سب میری ذمہ داری تھی۔ چاچو اور پھوپھو بھی کبھار آ کر خیریت پوچھ لیتے تھے۔ مجھے دادو سے محبت تھی انہوں نے ہمیں پالا پوسا، بڑا کیا اور ہمارے لیے وہ کچھ کیا جو وہ کرسکتی تھیں۔ مجھ پر دادو کی خدمت واجب تھی مگر پھر بھی اس وقت انہیں اور مجھے اپنوں کی ضرورت تھی۔ مگر ضرورت کے وقت کب اور کون کام آیا ہے۔

خیر وقت گزر گیا۔ دادو چلی گئیں اور میرا آخری سہارا بھی۔

''کام نہ کرنے کا میڈم نے نیا بہانا ڈھونڈا ہے بس بستر سے نکلو ہی نا۔'' آج جلدی نہ اٹھنے اور کام نہ کرنے پر چاچی نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ''ابھی کل تک تو ٹھیک تھیں۔ بہانے دیکھو۔''

میں چپ چاپ سنتی رہی۔ پچھلے کچھ دنوں سے میری طبیعت خراب تھی مگر کام میں لگی رہی آج جسم بستر سے نکلنے سے قاصر تھا۔ سر چکرا رہا تھا اگر اٹھ کر بیٹھتی تو چکر مزید بڑھ جاتے اور مجبوراً لیٹنا پڑتا۔

آج چاچی نے کھانا خود بنایا مگر میرے لیے کچھ نہیں بنایا کہ جب کھانا ہو خود بنالینا، ویسے بھی بخار کے ساتھ کھانا کہاں کھایا جاتا ہے۔

میں چپ چاپ یہ سب سن کر برداشت کر رہی ہوں اور آخر میں کر بھی کیا سکتی ہوں؟

☆☆☆

کئی تھی اور آج میں معمول سے ہٹ کر تیار ہوا تھا ایک نئی شرٹ نکالی تھی، بالوں کو کنگھی نہ ہونے کے اسٹائل میں کنگھی کی تھی سامنے والے بالوں کو ماتھے پر بکھیر دیا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ حلیہ اچھا لگتا ہے بکھرے بال، ہلکی سی بڑھی ہوئی داڑھی اور لائٹ کلر والی شرٹ۔ آج میں پہلے کی نسبت کچھ جلدی ہی پارک میں پہنچ چکا تھا۔

پارک ایک پرسکون جگہ تھی۔ آم اور جامن کے بے شمار درخت تھے درمیان میں ایک حصہ کھجوروں کا تھا۔ بچوں کے لیے کچھ جھولے بھی تھے۔

لوہے، لکڑی اور سیمنٹ سے بنے بینچ تھے۔ واک کے لیے چاروں طرف اور درمیان میں ٹریک بنایا گیا تھا۔ وہ لڑکی ایک عجس تھی، پہیلی تھی، کہانی تھی جسے پرکھنے، بوجھنے اور سننے کے لیے میں بے چین تھا۔

میں درختوں سے گھرے ایک بینچ پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا تھا تاکہ جب وہ جاگنگ شروع کرے تو میں بھی اس کے ساتھ شروع کروں۔

''ہیلو!'' میں نے دوڑتے ہوئے اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اسے مخاطب کیا تھا۔

''ہائے!'' جواباً اس نے خوش گوار لہجے میں کہا تھا۔ آج اس کے چہرے سے لیٹ غائب تھی میں نے اسے بغور دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا چہرے پر میک اپ کا نام ونشان نہیں تھا، چہرہ بالکل صاف تھا گورے رنگ میں گندمی پن کی جھلک تھی اور ہونٹ سیاہی مائل جیسے سرخ رنگ پر ہلکا سا کالے رنگ کا کور چڑھایا گیا ہو۔

''آج آپ کافی لیٹ ہوگئی ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں تو اس نے بائیں ہاتھ کی کلائی میں بندھی گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ ''میں تو ہمیشہ اسی وقت پر ہی آتی ہوں۔'' میں شرمندہ ہوا تھا شاید میں یہ بھول گیا تھا کہ آج میں وقت سے پہلے آیا تھا۔

اشارہ کیا تھا اور میں نے دھیمے لہجے میں دو الفاظ دہرائے تھے ثنا میر۔

☆☆☆

ہمارے درمیان گویا دوستی سی ہوگئی تھی میں نے اپنا اسٹیمنا بڑھالیا تھا اور اب ثناء کے ساتھ ٹریک کے دو چکر باآسانی لگالیتا تھا۔ چکر لگانے کے بعد ہم بینچ پر بیٹھ کر باتیں کرتے۔ ہمارے محبوب ٹاپک زندگی اور محبت تھے جن پر ڈھیروں دیر باتیں کرتے نہ تھکتے۔

ہمارے درمیان رابطے بڑھنے لگے تھے جو پارک سے نکل کر فون تک آچکے تھے مگر ایک تجسس تھا جو ویسے کا ویسے برقرار تھا۔

ہوتا ہے نا ایک دوسرے کو جاننے کا تجسس، پرکھنے کا تجسس۔ آپ شروعات میں کسی سے گرم جوشی سے ملتے ہیں جو ایک دو ملاقات تک برقرار رہتی ہے اور پھر سامنے والے کو عام بنا دیتی ہے مگر ثناء کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ وہ پہیلی تھی کہ الجھتی ہی جا رہی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ جان کر بھی کچھ نہیں جانا تھا۔ ثناء ایک پرائیویٹ کمپنی میں کام کرتی تھی۔ ڈیوٹی ٹائمنگ دس سے چار تک تھی اور ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لیا ہوا تھا۔ ہم حسب معمول پارک سے نکل کر چائے کے ہوٹل پر تھے۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چہرے کو چھو کر ایک قسم کا سکون دے رہے تھے۔

''چائے بھی کیسی اچھی چیز ہے۔ ہے نا؟'' ثناء نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا تھا اس نے چائے کے کپ کو دونوں ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا۔

''ہاں بالکل، بہت اچھی چیز ہے یہ میری پسندیدہ چیزوں کی لسٹ میں شامل ہے۔''

''اچھا تمہاری اس لسٹ میں اور کیا کیا ہے؟''

''ہاں اور..... اور تم۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''فلرٹ کر رہے ہو؟'' وہ ہنسی تھی اور ساتھ میں

دراصل۔''

''ویسے آپ میرا انتظار کیوں کر رہے تھے؟'' اس نے میری بات کاٹی تھی۔

''وہ آپ روز آتی ہیں نا اس لیے جیسے آپ اس پارک کا حصہ ہوں مطلب کہ ہم سب اس پارک کے ممبر ہیں۔ ہم اس پارک کی اک فیملی ہیں۔ ہے نا؟''

''اچھا! اور کون کون ہے اس پارک کی فیملی کا حصہ؟''

مجھے اس سوال کی بالکل توقع نہیں تھی، مجھے لگا تھا ایسی باتوں سے وہ متاثر ہوگی مگر فی الحال تو اس کے انداز اور رویے سے متاثر ہونا تو دور اس کا میری باتوں میں دلچسپی لینا بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

''ہاں جیسے وہ بڑے بالوں والا لڑکا جس کو پیچھے سے دیکھا جائے تو ایک حسینہ لگے اور تمہیں پتا ہے ایک انکل نے تو اس کے پیچھے جاگنگ کرتے اس لمبے ٹریک کے چار چکر کاٹے تھے۔ اور وہ نیلی شرٹ والا موٹا لڑکا جو روزانہ سوچ کر آتا ہے کہ آج سے پکی ڈائٹ اور اس ٹریک کے تین چکر لگائے گا مگر آدھا چکر لگانے کے بعد چپس کی ریڑھی کی طرف دوڑتا ہے۔''

میں اب تھک چکا تھا ٹانگیں جواب دے چکی تھیں مگر لڑکی کی چال میں کوئی فرق نہیں آیا تھا'' اور میں جو روزانہ ٹریک کا چکر لگا کر ایک سگریٹ کی ڈبی پیتی ہوں۔'' وہ ہنس رہی تھی ایک حقیقی ہنسی۔

اس کو اس طرح ہنستا دیکھ کر میں بھی ہنسنے لگا تھا۔

''کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟'' میری سانس پھول رہی تھی، قدم بمشکل آگے بڑھ رہے تھے۔ اس کے ہونٹوں نے حرکت کی تھی اور دو الفاظ ادا ہوئے تھے۔

''اب میں یہ نہیں کہوں گا کہ بہت پیارا نام ہے اور میں تمہارا مزید وقت نہیں لینا چاہوں گا ان شاء اللہ پھر ملیں گے۔''

میں نے رکتے ہوئے بلند آواز میں کہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے، اس جہاں میں دو غموں کا بڑا تذکرہ ہوتا ہے۔ غم روزگار اور غم محبت، تمہارے نزدیک سب سے بڑا غم کیا ہے؟"

"غم روزگار۔" میرے سوال پر سوچے بغیر ثناء نے فوراً کہا تھا۔ "یہ محبت وغیرہ تو فارغ وقت کے مشغلے ہیں۔"

"کیا تمہیں کبھی اس کا سامنا ہوا؟"

"سامنا؟ میری زندگی ان ہی کے درمیان گزری ہے اور یہ دونوں غم مجھ پر ایک ہی وقت گزرے ہیں۔ آہ خیر یہ لمبی کہانی ہے۔" اس کی آنکھوں میں ایک اداسی سمٹ آئی تھی جیسے آنکھوں سے ابھی آنسو چھلک پڑیں گے۔

"ہم خود پر بہادری کے جتنے مرضی خول چڑھا لیں مگر پھر بھی ہم احساس و جذبات کی قید سے نہیں نکل سکتے۔ ہم آنسوؤں کو خشک نہیں کر سکتے۔ ہم خواہشات کو رسی سے نہیں باندھ سکتے۔"

"کیا تمہارا کبھی واسطہ پڑا اس کمبخت محبت سے؟" اس نے افسردہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا تھا۔

"ہاں۔ بہت گہرا واسطہ....." اب اداسی ثناء کی آنکھوں سے نکل کر احمر کے چہرے پر ڈیرے ڈال چکی تھی۔

"کیا اس خوش قسمت کا نام جانا جا سکتا ہے؟"

"ہاہا! ہاں کیوں نہیں مگر وہ شروع سے ایک سیاہ بخت تھی۔ اس نے زندگی میں بہت مشکلات دیکھی تھیں مگر ایک دن اس کے ستارے نے گردش کی اور اس کی سیاہ بختی ہمیشہ کے لیے ختم کر دی۔ اس بدقسمت لڑکی کا نام تھا۔ نیلو!"

☆☆☆

نئے اسمارٹ فون کے آتے ہی پوری فیملی کے فوٹو فریم میں سج چکے تھے۔

نیلو نے تصاویر کو غور سے دیکھا تھا۔ "یہ کب کے فوٹو ہیں؟ اور کس نے بنائے ہیں کتنے اچھے

"تمہیں نہیں پتا احمر نے نیا فون لیا ہے اور وہ سب کے فوٹو بنا کر شہر سے نکلوا کر آیا ہے۔ یہ دیکھو، میرا فوٹو؟ ہم سب نے اس دن تیاری کر کے فوٹو بنوائے تھے۔" فرزانہ بڑی گرم جوشی سے نیلو کو فوٹو دکھا رہی تھی۔

نیلو کبھی کبھار ہمارے گھر آ جایا کرتی تھی جب دادو زندہ تھیں تو اکثر دوپہر کو دادو کے سو جانے کے بعد آ جاتی تھی مگر دادو کے بعد نیلو نے آنا بہت کم کر دیا تھا۔

"اچھا، مجھے تو بتایا ہوتا میں بھی بنوا لیتی ایک دو تصویریں، تمہیں پتا ہے، میرے پاس اپنی ایک بھی تصویر نہیں ہے۔" نیلو نے قدرے افسردگی سے کہا تھا۔

"تو ابھی بنوا لو، میں احمر کو بلاتی ہوں وہ پیسے بھی دے روز کالج جاتا ہے۔ تصاویر فریم کروا آئے گا۔"

"نہیں نہیں ابھی نہیں میں کل تھوڑا تیار ہو کر آؤں گی تو پھر بنواؤں گی۔ ابھی تو حالت دیکھنے والی نہیں ہے۔"

اگلے دن نیلو ایک خوب صورت فراک میں میرے سامنے تھی۔ اس کا یہ روپ دیکھ کر میں چونکا تھا۔ ہلکے سے میک اپ اور نیلے فراک نے اسے چار چاند لگا دیے تھے۔

انسان کی بھی کئی شکلیں ہوتی ہیں کئی روپ ہوتے ہیں۔ سادگی والا روپ، سنوارا گیا روپ، خیر نیلو کا ہر روپ کمال تھا۔

میں نے اس کی ڈھیر ساری تصاویر بنائی تھیں، نیلو نے ان میں سے کچھ تصویریں سیلیکٹ کی تھیں۔ میں نے وہ تصویریں ایک فولڈر میں محفوظ کر لی تھیں۔

گھر میں بلقیس مامی نے فوٹو کیا دیکھے تھے کہ قیامت ہی آ گئی تھی ایک فوٹو جس میں نیلو نے فراک کے اوپر شرٹ پہن رکھی تھی اور فوٹو اس اینگل سے بنایا گیا تھا کہ صرف شرٹ ہی نظر آتی تھی، زیر بحث تھا۔

"آنے دے اپنے چاچو کو تمہارے کرتوت

pklibrary.com

ہیں آج کل۔ وہی میں سوچوں یہ لڑکی ہر وقت شہناز کے گھر کیوں بھاگ جاتی ہے۔ پتا نہیں اور کیا کیا وہاں کرتی ہوگی۔'' بلقیس مامی بولے ہی چلی جارہی تھیں جیسے وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں ہوں۔

فوٹو تھے کہ وبال جاں بن چکے تھے۔ نیلو جتنا بلقیس کے تیز نما لفظوں سے بچنے کی کوشش کرتی، اتنے مزید بہانے بلقیس کو ملتے جاتے۔

نیلو سارا دن روتی بلکتی رہی تھی۔ سارے فوٹو راکھ کا ڈھیر بن چکے تھے سوائے دو کے جنہیں میں نے اپنے لیے نکلوایا تھا اور جو آج تک میرے پاس ہیں۔

☆☆☆

''کون تھا رات کو یہاں؟ کس یار کو بلایا تھا؟''

بلقیس مامی نیلو کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہی تھیں۔ سامنے ماموں مختیار چپ چاپ حیرت سے سب کچھ دیکھ رہے تھے نہ وہ بلقیس کو روک رہے تھے اور نہ ہی نیلو کی فریاد سن رہے تھے۔

''چاچی کون؟ کیا؟ مجھے کچھ نہیں پتا قسم خدا کی۔ مجھے نہیں معلوم، آپ کس کی بات کر رہی ہیں۔'' نیلو رو رہی تھی، فریاد کر رہی تھی مگر ایک ایسی جگہ جہاں آنسو اثر نہیں کرتے جہاں فریادی خالی لوٹایا جاتا ہے۔

''کہاں ہے موبائل فون؟ مجھے پتا ہے، تیرے پاس فون ہے۔'' تلاشی لی گئی تھی اس کی، اس کے سامان کی مگر کچھ نہیں ملا تھا۔

''جھوٹ مت بول لڑکی! میں نے رات خود دیکھا ہے کوئی دیوار پھلانگ رہا تھا اور دیوار پھلانگنے کی آواز بھی سنی تھی مختیار میں تو پہلے ہی کہتی تھی مگر تو میری سنتا کب تھا؟ اب دیکھ لے کرتوت۔ یہ لڑکی ہماری بچی کھچی عزت مٹی میں ملا کر چھوڑے گی۔ پہلے اس کی ماں نے کیا کم گل کھلائے تھے، اسی کا خون ہے۔ اثر تو دکھائے گا نا۔''

ماضی یاد دلایا گیا تھا۔ مختیار کے ذہن میں وہ سارے واقعات گردش کرنے لگے تھے۔ وہ الزام، تھی۔ عدالت لگی تھی، بغیر ثبوتوں اور گواہوں کے فیصلہ سنا دیا گیا تھا۔

نیلو پر فرد جرم عائد کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

کوئی اپنوں کے عیبوں پر پردے ڈالتا ہے، چھپاتا ہے مگر مامی بلقیس تو گویا گلی گلی اعلان کرتی پھر رہی تھیں۔ مگر یہ بات بھی ہے نیلو کہاں اس کی اپنی تھی۔

''کوئی رات کے دو بجے کا وقت ہوگا کہ میں نے آواز سنی میں دوڑ کر باہر آئی..... میں نے دیکھا کہ کوئی دیوار پر بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی دیوار سے جمپ لگا کر بھاگ گیا۔''

مامی بلقیس مرچ مسالے کے ساتھ امی کو کہانی سنا رہی تھیں۔

''مامی! آپ نے ماموں کو کیوں نہیں اٹھایا؟ بندہ پکڑا جاتا اور ساری بات بھی ظاہر ہو جاتی۔'' میں نے ان دونوں کی باتوں میں خلل ڈالا تھا۔

''کیسے اٹھاتی، آدھی رات کا وقت تھا۔ میرے اٹھانے اور سمجھانے تک تو وہ بھاگ جاتا اور ویسے بھی اگر وہ کچھ ایسا ویسا کر دیتا تو میں بچوں کو لے کر کہاں جاتی آج کل کے لڑکے خالی ہاتھ تھوڑی آتے ہیں۔''

''مامی! کیا آپ نے لڑکے کو نیلو کے ساتھ دیکھا تھا؟'' مجھے مامی کی باتوں کا بالکل بھی یقین نہیں تھا، میں نیلو کے ساتھ مامی کے رویے سے اچھی طرح واقف تھا مگر پھر بھی میں سوال کیے جارہا تھا شاید میں امی کی نظر میں نیلو کی کردار کشی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''نہیں مگر.....'' مامی آگے بولنے ہی لگی تھی کہ میں نے ٹوکا تھا۔

''مامی جان! جب آپ نے ایسا کچھ دیکھا ہی نہیں تو الزام کیوں لگا رہی ہیں۔ آپ کو پتا ہے الزام تراشی کتنا بڑا گناہ ہے؟ ہو سکتا ہے وہ کوئی چور ہو یا آپ کا وہم بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''وہم؟ بلقیس مامی چیخی تھیں۔'' میں نے خود

اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ امی میری آنکھیں ٹھیک ٹھاک کام کرتی ہیں اور یہاں چور کیا لینے آئے گا؟ یہاں ہے ہی کیا؟''

''ہاں تو یہ بھی تو ہوسکتا ہے وہ لڑکا کسی اور کے لیے آیا ہو؟ وہاں صرف ایک نیلو تھوڑی تھی؟'' میں نے طنزیہ کہا تھا۔'' مامی کے تیور تبدیل ہوئے تھے، ماتھے پر غصے کی لکیریں تھیں۔

''جا دفع ہو جا بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔'' اس سے پہلے کہ مامی کچھ کہتیں۔ امی نے مجھے ڈانٹ کر کہا تھا اور میں مسکراتے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

''نیلو رکو، میری بات سنو!''

نیلو کافی دنوں کے بعد ہمارے گھر آئی تھی۔

''نیلو! کافی دنوں سے تم سے ملنا چاہتا تھا، بات کرنا چاہتا تھا مگر تم ہمارے گھر ہی نہیں آئیں۔ کسی نے منع تو نہیں کیا؟''

''نہیں، منع تو کوئی نہیں کرتا مگر پھر باتیں سننی پڑتی ہیں۔'' نیلو نے افسردگی سے کہا تھا۔

''سناؤ، کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں! اچھی ہوں۔'' وہ رسماً مسکرائی تھی۔

''میں نے کچھ سنا ہے، تمہیں پتا ہے، بلقیس مامی کیا کہتی پھر رہی ہیں؟''

''کیا سنا ہے؟ کیا کہتی ہیں وہ؟''

''انجان مت بنو نیلو! بتاؤ کیا ماجرا ہے؟ کیا یہ سچ ہے؟''

آنکھوں میں نمکین پانی نے بلند ہونا شروع کیا تھا، نیلو نے میری طرف دیکھا تھا گویا بے بسی کی آخری حد ہو۔

''احمر آپ بھی؟'' کپکپاتی آواز میں بس تین الفاظ ادا ہوئے تھے۔

یہ صرف الفاظ نہیں تھے، اعتبار تھا، امیدیں تھیں، اپنائیت تھی اور میں کیسے اعتبار کو توڑ سکتا تھا، اور نیلو کے پاس تو ایک ہی امید تھی۔

''نہیں نیلو! مجھے تمہاری پاک بازی پر یقین ہے، خود سے بھی زیادہ۔ میں تمہارے بارے میں ایسا کچھ سوچ بھی نہیں سکتا میں تو بس پوچھ رہا ہوں کہ اس رات کیا ہوا تھا۔ مامی بلقیس کی باتوں کا تو نہ سر ہے نہ پیر مگر وہ یہ الزام کیوں لگا رہی ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا تھا۔ چاچی نے کچھ دیکھا تھا یا نہیں، ہوسکتا ہے کہ چاچی نے کوئی آواز سنی ہو یا کچھ دیکھا بھی ہو مگر میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں صبح جب اٹھی تو گویا ایک قیامت میری منتظر تھی۔''

''ماموں مختیار نے کیا کہا پھر؟''

''انہوں نے ہمیشہ اپنی بیوی کی ہی مانی ہے، آنکھ بند کر کے ان کی باتوں پر یقین کرتے ہیں۔ بس کہنا کیا تھا؟ پھر اس دن سے جو بھی کبھار بات کر لیا کرتے تھے، وہ بھی ختم کر دی۔''

''اچھا پریشان نہ ہو نا اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیا واقعی؟ کب ٹھیک ہوگا اور کیسے ٹھیک ہوگا؟ عزت زندگی ہوتی ہے اور اگر عورت کی عزت پر داغ لگ جائے تو تمام عمر نہیں دھلتا۔'' نیلو کے چہرے پر ناامیدی تھی۔

''نا امید نہیں ہوتے نیلو۔ سب بہتر ہوگا۔ امتحان جلد ختم ہونے والا ہے۔'' میں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔

جس کا مطلب تھا میں تمہارے ساتھ ہوں۔

☆☆☆

''امی! آپ خود بتائیں میں کیا کرتی؟ کہاں جاتی؟ میری زندگی محرومیوں میں گزری ہے۔ میں چیزوں کو ترسی ہوں، محبت کو ترسی ہوں۔ مجھ میں مزید سکت نہیں ہے سہنے کی۔ آپ نے شادی کر لی اور خوش باش ہیں۔ کبھی ہمارا سوچا؟ ہم نے کس طرح کیسے بسر کی، آپ کو اندازہ نہیں۔'' نیلو اپنی ماں کی گود میں سر رکھے رو رو کر ہلکان تھی۔

pklibrary.com

تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی لیکن تمہاری دادو نے.....''

''امی! میں شیرو کے ساتھ شادی کبھی نہیں کر سکتی۔ مامی بلقیس نے اسے ہاں کردی ہے۔ امی آپ نہیں جانتیں کہ وہ کتنا برا ہے؟ پورے علاقے میں مشہور ہے۔ چرس پیتا ہے، گھر والوں کو مارتا پیٹتا ہے۔ میرے پاس زندگی کی ایک ہی امید ہے۔ میں باقی کی زندگی مزید مشکلات میں نہیں گزار سکتی۔'' نیلو تھی کہ روئے جارہی تھی۔

آج صبح نیلو خاموش نہیں رہی تھی۔ آج جب شیرو کی ماں نے نیلو کے رشتے کی بات کی تھی تو بلقیس چاچی تو گویا ایسے رشتے کی تلاش میں تھیں۔

''دیکھ بلقیس بہن! بہت اچھا ہے میرا پتر، بہت لاڈلا ہے ہاں غصے کا تھوڑا تیز ہے مگر دل کا بہت اچھا ہے۔'' شیرو کی ماں نے اپنے بیٹے کی تعریفوں کے پل باندھ دیے تھے۔

''بس نیلو جیسی بھی ہے اچھی یا بری ہمیں اللہ واسطے قبول ہے۔''

جس کے بیٹے کو پوری بستی میں کوئی رشتہ دینے کو تیار نہیں تھا وہ بھی نیلو کو اللہ واسطے قبول کررہی تھی اور نیلو جانتی تھی، اس کے پیچھے اس کی چاچی ہے جس نے نیلو کی عزت کو خاک میں ملایا تھا۔

''ہاں بہن مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، میں اس کے چاچو سے بات کروں گی۔ وہ میری بات ٹالتے تو نہیں مگر پھر بھی کل بتاؤں گی آپ کو۔'' بلقیس نے اطمینان سے کہا تھا۔

نیلو سمجھ گئی تھی کہ چاچی کا جواب ہی چاچو کا جواب تھا تب ہی وہ سامنے آئی تھی۔

''آپ مجھ پر ترس نہ کھائیں اور چرسی کی شادی کہیں اور جا کر کریں، جتنا اچھا ہے وہ اس کے لیے تو ہزاروں لڑکیاں مل جائیں گی۔'' نیلو نے کھری کھری سنادی تھیں۔

''او بی بی تیرے لیے کوئی شہزادہ نہیں آئے گا۔ یہ تو اس کا بڑا پن ہے جو آ گئی ہے ورنہ جیسے تیرے کرتوت ہیں اللہ معافی دے۔ اور کیا کمی ہے لڑکے میں؟ اچھے گھر کا ہے، عزت دار ہے اور ویسے بھی لڑکوں کو کوئی کمی نہیں ہوتی، مسئلہ تم جیسی لڑکیوں کا ہوتا ہے۔'' بلقیس نے حسب معمول باتیں سنائی تھیں۔

''جی مجھے پتا ہے، جتنا اچھا لڑکا ہے اور خالہ ذرا بتانا آپ کا بازو پچھلے مہینے کیسے ٹوٹا تھا اور کس نے آپ کو مار مار کر بے ہوش کردیا تھا؟ ویسے بھی میں ایک جہنم سے نکل کر دوسرے جہنم میں نہیں جانا چاہوں گی۔'' نیلو پہلی بار دل کی بھڑاس نکال رہی تھی اور شیرو کی ماں چپ کی لپیٹ میں تھی۔

''اگر تمہیں یہ گھر جہنم لگتا ہے تو کسی جنت میں جا کر کیوں نہیں رہتیں، میں بھی دیکھتی ہوں تمہیں کون دو دن سے زیادہ اپنے گھر میں رکھتا ہے۔ بھلائی کا زمانہ ہی نہیں۔ رہنے کو گھر دیا، روٹی کپڑا سب کچھ دیا میں نے اور شہزادی کے لیے یہ گھر جہنم ہے۔''

نیلو نے اپنا سامان اٹھایا تھا، سامان کیا تھا، کچھ کپڑے تھے۔

''یہ کیا کردیا؟ اب کہاں جاؤں۔'' اس نے گھر سے باہر نکل کر سوچا تھا۔ ذہن میں ایک ہی نام پھپھو شہناز کا آیا تھا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر نیلو نے اپنے قدموں کا رخ بدلا تھا اور وہ رخ تھا ماں کا گھر۔

☆☆☆

امی نے اپنے بھائیوں اور دیگر رشتے داروں سے میرے رشتے کی بات شروع کردی تھی۔ امی میرے بھائی عرفان کا بھی رشتہ ساتھ کرنا چاہتی تھی جو آج کل کراچی میں ماموں کے ساتھ ہوتا تھا۔

میں امی پر بوجھ بن گئی تھی مگر میں اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ امی بھی جلدی جلدی مجھے اپنے گھر کا کرنا چاہتی تھیں۔ آج میں چاچو ذوالفقار اور ان کی بیوی چاچی سکینہ کو امی کے پاس دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ وہ چاچو جس نے میرا حال بھی نہیں پوچھا تھا، آج امی کے پاس کیوں آیا تھا۔

ہمارے آفتاب کی نشانی ہے۔ ہم اسے اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے مگر یہ بھائی مختار کے پاس رہنے لگی تو ہم کیا کہتے۔ ہم جانتے ہیں۔ بلقیس نے اچھا نہیں کیا اور وہ نیلو سے جو سلوک روا رکھتی تھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔'' وہ کہہ رہے تھے۔

میرے لیے چاچو کا یہ رویہ بالکل حیران کن تھا اگر وہ اتنے ہی اچھے تھے تو اب تک کہاں تھے۔

''ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ نیلو ہمارے پاس ہماری بیٹی بن کر ہمیشہ رہے۔ ہم نے اپنے بیٹے عامر سے بات کی ہے، وہ بہت خوش ہے۔''

چاچو نے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ اچھا تو اصل وجہ یہ تھی، اب بات نیلو پر کھل چکی تھی۔

عامر نیلو سے تیرہ سال بڑا تھا، شکل وصورت میں قابل قبول تھا، میٹرک تک پڑھا تھا اور اب اپنی زمینوں پر کام کرتا تھا۔

امی نے کچھ سوچنے کے بعد ہلکی پھلکی شرائط کے ساتھ ہاں کردی تھی۔ میں امی کی بات کو سمجھ سکتی تھی، وہ کب تک مجھے اپنے پاس رکھتیں، اگر امی کہیں رشتہ طے کر بھی دیتیں تو شادی ہونے تک مہینے لگ جاتے۔ امی کے لیے یہ سب بہت مشکل تھا اور میں نے بھی اس فیصلے کو دل سے قبول کرلیا۔ یہ رشتہ کسی حد تک قابل قبول تھا۔ ایک تو نام کے ہی سہی اپنے تھے اور دوسرا کچھ پڑھے لکھے بھی تھے، کم از کم چاچی بلقیس اور شیرو سے تو بہتر تھے۔

شادی میں تو کافی دیر تھی مگر طے ہوا کہ ایک مہینے تک نکاح کرلیا جائے گا۔ چونکہ امی کے پاس میرا رہنا ناممکن تھا۔ اس لیے چاچو نے کہا کہ اپنی بیٹی ہے اس لیے ہمارے پاس ہی رہے گی۔

اور پھر میں چاچو کی ساتھ ان کے گھر آ گئی۔

شروع میں تو بہت اچھے سے خیر مقدم کیا گیا سب لوگوں نے وہ عزت واحترام دیا جس کی مجھے تلاش تھی یوں لگا جیسے دن بدلنے لگے ہیں۔ وقت پھرنے لگا ہے۔

بتی رقیہ بھی جو مجھ سے تین سال بڑی تھی۔ وقت بہت اچھی طرح گزرنے لگا میں سارا دن رقیہ کے ساتھ مل کر کام کرتی، وقت بھی اچھا گزر جاتا اور سب کی نظر میں قابل قدر بھی بن جاتی۔

☆☆☆

یہ سب اتنی جلدی ہوا تھا کہ اس سے پہلے میں کوئی قدم اٹھاتا۔ تمام دروازے بند ہو چکے تھے، پانی سر کے اوپر سے گزر چکا تھا۔

مجھے نیلو پر غصہ تھا، وہ ایسا کیسے کرسکتی تھی حالانکہ میں نے اسے سمجھایا تھا کہ یہی ایک فیصلہ تمہاری زندگی بدل سکتا ہے۔ تمہیں مشکلات سے نجات دے سکتا ہے۔ اس بار اپنے حق کے لیے لڑنا، مامی بلقیس کبھی تمہاری خوشیاں نہیں چاہے گی۔

نیلو نے کچھ حد تک اس پر عمل بھی کیا تھا، شیرو کے ساتھ رشتے پر صاف انکار کردیا تھا مگر عامر کے ساتھ؟ عامر نیلو کا جوڑ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا، اس رشتے سے نیلو کی مشکلات بڑھیں گی، کم نہیں ہوں گی۔ مجھے معلوم تھا، وہ شروع شروع میں نیلو کے ساتھ اچھے رہیں گے، ہر کوئی ایسا ہی کرتا ہے، لوگ جیسے دکھتے ہیں، ویسے کہاں ہوتے ہیں۔ لوگوں کی اصلیت تو اس وقت سامنے آتی ہے جب آپ ان کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ ویسے بھی قربانی کے جانور کی بہت آؤ بھگت کی جاتی ہے۔

میرا بچپن نیلو کے ساتھ گزرا، ہم اکٹھے کھیلتے کودتے اور اسکول جاتے تھے۔ اس وقت ہماری بستی میں ایک ہی اسکول تھا جو کھلے آسمان تلے بنایا گیا تھا جس کا بورڈ ایک درخت پر چسپاں تھا۔

یہ اسکول پانچویں تک تھا۔ ہم پانچویں تک ساتھ پڑھے تھے مگر پھر نیلو نے اسکول چھوڑ دیا یا دادو نے چھڑوا دیا۔ ہمارے گاؤں میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہیں تھا، بڑوں کے بقول پڑھ کر کیا کریں گی، ہم نے کون سا نوکری کروانی ہے۔

مجھے شروع ہی سے نیلو سے ہمدردی تھی، مجھے

میں نے نیلو کی خوب پٹائی کی تھی اور وہ روتی ہوئی میری امی کے پاس آئی تھی۔

''پھوپھو! احمر نے مجھے بہت مارا ہے یہ دیکھو۔'' وہ اپنے رخسار دکھا رہی تھی جس پر سرخ نشان تھا۔ امی نے اس دن مجھے سمجھایا تھا۔ ''بیٹا! اس کا کوئی نہیں ہے نہ ماں ہے نہ باپ۔ نیلو کو کچھ نہ کہا کر۔'' بس اس دن کے بعد نیلو کے لیے دل میں صرف ہمدردی رہی اور کب یہ ہمدردی سفر کرتی ہوئی محبت میں تبدیل ہوئی، کچھ معلوم نہیں۔

میں نے سوچا تھا کہ مناسب وقت آنے پر امی سے بات کروں گا اور یہ مناسب وقت کبھی نہیں آیا تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ میں کیا کر سکتا تھا۔

اب تو امی سے بھی بات کرنا فضول تھا، امی کیا کر سکتی تھیں؟

امی ماموں سے یہ تو نہیں کہہ سکتی تھیں کہ آپ رشتہ ختم کریں میں نے اپنے بیٹے سے کروانا ہے اور ماموں یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ پہلے تم کہاں تھیں جب لڑکی در در کی ٹھوکریں کھا رہی تھی۔

امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ اداسی نے چاروں طرف سے مجھے گھیر رکھا تھا، سب کچھ ہاتھوں سے نکل چکا تھا، وقت کب کہاں کس کے لیے رکا ہے۔

مگر وقت تو وقت ہے یہ ایک بار پھر پلٹا تھا۔

☆☆☆

ایک واقعے نے پورے گھر کے رویے کو تبدیل کر دیا۔ ہر فرد نیلو سے یوں پیش آ رہا تھا جیسے اس سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

ہوا کچھ یوں کہ پرسوں نیلو کی ماں اپنے بھتیجے کے ساتھ وہاں آ پہنچیں۔ نیلو دونوں کو گھر لے آئی اور پھر ماں کے اصرار پر ان کے ساتھ گھر چلی گئی۔ شام کو جب نیلو واپس آئی تو تمام چہروں پر بارہ بجے ہوئے تھے، پہلے تو نیلو کچھ نہ سمجھ سکی کہ کیا ماجرا ہے۔ مگر پھر رقیہ نے ڈھکے چھپے انداز میں بتایا کہ ''امی اور بھائی کو تمہارا کزن کو یہاں لے کر اور پھر اس کے ساتھ جانا اچھا نہیں لگا۔ میں نے دیکھا! وہ کس طرح سے گھور گھور کے تمہیں دیکھ رہا تھا اور ہنس ہنس کے تم سے باتیں کر رہا تھا۔ اب تم ہماری عزت ہو اور تمہیں اس چیز کا خیال رکھنا چاہیے تھا تمہیں پتا ہے لوگ کتنی باتیں بناتے ہیں۔''

''رقیہ بات کو سمجھو یار! علی میرے ماموں کا بیٹا ہے، اب امی اس کو ساتھ لے کر آ گئیں تو میں کیا کرتی اور دوسری بات وہ میری امی کے ساتھ آیا تھا، اکیلا تھوڑی تھا یا میں اس اکیلے کے ساتھ کہیں باہر تو نہیں گئی، امی ساتھ تھیں۔'' نیلو نے اپنے حق میں صفائی دی تھی۔

مگر مسئلہ حل نہیں ہوا تھا، رویے ٹھیک ہونے کے بجائے بگڑتے جا رہے تھے۔ نیلو کوئی کام کرنے لگتی تو سکینہ چاچی روک لیتیں یا خود کرنے لگتیں۔

نیلو سمجھ گئی تھی یہاں زندگی کبھی بہتر نہیں ہو سکتی۔

''مجھے تو بلقیس کی باتوں میں سچائی لگتی ہے، مجھے اس لڑکی کے چال چلن ٹھیک نہیں لگتے، اس دن ماں کے ساتھ آئے لڑکے سے ایسے باتیں کر رہی تھی جیسے بہت اپنا ہو اور پھر اس کے ساتھ ماں کے گھر چلی گئی۔ پہلے اس کے یہ رشتہ دار کہاں تھے، اب کہاں سے نکل آئے ہیں۔'' چاچی سکینہ اپنی بہن سے باتوں میں مشغول تھی جسے نیلو نے سن لیا تھا۔

جن تلخ باتوں اور الزامات سے وہ پیچھا چھڑانا چاہتی تھی وہ دوبارہ اس کے سر پر آن کھڑے تھے۔ نیلو کو یہاں کچھ اچھے کی امید تھی مگر سب امیدیں خاک ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

ہم سب اس کے گرد جمع تھے اور وہ تھی کہ روئے جا رہی تھی۔ امی اس کے سر پر ہاتھ رکھے اسے سینے سے لگائے ہوئے تھیں۔

''کیا ہوا ہے نیلو؟ کیوں روئے جا رہی ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟''

امی بار بار سوال کیے جا رہی تھیں مگر جواباً صرف رونے کی آوازیں تھیں۔

pklibrary.com

آج جیسے ہی نیلو ہمارے گھر آئی تو برآمدے میں رکھی چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ رو رہی تھی تب ہی ریحانہ کی آواز نے سب کو متوجہ کیا۔

''امی! نیلو رو رہی ہے۔'' اور ہم سب نیلو کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔

''نیلو! کچھ بتاؤ گی بھی کہ کیا ہوا ہے؟'' میں نے تھوڑی خفگی مگر نرمی سے پوچھا تھا۔

نیلو نے تمام واقعہ شروع سے لے کر آخر تک بیان کر دیا تھا مگر اس کے آنسو ایک پل کو بھی نہیں رکے تھے۔

''امی! یہ آپ کی بھتیجی ہے، آپ کے بھائی کی نشانی ہے جس کا نام لے کر ابھی تک آپ روتی ہیں اگر آپ بھائی کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہیں تو اس کے لیے کچھ کریں۔ یقیناً آپ کے بھائی کی روح خوش ہوگی۔ بس میں نے سوچ لیا ہے آج سے نیلو یہیں رہے گی۔''

''نیلو کا اپنا گھر ہے جب تک رہے۔ ہماری بیٹی ہے۔'' امی نے میری تائید کی تھی۔

''لیکن اب نیلو کا رشتہ ہو چکا ہے اگر ہم اسے اپنے پاس رکھیں گے تو بھائی ذوالفقار خفا ہوں گے۔''

''آپ اس لڑکی کی حالت دیکھیں، یہ کب تک دردر کی ٹھوکریں کھائے گی، ویسے بھی ماموں خفا ہو کر کیا کریں گے۔ پہلے کون سا وہ ہمیں روٹی پانی دے رہے ہیں جو بند کر دیں گے۔''

''بیٹا! نام کا ہی سہی مگر تعلق تو ہے اور ویسے بھی اب نیلو ذوالفقار بھائی کی بہو ہے۔'' امی نے پھر سے یاد دہانی کرائی تھی۔

''امی! رہنے دیں صرف رشتے کی بات ہوئی ہے۔ منگنی تک نہیں ہوئی، آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے نکاح ہو گیا ہے۔ رشتہ ہوا ہے تو ٹوٹ بھی سکتا ہے اور ویسے نیلو کو رشتوں کی کمی نہیں ہے اگر اس سے کوئی شادی نہیں کرے گا تو میں کروں گا۔''

دل کی بات آخر کار زبان پر آ ہی چکی تھی۔ وہ بات جو شاید میں کبھی نہ کہہ سکتا جذبات نے وہ بات کہلوا دی تھی۔ میں آج بھی جب یہ لمحہ یاد کرتا ہوں تو ہنسنے لگتا ہوں کہ کیسے مجھ جیسے بزدل نے اتنی بہادری دکھائی تھی۔ تمام نظریں میری طرف اٹھی تھیں۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہو۔

مزید شرمندگی سے بچنے کے لیے میں باہر کی طرف نکل گیا تھا۔

☆☆☆

''امی! بات کو آپ نہیں سمجھ رہیں۔ مجھے آپ کے انکار کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی ویسے تو آپ ماموں اور ان کے بچوں سے محبت کی دعوے دار ہیں مگر آج جب وقت آیا ہے تو آپ پیچھے ہٹ رہی ہیں۔'' آج جب فرزانہ باجی نے مجھے کہا کہ امی کہتی ہیں کہ ''احمر کو سمجھاؤ، نیلو سے رشتہ ممکن نہیں اس لیے اس معاملے پر خاموش رہے۔'' تو میں امی سے بات کرنے چلا آیا تھا۔

''کہیں آپ مامی بلقیس کی باتوں میں تو نہیں آ گئیں؟ ان کے بقول نیلو ایک بدکردار و بدچلن لڑکی ہے اگر بالفرض مان بھی لیں کہ نیلو اچھی لڑکی نہیں ہے تو اس کی کیا گارنٹی ہے کہ جس سے میری آپ شادی کریں گی وہ لڑکی ٹھیک ہوگی۔ اس کا ماضی صاف ہو گا؟''

''نہیں میرے لعل! تم غلط سمجھ رہے ہو۔ نیلو ہماری اپنی ہے میں نے اسے کبھی غلط نہیں سمجھا۔ میں تو بس اپنے بھائی سے اچھے تعلقات چاہتی ہوں تمہیں پتا ہے اگر میں تمہارا رشتہ طے کرتی ہوں تو بھائی ذوالفقار سے تعلقات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔ جو میں کسی صورت نہیں چاہتی۔'' امی نے اپنا موقف میرے سامنے رکھا تھا۔

''بھلے نیلو کی زندگی تباہ ہو جائے مگر بھائی ناراض نہ ہو۔ امی پلیز، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ایک لمبی بحث کے بعد امی نے ہامی بھر لی تھی اور میں نے ایک معرکہ سر کر لیا تھا۔

ابو نے مامو ں مختیار سے بات کی تھی اور وہ یہ کہہ کر بری الذمہ ہو گئے تھے کہ جو آپ کو بہتر لگے، ہمیں کوئی مسئلہ نہیں۔

معاملات جتنے مشکل لگ رہے تھے اتنی ہی آسانی سے حل ہو گئے تھے۔ میں اور نیلو بہت خوش تھے گویا زندگی بدلنے لگی تھی۔

نیلو نے جو مشکلات دیکھی تھی، میں ان کا ازالہ کرنا چاہتا تھا اور زندگی مجھے گویا موقع دینے لگی تھی۔

بڑوں نے یہ طے کیا تھا کہ فی الحال ایک ہفتے تک نکاح کر دیتے ہیں پھر ایک ڈیڑھ سال بعد شادی کر دیں گے۔ گھر میں تیاریاں شروع ہونے لگی تھیں۔

☆☆☆

''یار یہ نئی مصیبت آن پڑی ہے، اپنے بھائی کو سمجھاؤ، امی سے بات کر دی الحال ہمارا نکاح ہو جانے دو پھر جو ہوگا کر لیں گے۔'' میں نیلو کو سمجھا رہا تھا اور وہ میری ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ نیلو کا بھائی عرفان کراچی سے آ چکا تھا۔

نیلو کی امی نے ایک عجیب شرط رکھ دی تھی کہ ہم بیٹی کا رشتہ اسے دیں گے جو بدلے میں عرفان کے لیے رشتے دے گا۔ اس لیے نکاح نیلو کے ساتھ عرفان کا بھی ہوگا۔

یہ تقریباً ناممکن سا تھا، فرزانہ کا نکاح ہو چکا تھا، رخسانہ کے رشتے کی بات کہیں اور چل رہی تھی اور رقیہ تو ابھی بہت چھوٹی تھی۔

دراصل مامی کے بھتیجے علی کو نیلو پسند آ گئی تھی اور وہ ہر صورت نیلو سے شادی کرنا چاہتا تھا اس لیے نیلو کی امی مختلف حیلے بہانوں سے یہ سب ختم کرنا چاہتی تھی۔

اس میں عرفان اپنی امی کا پورا پورا ساتھ دے رہا تھا اور اس میں کہیں نہ کہیں نیلو کی بھی مرضی شامل تھی۔ وہ اب اس ماحول سے اکتا چکی تھی، اس ماحول میں سوائے مصیبتوں کے اسے کچھ نہیں ملا تھا۔

مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس معاملے پر امی سے بات کروں، امی جو نیلو کے لیے بمشکل مانی تھیں اب کیا کر سکتی تھیں۔

مگر پھر بھی امی نے مامی کو یقین دہانی کرائی کہ عرفان کا رشتہ وہ خود کرائیں گی اور اسے گھر بنانے کے لیے زمین بھی دیں گے۔ مگر مامی کب اس مسئلے کا حل چاہتی تھیں، وہ تو بس سب کچھ ختم کر کے نیلو کی شادی اپنے بھتیجے سے کرنا چاہتی تھیں۔

نیلو سامان کا ایک بیگ لیے جانے کو تیار تھی امی اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں اور باہر کھڑا اس کا بھائی انتظار کر رہا تھا۔

''نیلو! ایک آخری بار سوچ لو؟'' میں نے نیلو سے کہا تھا۔

''میں نے سوچ لیا ہے۔'' مختصر جواب آیا تھا۔

''نیلو بیٹا!'' اس سے پہلے امی کچھ کہتیں نیلو نے اپنے جوڑے ہوئے ہاتھ آگے کیے تھے۔ ''پھوپھو پلیز، مجھے جانے دیں۔''

''امی! بس اب آگے کچھ نہیں کہیں گی۔ نیلو کو راستہ دیں۔''

امی خاموشی سے راستے سے ہٹ گئی تھیں۔

''بس یہ تھی نیلو کی کہانی اب مجھے ایک گلاس پانی کا پلا دو۔''

''ہاں پانی میں پلاتی ہوں مگر کہانی کو مکمل کرو کہ آگے کیا ہوا تھا۔'' ثناء یہ کہہ کر پانی لینے چلی گئی تھی۔

''بس آگے کیا ہونا تھا نیلو کی شادی ہو گئی علی کے ساتھ۔'' میں نے پانی کا ایک گھونٹ پی کر گلاس کو میز پر رکھ دیا تھا۔

''اوہو بہت برا ہوا۔'' ثناء نے افسوس کیا تھا۔

''نہیں بہت اچھا ہوا تھا، مجھے اس بات کی بہت زیادہ خوشی ہے کہ وہ وہاں خوش ہے، علی اس سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ کافی امیر ہیں۔ ان کی اپنی مارکیٹس ہیں اپنا کاروبار ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتی تو شاید اتنی خوش نہ ہوتی اسے ہمیشہ وہ باتیں سننی پڑتیں جو وہ نہیں

pklibrary.com

سننا چاہتی تھی۔

شاید یہ دادو کی خدمت کا صلہ تھا یا اس کے صبر کا نتیجہ مگر اسے وہ سب کچھ مل گیا تھا جس کی نیلو کو ضرورت تھی جو نیلو کا حق تھا۔ بے شک مشکلات کے بعد آسانیاں ہیں۔"

"اچھا اب میں چلتا ہوں پھر ملیں گے۔" میں یہ کہہ کر ثناء کے گھر سے باہر نکل آیا تھا۔

☆☆☆

زندگی پھر مجھے وہاں دھکیل رہی ہے جس کے خوف سے میں بھاگتے بھاگتے لاہور آ گیا تھا۔

میں ثنا کے بارے میں سوچنے لگا تھا خیالات و تصورات سے باقی چیزیں نکلنے لگی تھیں اور میرے لیے یہ باعث تشویش تھا۔

اول اول یہی تو ہوتا ہے کہ آپ کسی کے بارے میں سوچنا شروع کرتے ہیں۔ پھر وہ چیز دل و دماغ پر حاوی ہو جاتی ہے اور پھر آپ کو اس کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا لیکن جب وہ چیز آپ کو نہیں ملتی تو آپ یاسیت کا شکار ہو جاتے ہیں اور میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

نیلو کی شادی کے بعد میں ڈپریشن کا شکار ہو گیا تھا، طبیعت ہر وقت بے چین رہتی۔ اداسی تھی کہ چہرے پہ نقش تھی، ہر دوسرے دن بخار ہو جاتا۔

ایسا نہیں تھا کہ میں محبت میں اندھا تھا اگر نیلو کی شادی شروع میں عامر کے ساتھ ہو جاتی تو سب نارمل ہوتا۔ ایک دھچکا سا ضرور لگتا مگر دل و دماغ کو قائل کیا جا سکتا تھا۔

مگر یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب میں نے اسے اپنا سمجھ کر دل و دماغ پر حاوی کر لیا تھا، ظاہر ہے سب کچھ میرے ہاتھوں میں تھا مگر ایک بار پھر وقت کا تماشا شروع ہوا اور ہاتھوں سے سب کچھ چھین لیا گیا۔ اور ہاتھوں سے جانے کا غم آپ کو بیمار کر دیتا ہے۔

میرے غم کو مائی بشیراں سمجھ سکتی ہے جس نے اپنے جوان بیٹے کو اپنے ہاتھوں میں دم توڑتے دیکھا تھا۔ مائی نے اپنی جمع پونجی اپنے ہاتھوں سے جاتی دیکھی تھی اور چاہ کر بھی وہ کچھ نہ کر سکی تھی۔

میں اس سال پیپر بھی نہیں دے سکا تھا۔ امی کو کسی نے مشورہ دیا کہ احمر کو کسی کام پر لگا دیں۔ مصروف رہے گا تو بہتری آئے گی۔

میں نے پہلے کچھ عرصہ جنرل اسٹور پہ کام کیا، مصروفیت نے میرے ذہن پہ بہت اچھا اثر ڈالا۔ پھر میں نے اس ماحول سے نکلنے کا فیصلہ کیا اور دو سال پہلے لاہور آ گیا۔

یہاں ایک کزن کام کرتا تھا جس نے مجھے ایک آفس میں بطور کمپیوٹر آپریٹر جاب دلوا دی۔

اور جیسا کہ کہتے ہیں وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے میرا زخم آہستہ آہستہ بھرنے لگا اور پھر ایک دن نہ جانے کب؟ کیسے؟ زخم بھر گیا۔

مگر زخم بھر جائیں پھر بھی نشان تو رہ جاتے ہیں۔

☆☆☆

"نیلو سے پھر کبھی آمنا سامنا ہوا یا پھر کہیں ملے؟" ایک ہاتھ ٹراؤزر کی جیب میں ڈالے ثناء نے میری طرف دیکھا تھا۔ ہم ٹریک پر حسب معمول واک کر رہے تھے۔

"ہاں ایک بار، شادی کے پانچ چھ ماہ بعد وہ ہمارے گھر آئی تھی، جب وہ کراچی شفٹ ہو رہے تھے، سب کو خدا حافظ کرنے آئی تھی کہ شاید پھر زندگی موقع دے نہ دے۔"

"پھر کوئی بات بھی ہوئی تھی اس سے؟"

"نہیں۔ ایسی کچھ خاص تو نہیں، بس رسماً حال احوال، یوں ملے کہ جیسے آشنائی نہ ہو، جیسے اجنبی ہوں۔

لیکن مجھے یہ بات بہت اچھی لگی کیونکہ ہماری اب شناسائی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی اور ہمیں حقیقت کو قبول کرنا آنا چاہیے۔"

"ویسے مجھے پہلے تمہاری آنکھیں نیلو کی یاد

''اچھا باتوں کی تو سمجھ آ گئی مگر آنکھیں کس طرح؟''

''وہ اس طرح کہ تمہاری آنکھوں میں بھی وہی اداسی، ناامیدی اور مایوسی ہے جو کبھی نیلو کی آنکھوں میں تھی، سنا ہے یہ سیاہ بختی کی علامت ہے اور جب قسمت بدلتی ہے تو آنکھوں میں چمک لوٹ آتی ہے۔ اب جب تم ہنستی ہو تو تمہاری آنکھیں تمہارا ساتھ نہیں دیتیں۔''

ثناء حیرانی سے مجھے گھورے جا رہی تھی جیسے راز سے پردہ اٹھا دیا گیا ہو۔

''خیر، اس میں حیرانی کی بات بالکل نہیں، میں نے ایک وقت ایسی ہی آنکھوں کے سائے میں گزارا ہے، میری اک عمر ان ہی آنکھوں کو دیکھتے گزری ہے۔''

''اچھا، اب ہمیں چلنا چاہیے، کافی وقت ہو گیا ہے۔'' شاید ثناء بات کو بدلنا چاہتی تھی اور اسے یہ باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔

''ہاں مگر کہاں چلیں گے؟''

''میرے گھر، وہاں چائے پئیں گے اور ہاں اب یہ کہنے کی بالکل ضرورت نہیں کہ تم چائے بہت اچھی بناتی ہو۔''

''ہاہا!'' میں زور سے ہنسا تھا۔ ''ہائے رے خوش فہمی، کیا تمہیں واقعی یہ لگتا ہے کہ تم چائے بہت اچھی بناتی ہو؟''

''دفع ہو۔'' ثناء نے مجھے ہلکا سا دھکا دیا تھا۔

''ثناء! میں چائے کے کپ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ثناء سے مخاطب ہوا تھا۔

''ہاں بولو۔'' وہ اپنے کپ میں چینی ڈال کر اسے مکس کرنے میں مشغول تھی۔

''تم میرے بارے میں تو کافی کچھ جان چکی ہو، لیکن ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''تم کیا کرو گے جان کر۔'' اس نے چمچہ کو کپ سے نکالتے ہوئے میری طرف دیکھا تھا۔

ایک گھونٹ لیا تھا، چائے واقعی اچھی بنی تھی یا مجھے لگی تھی۔

''ہاں ضرور مگر پہلے چائے پی لی جائے۔''

☆☆☆

ہم چار بہن بھائی ہیں، تین بہنیں اور ایک بھائی، میں سب سے بڑی ہوں اور سب سے چھوٹا بھائی ہے۔ ابو (میر خان) سرکاری ملازم ہیں اور امی عام پاکستانی ماؤں کی طرح گھر سنبھالتی ہیں۔ شہر کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں ہم بھی پیچھے نہیں رہنا چاہتے تھے سو ابو کی خواہش تھی کہ ہم بھی پڑھ لکھ کر بڑے عہدے پر فائز ہوں۔ ہم اتنے امیر کبیر تو نہیں تھے مگر اتنے تو تھے کہ اچھا کھا پی سکیں، ہماری ضروریات کے ساتھ تقریباً خواہشات بھی مکمل ہو جاتی تھیں۔ اتفاق سے ہم چاروں بہن بھائی پڑھائی میں بہت اچھے تھے اور اس کی ایک وجہ ہمارے ابو تھے جو شروع ہی سے ہماری توجہ پڑھائی پر مبذول کراتے تھے۔ ایک اچھے اسکول میں داخل کروانے کے ساتھ ایک ٹیوشن بھی ضرور رکھتے تھے اور اس کے ساتھ ابو خود بھی ہمیں پڑھاتے تھے، اب اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی بندہ پڑھائی میں اچھا نہ ہو تو اور کیا ہو۔

میں نے میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کیا اور اپنی کلاس میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ مجھے یاد ہے اس دن ابو کتنے خوش تھے مجھ سے بھی زیادہ، ابو نے اپنا وعدہ بھی پورا کیا تھا اور میرے لیے میک اپ کا سامان لائے تھے، جس کی شرط یہ تھی کہ میں اگر میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کروں گی تو جو کہوں گی وہی ملے گا۔

اس کے بعد میں نے کالج میں داخلہ لے لیا اور دن تیزی سے گزرنے لگے، کالج کا دو سالہ وقت میری زندگی کا حسین ترین وقت ہے۔ کالج میں ہم نے بہت انجوائے کیا، میرے کئی دوست بنے ان کے ساتھ ایک اچھا وقت گزرا، ہم نے کالج کی مختلف سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ پریشانیوں اور

pklibrary.com

مشکلات کے بغیر گزارے جانے والا زندگی کا آخری دور تھا، ہم اس دور میں اداسی سے واقف نہیں تھے، ہم غموں سے آزاد تھے۔

کالج سے الیف ایس سی کرنے کے بعد میں یونیورسٹی آئی تو تمام دوستوں سے ہاتھ دھونا پڑا اور یہی وقت تھا جب زندگی ٹریک سے اترنے لگی تھی۔

☆☆☆

یونی میں گویا الگ ہی زندگی تھی ایک الگ ماحول، ایک رونق تھی، ایک میلا تھا۔

یہاں ہر طرح کے لوگ ملتے تھے۔ بالکل سادگی پسند سے لے کر آخری درجے کے فیشن ایبل تک۔ میں ان لوگوں میں شامل تھی جنہیں دوسرے لوگ زیادہ متاثر نہیں کرتے مگر یہاں آ کر میں متاثر ہوئی تھی۔ کچھ چہرے، کچھ لباس، کچھ فیشن ایسے تھے جو میری آنکھوں کو سکون بخشتے تھے۔

پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوا تو میں پڑھائی میں مشغول ہوگئی، ٹیچر نے پڑھائی میں آسانی کے لیے اسٹوڈنٹس کو گروپوں میں تقسیم کر دیا۔

دس دس اسٹوڈنٹس کے گروپ بنا دیئے گئے جن میں لڑکے بھی شامل تھے۔

ان ہی گروپس سے گرل فرینڈز، بوائے فرینڈز کا ٹرینڈ چلنے لگا اور بریک اپ، پیچ اپ ہونے لگے۔ مجھے ان سب چیزوں میں کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی یا شاید ہوسکتا ہے میں ایسے ماحول میں نہیں پلی بڑھی تھی۔ اس لیے میں شروع شروع میں ان چیزوں سے احتیاط برتنے لگی۔

ہمارے گروپ میں ایک لڑکا تھا احسن، جو بہت لائق فائق تو تھا ہی مگر خوش شکل بھی تھا۔ چونکہ گروپس کے درمیان مقابلے ہوتے تھے سو اس لحاظ سے احسن ون مین آرمی تھا۔ تمام گروپ کے ممبر اسے ہی آگے کرتے تھے اور وہ گویا ہمارا مان تھا، اسائنمنٹ سے لے کر پریزنٹیشن تک تمام کام اس کے ذمے ہوتے تھے اور ہم بے فکر۔

تمام اسٹوڈنٹس کا جھکاؤ احسن کی طرف تھا جو کہ ایک فطری بات تھی کہ وہ لائق فائق تھا، خاص تھا۔ مگر اس کا جھکاؤ میری طرف تھا، پہلے تو میں اسے عام سی بات سمجھی کیونکہ ہم کلاس میٹ تھے اور پھر اس سے بڑھ کے گروپ میٹ، گویا اسٹڈی ہمیں مل کر ہی کرنی ہوتی تھی سو شروعات میں، میں نے اسے لائٹ ہی لیا۔

مگر دھیرے دھیرے مجھے احساس ہونے لگا کہ یہ سب کچھ اسٹڈی کی حد تک نہیں ہے، بہانے بہانے سے اس کا مجھ سے بات کرنا، میرے ذمے گروپس کے کام خود کرنا، جب بھی آنا میرے لیے کچھ کھانے کا لے کر آنا یہ سب چیزیں کسی اور چیز کا عندیہ دے رہی تھیں۔

خیر میں سب کچھ سمجھنے کے باوجود انجان بنے رہنے کا ناٹک کرتی رہی، مگر ناٹک نے ایک دن تو ختم ہونا ہی ہوتا ہے۔ اگر میں نے اسے ایک اچھا رسپانس نہیں دیا تھا تو اسے دھتکارا بھی نہیں تھا یا اس کی امیدوں کو توڑا بھی نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ ہمارے درمیان رابطے بڑھنے لگے اور میں احسن کی طرف مائل ہونے لگی، میں نہیں جانتی یہ کچی عمر کی محبت تھی یا مخالف جنس کی کشش۔

میں نے اس کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور پھر یہ سوچ دل و دماغ پر حاوی ہونے لگی اور یہی میں نے غلطی کی تھی، مگر یہ ابتداء نہیں تھی، ابتدا تو وہ کر چکا تھا، وہ محبت کا دعوا کر چکا تھا۔

محبت کا جواب بھی محبت دیا گیا تھا، ہمارے درمیان قربتیں بڑھنے لگی تھیں، جیسے یونیورسٹی میں ایک دوسرے کے بغیر کچھ نہ رکھا ہو، ہمارا دن ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد ہوتا تھا اور اگر ایک چھٹی کرتا تو دوسرے کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میری اور احسن کی محبت کے قصے ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں مشہور ہونے لگے، یہ زندگی کا ایک اچھا دور تھا۔

ہم نے بھی اوروں کی طرح جینے مرنے کی قسمیں کھائیں، ہمیشہ ساتھ نبھانے کے وعدے لیے

کر وعدے تو ہوتے ہی توڑنے کے لیے ہیں۔
یونہی محبت کھیلتے ایک سال گزر گیا۔

☆☆☆

یونیورسٹی کے اسی دور میں پریشانیوں سے تعارف ہونا شروع ہوا، ابو کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ ابو کو معدے کی تکلیف کا سامنا تھا مگر اب مسائل بڑھنے لگے۔

گھر کا نظام درہم برہم ہونے لگا اور مالی مشکلات کا خوف بھی سر پر منڈلانے لگا۔ میں گھر میں سب سے بڑی تھی تو لہٰذا مجھ پر ذمہ داریاں بڑھنے لگیں، ابو کا علاج اور گھر اب میرے ذمے تھا اور میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔

اس وقت مجھے سہارے کی ضرورت تھی، کسی اپنے کی جو کم از کم میرا حوصلہ بڑھائے ہاں اور کوئی کسی کے لیے کر بھی کیا سکتا ہے۔ میں نے احسن سے ساری امیدیں وابستہ کر لی تھیں کیونکہ آپ کا پیار ہی آپ کے کام آتا ہے اور امیدیں خود بخود ایسے لوگوں سے جڑ جاتی ہیں۔ ویسے بھی میں نے کہیں نا کہیں مشکلات میں احسن کا پورا ساتھ دیا تھا اور کچھ نہیں تو اس کا حوصلہ بڑھایا تھا، اسے ہمت دی تھی اور جہاں تک مجھ سے ہو سکتا تھا تھوڑی بہت اس کی مالی مدد بھی کرتی آئی تھی۔ مگر جہاں امیدیں ہوتی ہیں وہاں مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملتا اور میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

احسن کا رویہ اچانک تبدیل ہونے لگا تھا، اس وقت میں محبت کی انتہا پر تھی، میرے جذبات انتہاؤں کو چھو رہے تھے۔ میرے لیے گھر کے حالات اتنی پریشانی کا باعث نہیں تھے جتنا احسن کا رویہ تھا، اس لیے رویے میں کھردرا پن تھا، جیسے محبت پھسلی پڑ رہی ہو ختم ہو رہی ہو۔

وہ محبت، وہ اپنائیت، وہ خلوص اب ختم ہونے لگا تھا، میں جو اس سے امیدیں جوڑے بیٹھی تھی وہ پوری ہونا تو دور رشتے میں بھی دراڑیں پڑنا شروع ہو چکی تھیں۔ میں نے کئی بار احسن سے شکایت کی مگر وہاں سے ایک ہی جواب، ایسا کچھ نہیں ہے میں تو ویسے کا ویسا ہوں۔

مگر وہ ویسا نہیں رہا تھا۔ میں اس سے خفا و ناراض رہنے لگی مگر گویا اسے تو جیسے اس سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا، وہ جو میرے خفا ہونے سے آسمان سر پر اٹھا لیتا تھا، تب تک سکون کا سانس نہیں لیتا تھا جب تک مجھے منا نہ لے مگر ان دنوں بے حس تھا۔

اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ میں کس اذیت میں ہوں۔ نتیجتاً میں خود ہی روٹھ کر خود ہی مان جاتی تھی الٹا اس سے معافی بھی مانگتی تھی کہ غصے میں کیا کچھ کہہ جاتی ہوں۔ میں تو مجبور تھی دل کے ہاتھوں، مجبوریاں انسان سے کیا کچھ کرواتی ہیں۔

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا، انا ہاتھ جوڑے میرے سامنے کھڑی تھی وہ اب مزید رسوائی نہیں چاہتی تھی۔ وہ ڈیپارٹمنٹ کی کسی اور لڑکی میں دلچسپی لینے لگا تھا، میں نے اس بارے میں احسن سے بات کی مگر اس نے انکار کر دیا کہ ایسا کچھ نہیں۔

میں نے تنگ آ کر اس کے سامنے دو آپشن رکھے۔ مجھے چنے یا کھو دے۔ اس نے مجھے چنا مگر رویہ ویسے کا ویسا رہا جیسا کہ بوجھ ہو اور اسے جھیلنا بھی لازم ہو۔ ادھر ابو کی طبیعت مزید بگڑنے لگی اور ابو بیڈ پر آ گئے، مالی مشکلات کے سائے منڈلانے لگے یعنی روزگار اب میری ذمہ داری تھا۔

"کیا باقی کا جو مختصر عرصہ ہے، ہم اس میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے؟ ایک اچھے دوست بن کر۔" میں نے اس کے سامنے عرضی رکھی تھی۔ ہم کینٹین میں بیٹھے چائے کا انتظار کر رہے تھے۔

"ہم ایک اچھے دوست ہی تو ہیں اور کس نے کہا ہم ایک ساتھ نہیں رہیں گے یا میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں ایسے نہیں۔ تم یہ بات ہزاروں بار کہہ چکے ہو مگر رویے میں وہی اجنبیت ہے، تم بدل گئے ہو احسن! مجھے لگا تھا تم دوسروں سے ہٹ کر ہو مگر تم بھی وہی زمانے والی ادا رکھتے ہو۔ میں چاہتی ہوں جیسے

ملیں، خیر مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں مشکلات میں گھری ہوئی ہوں۔'' میں نے اس پر واضح کیا تھا۔

''تمہیں مجھ سے کیا چاہیے؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''کیا تم واقعی نہیں جانتے، میں کیا چاہتی ہوں، کیا یہی دوستی ہے؟ کیا یہی محبت ہے؟ دوستی تو وہ ہوتی ہے کہ مجھے الفاظ ادا ہی نہ کرنے پڑتے اور تم سمجھ جاتے کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے، خیر میں صرف تمہارا ساتھ چاہتی ہوں۔''

''میں تو ایسا ہی ہوں۔ آگے جیسے تمہاری مرضی، میرے ساتھ رہو یا نہیں۔''

ایسا ہی ہوں؟ یہ الفاظ نہیں تھے امیدوں کا جنازہ تھا۔

''مطلب تم میرے ساتھ ایسے ہی رہو گے۔ اپنا رویہ نہیں بدل سکتے؟'' ان لفظوں نے میرے تن بدن میں آگ لگادی تھی۔

''اچھا پہلے تو نہیں تھے ایسے، وہ محبت کے دعوے، وہ محبت کی شروعات، کس نے کی تھی۔ تمہیں یاد ہے تم نے کہا تھا کہ جو محبت میں کسی کو دھوکا دیتا ہے وہ کبھی غیرت مند نہیں ہوسکتا، اس سے آگے میں کچھ نہیں کہوں گی۔''

میں غصے سے کھڑی ہوئی تھی اور پلاسٹک کی کرسی کو پاؤں سے ٹھوکر لگائی تھی، کرسی میز پر جا لگی اور چائے کے کپ الٹتے الٹتے بچے تھے، جسے میں بغیر پیے وہیں چھوڑ آئی تھی۔

☆☆☆

مالی مشکلات اب حقیقت کا روپ دھار چکی تھیں اور میرا آخری سیمسٹر تھا۔ میں نے پارٹ ٹائم جاب کی تلاش شروع کردی اور تھوڑی بہت محنت کے بعد ایک اکیڈمی میں بطور ٹیچر کام کرنے لگی۔

ادھر احسن سے رابطہ بالکل ختم ہو چکا تھا کیونکہ اس تعلق سے میں اب مزید خود کو اذیت نہیں دے سکتی تھی، اس کے ہونے سے نہ ہونا زیادہ بہتر تھا۔

مجھے کمزور کردیا تھا، ڈیپریشن نے مجھے پاگل کردیا تھا۔ میں خودکشی کی طرف مائل ہونے لگی تھی، مجھے تمام مسائل کی وجہ زندگی لگنے لگی تھی اور اس کا حل زندگی سے چھٹکارا تھا۔ اس وقت میں ٹوٹ چکی تھی اور بکھر رہی تھی۔ میں نے اس ڈیپریشن سے نکلنے کے لیے عجیب کام کرنے شروع کردیے۔ میں محبت کو ہر شخص میں ڈھونڈنے لگی شاید مجھے لگتا تھا، اس طرح میں احسن کو بھول جاؤں گی مگر دل تھا کہ کسی اور کو قبول ہی نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی احسن دل سے جانے کو تیار تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ ہمارا سامنا نہیں ہوتا، ہم ایک ہی ڈیپارٹمنٹ کے تھے اور اس سے بڑھ کر ایک ہی گروپ میں یہ ممکن نہیں تھا کہ ہمارا سامنا نہ ہو۔ میں نے گروپ تبدیل کرلیا اور یونیورسٹی میں جہاں تک ممکن تھا آنا بند کردیا۔

خدا خدا کر کے یونیورسٹی کا سفر تمام ہوا اور میں نے سکھ کا سانس لیا اب اگلا کام جاب کی تلاش تھی، شروعات میں ایک مال میں بطور سیلز گرل کا کام کیا اور پھر بھاگتے دوڑتے یہاں آ گئی اور تب سے یہیں پر ہوں۔ اب ابو بالکل ٹھیک ہیں، مالی مشکلات بھی تقریباً حل ہوچکی ہیں۔ زندگی واپس ٹریک پر آ چکی ہے۔

''اور اس سگریٹ کا کیا ماجرا ہے۔'' میں نے آہستہ سے پوچھا تھا۔

''یہ بھی ان عجیب کاموں میں سے ایک کام ہے جو میں نے ڈیپریشن سے نکلنے کے لیے سرانجام دیے تھے، یہ ایک بری عادت ہے اور میں اسے چھوڑنے کی کوششوں میں ہوں، بس تقریباً چھوڑ چکی ہوں۔''

☆☆☆

''احمر تم بہت اچھے لڑکے ہو، میرے ہم مزاج بھی ہو مگر میں نے تمہارے بارے میں اس لحاظ سے کبھی نہیں سوچا میں تمہیں بس ایک اچھا دوست سمجھتی

ہوں۔

وہ میرے سامنے بیٹھا تحمل سے سب کچھ سن رہا تھا اور میں اسے اپنا موقف اس طرح بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اسے صحیح سے سمجھے اور ہرٹ نہ ہو۔

آج صبح جب میں ناشتہ کر رہی تھی تو احمر کی کال آئی تھی۔

''کیا ہم آج مل سکتے ہیں؟'' اس نے رسماً حال احوال کے بعد پوچھا تھا۔

''ہاں کیوں نہیں، شام کو پارک میں۔'' مگر مجھے یہ بات عجیب لگی تھی کیونکہ ہم روزانہ ایک ساتھ واک کرتے تھے، وقت گزارتے تھے۔

''نہیں ابھی، آج آفس کی چھٹی ہے نا تمہاری؟ اور مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے، میں تمہارے پاس آجاتا ہوں یا کہیں باہر چلتے ہیں۔''

مجھے آج کچھ کام تھے کہیں جانا تھا، لیکن میں نے ہامی بھر لی۔ ''ہاں ٹھیک ہے میرے گھر آجاؤ۔''

اب کون تیار ہو، کپڑے بدلے، میں نے گھر میں ملنا ہی بہتر سمجھا تھا مگر مجھے تجسس نے گھیر لیا تھا کہ کون سی ضروری بات احمر نے کرنی ہے جس کا انتظار وہ شام تک نہیں کر سکتا۔ کہیں وہی بات جو میں سوچ رہی تھی؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہمارے کبھی ایسی بات نہیں ہوئی تھی۔

احمر جب آیا تو تھوڑا نروس لگ رہا تھا جیسے جاب کے شروع میں میں باس سے ہوتی تھی، اس کے الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

''دیکھو ثناء! مجھے لگتا ہے ہم ایک ہی منزل کے راہی ہیں، ہمارے دکھ ایک سے ہیں، ہمارے مزاج میں یکسانیت ہے، ہم ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں اگر ہم باقی کی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ گزاریں تو کیا ہی اچھا ہوگا۔'' وہ نظریں جھکائے بولے جا رہا تھا۔

''ہائے اللہ! وہی بات۔ جس کا خوف تھا۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ احمر ایک اچھا لڑکا نہیں تھا، وہ خوب صورت تھا، سمجھ دار تھا میچور تھا لیکن میں نے ابھی آگے کا نہیں سوچا تھا، کسی حوالے سے بھی۔

اب نروس ہونے کی باری میری تھی اور وہ میرے جواب کا منتظر۔

''میں نے ابھی آگے کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔'' میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہا جائے۔

''نہیں یہ جواب نہیں ہے، کیا میں تمہارے نزدیک ایک اچھا اور آئیڈیل نہیں ہوں، مجھے سچ سچ بتاؤ پلیز جو بات بھی ہے۔''

مجھے اس وقت اس پر ترس آیا تھا۔ یہی حالت کبھی میری تھی میں نے اس کی آنکھوں میں کرب دیکھا تھا، بے بسی دیکھی تھی۔

''بات یہ ہے کہ میری فیملی کو میری ضرورت ہے۔ اس لیے میں نے آگے کا فی الحال کبھی نہیں سوچا، مجھے فیملی کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ میں ان کی امید ہوں، سہارا ہوں۔''

''ہاں تو میں کب کہہ رہا ہوں فیملی سے قطع تعلق کر لو، میری فیملی بھی مجھ پر نظریں ٹکائے کھڑی ہے، ہم اپنی فیملیز کو ساتھ لے کر چلیں گے جس طرح اب لے کر چل رہے ہیں۔ دیکھو ثناء! مجھ پر بھروسا رکھو، ہم دونوں ایک سے ہیں، ہم گردش اوقات کے مارے ہوئے لوگ ہیں، ہماری منزل ایک ہے، ہماری روح وجسم کے درمیان ایک خلا ہے جسے ہم دونوں ہی پورا کر سکتے ہیں کیونکہ ہمارے غم ایک سے ہیں۔ ہمیں کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں آگے بڑھنا ہے، ہم زندگی اکیلے نہیں گزار سکتے ہیں، تو کیا گارنٹی ہے کہ ہمیں ہمارے مزاج کا شخص ملے گا، ہمیں سمجھنے والا ملے گا۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ یہ تمہارا فیصلہ ہوگا اور میں تمہارے فیصلے کا دل سے احترام کروں گا۔''

''میں اس بارے میں سوچوں گی۔''

''ہاں ضرور اور میں تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

پچھلے ہفتے سے میں منتظر ہوں ایک میسج کا ایک کال کا، مگر انتظار ہے کہ مزید بڑھتا جا رہا ہے اور

ساتھ میں امیدیں بھی دم توڑ رہی ہیں۔ کیا میں نے ٹھیک کیا؟ کیا یہ مناسب وقت تھا؟ کیا اس نے واقعی میرے بارے میں کبھی نہیں سوچا؟

ایسے کئی سوالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے، میری بے چینی مزید بڑھتی جا رہی تھی۔

میں ثناء کو پروپوز کر کے پچھتا رہا تھا کیونکہ مجھے اس سے تعلق بھی ٹوٹتا نظر آ رہا تھا۔ کاش میں نے یہ نہ کیا ہوتا میں خود کو کوس رہا تھا۔ میں جس بلا سے پیچھا چھڑاتے، بھاگ کر لاہور آیا تھا وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔

دل پھر کسی در سے امیدیں لگائے بیٹھا تھا، ایک ایسا در جو بند تھا اور جس پر دستک دینے کی مجھ میں مزید سکت نہیں تھی۔

مجھے ایک مدت بعد پھر سے انہی دکھوں کا سامنا تھا جنہوں نے مجھے بکھیر دیا تھا، جس نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا مگر سامنے سے کوئی جواب نہیں آیا تھا اور جواب کا آنا انکار ہی تھا۔

پندرہ دن گزر چکے تھے، اب تو امیدیں بھی ہوا ہو چکی تھیں اور تب ہی میں نے ایک فیصلہ لیا تھا جو میں ایک بار پہلے بھی لے چکا تھا۔

میں اپنے گاؤں کی طرف جاتی بس کا ٹکٹ تھامے بس اسٹینڈ پر کھڑا تھا۔ میں نے ٹکٹ کو غور سے دیکھا اور مسکرایا تھا۔ ایک ایسی ہنسی جس پہ رویا جائے۔ میں نے لاہور کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کیا میں یہ ٹھیک کر رہا ہوں؟ آخر کب تک میں فرار کا رستہ اختیار کرتا رہوں گا، لوگوں سے بھاگتا رہوں گا؟ ایسے کئی سوالات تھے جو مجھے روک رہے تھے، مگر میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ میرے لیے ذہنی سکون اہم تھا جو شاید میں لاہور میں ہمیشہ کے لیے کھونے والا تھا۔

بس جانے کے لیے تیار تھی اور میں کھڑکی سے باہر کی طرف نظریں جمائے بیٹھا تھا جیسے کوئی ابھی آئے گا اور مجھے روک لے گا۔

میرا فیصلہ صحیح تھا، مجھے وہ ساری خوشیاں مل رہی تھیں، جن کے بارے میں صرف سوچا کرتی تھی۔

شروع میں تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے یہ زندگی کا فیصلہ تھا۔ دو ہفتے میں بالکل خاموش رہی، نہ میرے لیے اقرار آسان تھا اور نہ ہی انکار۔ میرے لیے یہ وقت مشکل ترین وقت تھا کیونکہ مجھے احساس ہوا مجھے اس شخص کی عادت ہونے لگی تھی، شام کا وقت تو عذاب ہوتا کیونکہ اس وقت ہم ساتھ ہوتے تھے۔

دل کو جیسے پھر سے ان ہی حالات کا سامنا تھا تبھی میں نے ایک فیصلہ لیا تھا اور میسج پر اپنا جواب بھیج دیا تھا۔

''میں اپنے کمرے کے سامنے لان میں بیٹھی ہوں، چائے کے دو کپ میرے سامنے پڑے ہیں۔ اب آ بھی جاؤ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' میں نے اونچی آواز میں احمر کو بلایا تھا۔

''ہاں بس آ گیا، موبائل چارجنگ پہ لگا لوں۔'' کمرے سے دبی دبی آواز آئی تھی۔ کمرے سے باہر نکلتا احمر مجھے کسی شہزادے جیسا لگا تھا۔

ہم چائے پی کر گھر سے باہر نکل آئے تھے، گھر کے سامنے کھیت تھے، شام کا وقت تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں نے احمر سے مشورے کے بعد جاب چھوڑ دی تھی اور ہاؤس وائف بن گئی تھی۔ گاؤں مجھے بھا گیا تھا۔ یہ گاؤں قدرتی مناظر سے بھرپور تھا اور پھر احمر کی محبت نے اس ماحول کو مزید خوش گوار کر دیا تھا۔

''شکریہ احمر!'' میں نے احسان مند نظروں سے احمر کی طرف دیکھا تھا۔

''کس لیے؟''

''میری سیاہ بختی مٹانے کے لیے۔''

وہ ہنسا تھا۔ ''ہم سب کو کبھی نہ کبھی سیاہ بختی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مشکلات زندگی کا حصہ ہیں مگر یہ سیاہی ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتی اسے ایک نہ ایک دن ختم ہونا ہی ہوتا ہے۔''

☆

pklibrary.com

... چوٹی تک آتی ہے، ایڑیاں زمین سے اٹھاؤ تو پورے وجود کا بوجھ اپنے ہی پیروں پر منتقل کرنا پڑتا ہے۔ پیر کے انگوٹھوں میں وجود کا بوجھ ڈھونے کی سکت کہاں لیکن اُس وقت ہم ناسمجھ تھے۔

مجھے اعتراف ہے کہ ہم نے سکھ کی زمین پر دکھ کے بیج خود بوئے اور پھر زخم زخم ہاتھوں سے دکھ کی فصل کاٹی۔ ہمیں ماں جیسی شفیق ہستی ملی، جس نے ہمیشہ ہم سے دکھ چھپا کر رکھے بالکل فیروزہ ممی کی طرح جو کئی سالوں تک ہماری راہ کے کانٹے چپکے سے ہٹاتی رہیں۔

مگر ہمیں صحیح سے پر اس کا ادراک نہ ہو پایا۔

وہ ہماری زندگی میں اس وقت آئیں، جب ہم اپنی زندگی کے مشکل ترین دنوں سے گزر رہے تھے۔ ہاں مگر وہ صرف دن ہی تو تھے۔ دن گزارے جا سکتے ہیں، مشکل تو سال اور صدیاں ہوتی ہیں جن کو

کشف بلوچ

گیسودان

گزارنے میں کبھی کبھی ہم خود گزر جاتے ہیں۔ اس وقت ہم نے انہیں وہ دیا جو ہمارے اپنوں نے ہماری جھولی میں ڈالا تھا۔

نفرت شدید ترین نفرت۔

سیانے کہتے ہیں آپ دوسروں کو وہی دیتے ہیں جو آپ کے پاس ہوتا ہے۔ نفرت، محبت، حسد یا دھوکا ان میں سے کچھ نہ کچھ ہر کسی کے پاس ہوتا ہے۔

اس وقت مٹھی بھر محبت بھی ہمارے دامن میں نہ تھی۔ اب ایسے حالات میں ہم فیروزہ ممی سے بس نفرت ہی کر سکتے تھے اور کم از کم مجھے تو یہ اعتراف ہے کہ میں نے ان سے جی بھر کر نفرت کی اور ہر بار قریب آنے پر انہیں سختی سے دھتکار دیا۔

فیروزہ ممی ہماری سوتیلی ماں تھیں، میں اور کبیر ان کو اسی نام سے بلاتے تھے۔ ممی بھی شاید ہم نے انہیں ابو کے ڈر سے کہنا شروع کر دیا تھا ورنہ تو ہم انہیں نام سے ہی بلاتے البتہ جمیل انہیں مما ہی کہتا۔

وہ ابو کے دفتر میں کام والے چپڑاسی کی بیٹی تھیں۔ باپ نے غربت کے باعث تین بچوں والے شادی شدہ مرد کے پلے باندھ دیا اور وہ بھی چپ چاپ اس کے ساتھ چل پڑیں۔

کبیر مجھ سے تین سال بڑا تھا۔

جب ماں تیسرے بچے کو جنم دے کر مر گئی تو ابا ان کے کفن میلا ہونے سے قبل ہی نئی بیوی بیاہ لے آئے اور یہیں سے ہمارے بگڑنے کے دن شروع

یہ انسانی فطرت ہے کہ ہم اپنی زندگی کے بُرے پل ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔اس لیے مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے

اس روز گھر میں موجود اکا دکا قریبی رشتہ دار بھی جا چکے تھے اور گھر یک دم کسی اجڑی بیوہ جیسا اداس اور ملول لگنے لگا۔شام ابھی گہری ہوئی تھی کہ ابو ایک اجنبی عورت کو ساتھ لیے گھر میں چلے آئے۔کبیر اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔میں گرم دودھ کو ٹھنڈا کر رہی تھی اور بجیل گیلے بستر پر پڑا اتنے زور سے چلا رہا تھا کہ اس کی گردن کی رگیں پھول گئی تھیں۔

وہ آخری دن تھا جب میں نے اسے گود میں لے کر دودھ پلایا تھا۔اس رات فیروزہ ممی نے اسے روتے ہوئے دیکھا تو میری گود سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔بجیل ان کے سینے سے لگتے ہی چپ ہو گیا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ اس رات ہم نے بجیل کو آخری بار روتے ہوئے دیکھا تھا۔اس کے بعد وہ کبھی نہیں رویا اور اسی رات شاید میرے اور کبیر کے رونے کے دن شروع ہو گئے تھے۔

وہ بجیل کو کندھے پر ڈال کر لوری دینے لگیں۔ ابو نے کہا "اب یہی تمہاری ماں ہے اور تم ہمیشہ ان کی بات ماننا" یہ سن کر ہمارا دل ان کے لیے نفرت سے بھر گیا۔کبیر کروٹ بدل کر سو گیا اور فیڈر سے قطرہ قطرہ گرتا دودھ میرے کپڑوں کو خراب کرنے لگا۔

ہم نے فیروزہ ممی کو اس رات آخری بار سجا سنورا دیکھا۔شاید وہ رات بہت ساری چیزوں کے لیے آخری تھی۔

☆☆☆

اس رات فیروزہ ممی اشتیاق حسین کی بیوی بن کر گھر میں داخل ہوئیں مگر راتوں رات جیسے انہوں نے اپنی کوکھ سے تین بچوں کو ایک ساتھ جنم دے ڈالا،کبیر،قرۃ العین اور بجیل جن کی ذرا سی تکلیف پر آنے والے دنوں میں سب نے دیکھا کہ انہوں نے مرغی کی طرح ہم تینوں کو اپنے پروں میں چھپا لیا مگر کبیر اور میں شرارتی چوزوں کی طرح ان کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے۔ہم دونوں شاید بڑے تھے اور اس حقیقت سے بھی آشنا کہ وہ ہماری سوتیلی ماں ہیں اس لیے ہم ان کے پیار کو ڈھونگ سمجھتے البتہ بجیل نے انہیں اپنی ماں مان لیا۔

آج جب میں اپنی زندگی کے آخری بُرے دن کو آدھا گزار چکی ہوں تو سوچ رہی ہوں کہ اس رات ہمیں بھی بجیل کی طرح انہیں ماں مان لینا چاہیے تھا۔شاید مان لیتے تو آج کبیر زندہ ہوتا اور میں اس مقام پر نہ ہوتی۔

زندگی میں آنے والے حالات چاہے وہ اچھے ہوں یا برے ان کا راستہ نہیں روکنا چاہیے اگر انہیں روکنا آپ کے اختیار میں نہیں تو انہیں اندر داخل ہونے کا راستہ دینا چاہیے اور شاید یہی ہماری پہلی بھول تھی جس سے ہم نے باہر قدم نکالے،سوچا تھا کہ ہم اپنی زندگی بدل کر سب کو دکھا دیں کہ ہمارا فیصلہ کتنا درست تھا مگر اڑان بھرتے ہی ہم ایک گہری دلدل میں گر گئے۔میں یہاں ہم اس لیے استعمال کر رہی ہوں کیونکہ کبیر اور میری کہانی بالکل ایک جیسے آغاز سے شروع ہوئی اور شاید اب انجام بھی ایک جیسا ہونے والا تھا۔

مجھے وہ دن یاد ہے جب میرا میٹرک مکمل ہو چکا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ آگے کیا کروں کیونکہ اس وقت میرے پاس دو آپشن تھے۔ایک یہ کہ اپنی تعلیم جاری رکھوں اور دوسرا وہی جو میرا دل کہہ رہا تھا۔ ہمارے گھر کے آنگن میں جامن کا پیڑ تھا میں اس دن جامن کے پیڑ پر لگے جھولے پر بیٹھی جھولا جھول رہی تھی۔میرے سامنے فیروزہ ممی دیوار کے ساتھ بچھے تخت پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں جبکہ بجیل ہم دونوں سے قدرے دور کرسی ڈالے اپنا ہوم ورک

pklibrary.com

تب ہی دروازہ کھلا، کبیر غصے کی حالت میں اندر داخل ہوا اور اونچی آواز میں چلانے لگا۔ فیروزہ ممی نے اسے چپ ہونے کو کہا تو وہ اور زیادہ اونچی آواز میں چلا کر کہنے لگا۔

"مجھے کچھ نہیں پتا، مجھے ابھی اور اسی وقت اپنی ماں کا زیور چاہیے۔"

"مگر کس لیے بچے؟"

فیروزہ ممی نے اس سے پوچھا تھا۔ ہماری بے اعتنائی کے باوجود انہوں نے اپنے لہجے کو تبدیل نہ کیا ورنہ سوتیلی ماؤں کے ظلم و ستم کے قصے ہم سب نے سن رکھے تھے بلکہ ہمارے خیر خواہ لوگ اکثر ایسی کہانیاں نمک مرچ لگا کر ہمارے سامنے بیان کرتے اور ہم کڑھ کر رہ جاتے۔ اس وقت ہمیں ان کا نرم لہجہ اور شیریں باتیں بھی ان کی کوئی چال لگا کرتی تھیں۔

"میں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر موبائل کی دوکان کھولنا چاہتا ہوں۔" اس نے فیروزہ ممی کو جواب دیا۔

اس روز میں نے پہلی بار کبیر کو غور سے دیکھا۔ لمبا چوڑا مضبوط جسم، اس نے کتنی جلدی قد کاٹھ نکال لیا تھا۔

میں اسے حیرت سے تکنے لگی۔

کبیر بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا، فیروزہ ممی کا کیا بھروسہ کب مکان اپنے نام کروا کے ہمیں باہر کا رستہ دکھا دیں۔ کچھ تو ہمارے پاس بھی ہونا چاہیے۔ دیکھو تو کتنی سمجھداری کی بات کر رہا ہے۔

میں نے دل میں سوچا اور پھر فیروزہ ممی کے چہرے پر نظر ڈالی وہ اب بھی تذبذب کا شکار تھیں۔

"مگر بچے وہ زیور ہم نے عینی کی شادی کے لیے رکھا ہوا ہے اور ویسے بھی اگر تمہاری دوکان نہ چلی تو......؟"

انہوں نے اسے سمجھاتے ہوئے بتایا جسے سن کر اس کا چہرہ یک دم تاریک ہوا اور پھر غصے سے لال ہو گیا۔

"میں ابھی سے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ عینی اور جمیل کو آپ کے بچے ہوئے ٹکڑوں پر نہ پلنا پڑے۔"

کبیر نے جب دیکھا کہ اب تک فیروزہ ممی نے ہامی نہیں بھری تو اس نے یہ کہتے ہوئے قدم آگے بڑھائے اور ٹوکری میں رکھی چھری اٹھا کر خطرناک ارادے سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"نہیں کبیر...... نہیں۔" میں فوراً دونوں کے بیچ آئی۔

"کیا آپ میرے بھائی کی جان لینا چاہتی ہیں؟"

میں نے انہیں خونخوار نظروں سے گھورا۔ آخر وہ میرا بھائی تھا۔ جان سے عزیز بھائی جو یقیناً ہمارے بھلے کے لیے سوچ رہا تھا۔ میں چپ کیسے رہ سکتی تھی۔

"مگر عینی بچے! میں نے وہ زیور تمہارے لیے۔"

انہوں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ کبیر زچ ہو کر دو قدم آگے ہوا۔ تب ہی میں نے آگے بڑھ کر فیروزہ ممی کو تخت پر دھکا دے کر گرا دیا۔

"مجھے زیور اپنے بھائی کی جان سے زیادہ عزیز نہیں ہے۔ میں اپنی خوشی سے زیور کبیر کو دینا چاہتی ہوں اور ویسے بھی میں شادی کے جھنجھٹ میں پڑنے کے بجائے ایک کلینک میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔ پلیز ہمیں اڑنے کے لیے پنکھ کھولنے دیں۔ اب ہم بچے نہیں رہے۔"

کچھ واقعے ہمارے لیے بڑے اچھے ثابت ہوتے ہیں جیسے یہ واقعہ جس نے لمحوں میں مجھ سے فیصلہ کروا لیا۔ ورنہ میں کئی روز تک یہ بات کسی کو نہ بتا پاتی کہ مجھے آگے نہیں پڑھنا بلکہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے۔

یہ دن مجھے اپنی زندگی کا بہترین دن لگا تھا مگر آج احساس ہو رہا ہے کہ ہماری بربادی اسی دن سے شروع ہوئی تھی۔

اسی وقت دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔

pklibrary.com

شاید انہوں نے سب کچھ سن بھی لیا ہو۔ میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ کچھ بھی تھا مگر اب بھی ابو سے ڈر لگتا تھا۔

"ہاں فیروزہ! یہ دونوں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، ان کے راستے سے ہٹ جاؤ اور انہیں اڑنے سے مت روکو، کیونکہ یہ ہم دونوں ۔۔۔ سے بھی بڑے ہو گئے ہیں۔" میری ابو کی طرف پیٹھ تھی مگر میں بنا دیکھے بتا سکتی تھی کہ وہ کتنے غصے میں ہوں گے۔

"اسے زیور دے دو اور انتظار کرو کہ کب یہ اپنی ماں کی آخری نشانی بھی اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ گنوا کر خالی ہاتھ واپس لوٹ کر آتا ہے۔" انہوں نے خاموش کھڑی فیروزہ ممی سے کہا اور یہ سن کر کبیر کے ہاتھ سے چھری گر پڑی۔

"اور ہاں دوسری کو بھی کہہ دو کہ اڑنے کے لیے جس آسمان کا انتخاب کر لیا ہے کبھی وہی اس پر گر پڑے تو واپس یہاں آنے کی کوشش نہ کرے۔"

اس روز ابو نے ہمیں بس تھپڑ نہیں مارا تھا باقی تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی شاید تھپڑ مار لیتے تو اچھا ہوتا کیونکہ اگر ہم اس روز ان کا تھپڑ کھا لیتے تو زمانے بھر کے تھپڑ نہ کھانے پڑتے۔۔

☆☆☆

پھر ہم دونوں نے اپنی من پسند راہیں منتخب کر لیں۔ کبیر کو دوکان کھولنے کے لیے رقم مل گئی اور مجھے کلینک میں جاب کرنے کی اجازت۔

میری دوست دانیہ بھی وہیں جاب کرتی تھی۔ وہی تو تھی جو میری انگلی تھام کر مجھے میرے خوابوں کے راستوں تک لے گئی۔ کلینک میں جاب حاصل کرنے کے مجھے چھ ماہ کا ایک کورس کرنا پڑا۔ اس دوران مجھے تنخواہ نہیں ملتی تھی مگر دانیہ صحیح معنوں میں میری خیر خواہ ثابت ہوئی اور اس نے کورس کے دوران میری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔

اس دوران ہم دونوں بس سونے کے وقت گھر آتے، اچھا برا جو بھی فیروزہ ممی ہمارے سامنے رکھ

اڑنے کے خواب دیکھنے لگتے۔ اس دن کے بعد ابو نے ہم سے کوئی بات نہ کی اگر ہم سے سامنا ہو جاتا تو منہ پھیر کر پاس سے گزر جاتے مگر فیروزہ ممی بہت ہی ڈھیٹ تھیں۔

اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود وہ ہماری خیر خواہ ہونے کا ناٹک کرتی رہیں۔ ہماری فکر کرنا اور بار بار ہمیں سمجھانا کہ دیکھو کسی غلط راستے کا انتخاب نہ کر بیٹھنا۔ یہ سب ہمیں ان کا ناٹک ہی تو لگتا تھا۔

مگر ان دنوں ہم دونوں پر کچھ کر دکھانے کی دھن سوار تھی۔ ہم ان کی نصیحت کان لپیٹے سنتے رہے اور آگے بڑھتے گئے اتنا آگے کہ پھر پلٹ کر آنا مشکل ہو گیا۔

کبیر تو پھر بھی مجھ سے خوش قسمت نکلا، مر کر ہی سہی مگر ابو کا الوداعی بوسہ نصیب ہو گیا۔

☆☆☆

اس دن میری ڈیوٹی تھی۔ دانیہ کلینک نہ آئی تھی اس لیے کام اتنا زیادہ تھا کہ مجھے پتا ہی نہ چلا کہ کب شام ہو گئی۔ اس سے پہلے میں کام کے دوران اپنا موبائل چیک کر لیتی تھی مگر اس روز کاموں میں ایسی الجھی کہ موبائل چیک کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

شام پانچ بجے میں گھر کے دروازے پر پہنچی تو لوگوں کا ایک ہجوم ہمارے گھر کے باہر جمع تھا۔ لڑکے اور مرد دیوار سے یوں ۔۔۔ جھانک رہے تھے جیسے اندر کوئی تماشا لگا ہوا تھا۔

میں ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھی تو جامن کے پیڑ کے نیچے کبیر آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ ایک سفید چادر اوڑھے جس پر خون کے دھبے تھے۔

اس کے چہرے پر بہت ساری خراشیں تھیں۔ ابو چپ چاپ پاس بیٹھے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ میں نے بے ساختہ فیروزہ ممی کو تلاش کیا اور پھر ناکام ہو کر دیوار سے جا لگی۔

"ہوا کیا تھا بہن! میں تو ابھی ابھی یہاں آئی ہوں۔؟"

pklibrary.com

پہنچا۔

''مت پوچھو بہن۔'' دوسری دکھی لہجے میں بتانے لگی۔

''ہائے بے چارہ بن ماں کا بچہ آوارہ دوستوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ میرا میاں بتا رہا تھا کہ شروع شروع میں دوکان میں منافع ہوا تو سارے دوستوں نے مل بانٹ لیا مگر نقصان ہونے لگا تو سارے دوست کہیں بھاگ گئے اور کبیر بے چارہ قرض خواہوں کو جواب دیتے دیتے تھک گیا تو آج دوپہر کو اپنی دوکان میں خودکشی کرلی۔''

میرے قریب کھڑی کسی عورت نے دوسری عورت سے کہا تھا اور میرے لیے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔

''یہ کیا کر دیا کبیر؟''

میری چیخ سن کر فیروزہ ممی تیزی سے میری طرف بڑھیں اور مجھے اپنے سینے میں چھپالیا۔

''مجھے معاف کر دینا عینی میں کبیر کو نہ بچا سکی، یہ سب میرا قصور ہے، ہائے میں کتنی لاپروا ماں ہوں۔''

وہ یہ کہہ کر رو پڑیں اور مجھے وہ دن یاد آ گیا جب کبیر ہاتھ میں چھری لیے دوکان کے لیے زیور مانگ رہا تھا۔ میری نظریں بے ساختہ جامن کے پیڑ پر جا ٹکیں، جہاں پیڑ کی شاخوں کی آخری پھننگوں پر ہمارے کہے جملے ابھی تک اٹکے ہوئے تھے۔

''اس چار دیواری کے اندر بہت گھٹن ہے، کسی درز سے باہر کی تازہ ہوا نہیں آ پاتی پلیز ہمیں اڑنے کے لیے پنکھ کھولنے دیں۔ اب ہم بچے نہیں رہے۔''

آہ کبیر! یہ تم نے کیا کیا؟ یہ کس جہان کی اڑان بھرلی پگلے۔''

میں زور زور سے چلانے لگی۔ اسی وقت کہیں سے بجیل نکل کر ہماری طرف بڑھا اور ہم تینوں ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگے۔

☆☆☆

سے نکل پڑے، ہم اس خوش گمانی میں تھے کہ بہار کو ہیشگی حاصل ہے مگر جب خزاں کی خشک ہوا چلی تو سب سے پہلے خوش گمانی کے پتے گرے اور پھر زندگی کسی بوڑھے شجر کی مانند ہوگئی۔

مجھے کلینک جوائن کیے ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے۔ ابتدائی کورس ختم ہونے کے بعد مجھے پہلی تنخواہ ملی تو میں ہواؤں میں اڑنے لگی۔ گھر آئی تو ایک ایسی ہی خوشی کبیر کے چہرے پر بھی تھی۔ اس نے چپکے سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چند نوٹ دکھا کر مسکرانے لگا۔ اس کی دوکان بھی چل پڑی تھی۔

اس شام ہم دیر تک بازار میں گھومتے رہے۔ میں، بجیل اور کبیر۔ مجھے یوں لگا جیسے یہی وہ زندگی ہو جو ہم جینا چاہتے تھے۔ ہر فکر اور ٹینشن سے آزاد۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے سڑکوں پر آوارہ گھومتے رہے، کبیر نے ہمیں ہر وہ چیز کھلائی جس کی طرف ہم للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہوتے۔

مگر وہ کھلکھلاتی ہوئی شام اس وقت اداس ہو گئی جب بجیل نے یک دم کولڈ ڈرنک پرے کھسکا دی۔

''کاش ہم ممی اور ابو کو بھی ساتھ لے آتے۔''

وہ شاید فیروزہ ممی اور ابو کی بات کر رہا تھا مگر میں اور کبیر نے اس لمحے بس ابو کے ساتھ اپنی ماں کا تصور کیا۔ وہ شہر کا بڑا اور مہنگا فوڈ پوائنٹ تھا، روشنیوں سے جگمگاتا لیکن یک دم جیسے وہ اندھیروں میں ڈوب گیا۔

ویسے ہی جیسے کبیر کے بعد ہماری زندگی ہوگئی تھی۔ شاید اب مجھے میری زندگی کہنا چاہیے تھا کیونکہ اب کبیر نہیں رہا تھا۔ اس حادثے نے جیسے ہم سے ہمارا سب کچھ چھین لیا تھا۔ ابو کئی روز تک ہسپتال میں رہے، واپس آئے تو کئی کئی گھنٹے گم صم حالت میں ایک کونے میں گزار دیتے، فیروزہ ممی کام کرتے ہوئے مسلسل روتی رہتیں، ان کے پاس رکھا ٹشو باکس بار بار خالی ہو جاتا۔ گھر میں سناٹا بولنے لگا۔

pklibrary.com

وہ ڈیوٹی پر نہیں آرہی تھی۔ کام اتنا زیادہ تھا کہ مجھے اپنا ہوش بھی نہیں تھا۔

''دیکھو اس حادثے سے نکلنا اتنا آسان نہیں مگر تم خود کو کاموں میں الجھائے رکھو۔''

یہ ڈاکٹر طارق تھے میں جن کے کلینک میں کام کرتی تھی۔ ہمارے بیچ کبھی اتنی زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تھی بس زیادہ تر کام کی باتیں مگر جب سے انہوں نے کبیر کے حادثے کے بارے میں سنا تھا وہ میرے قریب ہونے لگے۔

اکثر مجھے اداس دیکھتے تو چائے کا کپ لیے میرے پاس آ بیٹھتے۔ جب تک کوئی مریض نہ آجاتا وہ میرے پاس بیٹھے رہتے۔ یہ ان کے سمجھانے کا نتیجہ تھا کہ میں بہلنے لگی۔ البتہ گھر جانے کو دل نہیں کرتا تھا۔

میرا دل چاہتا وہ یونہی میرے پاس بیٹھے رہیں اور میں ان کو خاموشی سے سنتی رہوں مگر پھر جلد ہی دانیہ کلینک واپس آ گئی اور اب ہمارے بیچ پہلے جیسی اجنبیت حائل ہوگئی۔ میرا دل یکدم ہر چیز سے بے زار ہوگیا اور میں کچھ دن کی چھٹی لے کر گھر بیٹھ گئی۔

پھر انہی دنوں ڈاکٹر طارق کی کال آئی۔ ان کا لہجہ خفگی لیے ہوئے تھا۔ میری جان پر بن گئی۔ کچھ دن ہماری کال پر ہی بات چیت ہوتی رہی اور پھر انہوں نے مجھے کلینک آنے کے لیے کہا اور میں اگلے روز کلینک چلی گئی۔

اب ہم دانیہ کی غیر موجودگی میں ڈھیروں باتیں کرتے بلکہ گھر آنے کے بعد وہ مجھے کال کر لیتے جو اکثر رات گئے تک جاری رہتی۔

پھر پتا نہیں چلا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب گئے کہ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے پسند کرنے لگے ہیں اور ہمیشہ کے لیے میرے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔

اُن دنوں روکھی روکھی سی زندگی اچھی لگنے لگی۔ کلینک میں رش کی وجہ سے زیادہ بات چیت نہ ہو

ابھی کچھ وجوہات کی وجہ سے طارق نے منع کیا تھا کہ یہ بات کسی کو مت بتانا۔ میں نے بھی ان کی خفگی کے باعث کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ فیروزہ ممی نے کئی بار پوچھنے کی کوشش کی مگر میں ٹال گئی۔ وہ بھی مجھے زندگی کی طرف لوٹتا دیکھ کر خوش تھیں۔ ویسے بھی ابھی یہ کسی کو بتانے کے لیے مناسب وقت نہیں تھا۔

مگر ایک شام ہوٹل سے نکلتے وقت دانیہ نے ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لیا۔ اگلے روز میں کلینک گئی تو وہ مجھ پر برس پڑی۔

''عینی کیا پاگل ہوگئی ہو۔ تم یہ کیا کرتی پھر رہی ہو۔''

وہ کچھ دیر تک مجھے بے بھاؤ کی سناتی رہی، جب میں تھک گئی تو میں نے اسے کچھ بتانے کا فیصلہ کیا۔

''دانیہ! ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔''

تب میں نے جھجکتے ہوئے اسے آدھی ادھوری بات بتادی جسے سن کر دانیہ حیران رہ گئی اور مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے میں نے بہت انہونی بات کہہ دی ہو۔

''تمہیں ۔۔۔ پیار کے لیے یہی ایک شخص ملا تھا۔''

مجھے اس کی بات بہت بری لگی۔

''کیوں کیا کمی ہے طارق میں۔؟''

میں نے تنک کر کہا۔ وہ میری دوست تھی مگر سچ تو یہ تھا کہ مجھے اس کا اس انداز میں بات کرنا برا لگ رہا تھا۔

''اچھا تو تمہیں لگتا ہے کہ وہ تم سے سچی محبت کرتا ہے اور اس امیر کبیر لڑکی کا کیا بنے گا جس کے باپ کی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے وہ دن رات گدھوں کی طرح کما رہا ہے۔ تمہیں لگتا ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر تم سے شادی کرے گا، عقل کو ہاتھ مارو لڑکی۔ تم میں ایسا کیا ہے؟''

اس نے مجھے طنزیہ انداز میں دیکھا اور یہ سن کر

"نہیں..... ایسا نہیں ہوسکتا....."

مجھے یوں لگا جیسے ابھی رو دوں گی' شاید کوئی آنسو بھی آنکھ سے ٹپکا تھا۔

پھر ایک روز دانیہ نے مجھے وہ منظر بھی دکھا دیا جس میں ڈاکٹر طارق اس لڑکی کے ساتھ تھے۔ میں اور دانیہ اسی ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ طارق کی ہماری طرف پشت تھی جبکہ ادائیں دکھائی ہوئی وہ لڑکی بالکل میرے سامنے بیٹھی تھی' اسٹائلش سا ڈریس پہنے، ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے، سامنے میز پر اس کی چیزیں پڑی تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک مہنگی چیز۔

دانیہ نے ٹھیک کہا تھا، اس کے مقابلے میں میرے پاس ایسا کیا تھا؟

کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ میری آنکھوں کے پیالے آنسوؤں سے بھرنے لگے۔ میں نے آنسو اندر اتار کر طارق کی طرف دیکھا۔

وہ طارق ہی تھا۔ اس کی خوب صورتی کے گن گاتا ہوا اور آنے والے حسین دنوں کے لیے منصوبے بناتا ہوا، مجھے اس کا بلاوجہ ہنسنا اور حتی کہ اس کی آواز بھی زہر لگ رہی تھی۔

شاید میں اس کا ٹائم پاس تھی۔ جب وہ تھک جاتا تو تھکن اتارنے میرے پاس آجاتا۔ میں تو بس ایک عارضی پڑاؤ تھی، جہاں وہ گھڑی دو گھڑی کے لیے ٹھہرتا اور پھر سے تازہ دم ہو کر اپنی منزل کی جانب چل پڑتا۔ اصل منزل تو یہی لڑکی تھی۔

دانیہ خاموشی سے کھانا کھا رہی تھی اور یہ دیکھنے کے بعد میرے لیے وہاں مزید ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ زندگی پھر کس موڑ پر لے آئی تھی۔ میں نے خود کو سمیٹنا سیکھ لیا تھا کہ زندگی نے مجھے پھر بکھیر کر رکھ دیا۔

☆☆☆

یہ کیسی تیز ہوا چلی تھی جو میرے سارے خواب اڑا کر لے گئی۔ میں بستر سے لگ گئی اور اندر ہی اندر گھلنے لگی۔ سب کو لگتا کہ میں کبیر کو بھول نہیں پا رہی، وہ مجھے بہلانے کی کوشش کرنے لگے۔ نجیل مجھ نئی چیزیں بنا کر مجھے زبردستی کھلانے کی کوشش کرتیں۔

مگر میں سارا دن آنکھیں موندے لیٹی رہتی۔ اکثر اندر آنے والا مجھے سوتا دیکھ کر دروازے سے پلٹ جاتا مگر میرے اندر ایک آگ جل رہی تھی۔ میں کبیر کی طرح بزدل نہیں تھی اور مجھے یہ بھی معلوم ہو چلا تھا کہ میرے لیے اب اپنے خوابوں کو پانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو گیا تھا۔

اس روز ابو نے ٹھیک کہا تھا:

"اور ہاں دوسری کو بھی کہہ دو کہ اُڑنے کے لیے جس آسمان کا انتخاب کر لیا ہے، بھی وہی اس پر گر پڑے تو واپس یہاں آنے کی کوشش نہ کرے۔"

میں کیوں واپس آ گئی۔ میں ساری رات روتی رہی صبح ہوئی تو خالی ذہن اپنا پرس اٹھا کلینک آ گئی۔

یہ سوچنے میں مجھے صرف دس منٹ لگے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے بس اتنا معلوم تھا کہ مجھے ڈاکٹر طارق کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کرنا تھا۔ تبھی میں نے سوچ لیا کہ مجھے ان سے ہر حال میں بدلہ لینا ہے چاہے اس میں میرا اپنا نقصان کیوں نہ ہو جائے۔

شاید یہ ان راستوں کو خیر باد کہنے کا وقت ہے۔ جن پر چلنے کی چاہ میں، میں جوتے گھر پر چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ اگرچہ خواہشوں کی رنگین تتلیوں کے پیچھے دوڑتے ہوئے میں بہت دور نکل آئی مگر اب میں بھاگتے بھاگتے تھک چکی تھی۔

☆☆☆

آج کے دن جب میں اپنی زندگی کے آخری برے دن کو آدھا گزار چکی ہوں اور اپنے قاتل اور خود کے لیے موت کا پھندا تیار کر چکی ہوں تو مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے کہ میں کچھ غلط کرنے جا رہی ہوں کیونکہ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے سکھ کی زمین پر دکھ کے بیج خود بوئے اور پھر زخم زخم ہاتھوں سے دکھ کی فصل کاٹی۔ ہمیں ماں جیسی شفیق ہستی ملی، جس نے ہمیشہ ہم سے دکھ چھپا کر رکھے بالکل فیروزہ ممی کی

pklibrary.com

سے ہٹاتی رہیں مگر ہمیں صحیح سے پراس کا ادراک نہ ہو پایا۔

ایک روز جب فیروزہ ممی مجھ سے کبیر کی باتیں کر رہی تھیں تب انہوں نے کہا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ میں نے تم تینوں کو جنم نہیں دیا مگر میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر چاہا۔ جب جب تم لوگوں پر ذرا سی بھی آنچ آئی میرا دل تڑپنے لگا مگر تم دونوں نے کبھی مجھے اپنی ماں نہیں سمجھا اور نہ ہی کسی تکلیف کے وقت مجھے پکارا۔''

اس روز کبیر کو ہم سے بچھڑے چوتھا دن تھا، بہت درد اور تکلیف کے باوجود میں طنزیہ انداز میں ہنس دی۔

''ماں ہوتیں تو اس روز کبیر کی تکلیف پر آپ کا دل تڑپا ہوتا۔'' میری بات پر وہ مجھے بے یقینی سے دیکھنے لگیں اور پھر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''فرصت ملے تو اپنا موبائل چیک کر لینا، میں اسے کئی دنوں سے پریشان دیکھ رہی تھی، کئی بار بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس روز جب کبیر گھر سے نکلا اس وقت سے لے کر اس کے گھر آنے تک میں نے تمہیں مسلسل فون کیے تھے، یہ بتانے کے لیے کہ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے ہو سکے تو کبیر کی خیریت معلوم کر لو کیونکہ وہ کبھی میری کال نہیں اٹھاتا تھا۔''

میں چپ چاپ ان کا چہرہ تکے گئی کیونکہ میں جانتی تھی کہ وہ سچ کہہ رہی تھیں کیونکہ کبیر ایسا ہی تھا۔

''پتا ہے' میں بھی تمہاری عمر کی تھی جب میرا باپ دوسری بیاہ لایا اور وہ صحیح معنوں میں سوتیلی ماں تھی، میں نے قصے کہانیوں میں پڑھے واقعات سچ ہوتے دیکھے مگر میں نے انہیں وہ دیا جو میرے پاس تھا۔ محبت..... شدید محبت.....

پتا ہے' انہوں نے میرے راستے میں مشکلات کے اتنے وزنی پتھر رکھ دیے کہ ان کو ہٹاتے ہٹاتے میرے ہاتھ زخمی ہو گئے مگر میں کبھی ان سے بد انتخاب کیا۔''

''پتا ہے عینی بچے جب میں نے پہلی بار تم تینوں کو دیکھا تو سوچ لیا کہ کبھی تم لوگوں کو احساس نہیں ہونے دوں گی کہ میں تمہاری سوتیلی ماں ہوں مگر تم دونوں نے مجھے بہت مایوس کیا لیکن سچ کہوں تو میں بھی تم لوگوں سے بدگمان نہیں ہوئی، تم دونوں نے ہمارے تعلق کے بیچ نفرت کے بھاری پتھر رکھ دیے جنہیں میں آج تک ہٹا رہی ہوں مگر میں اتنا کہوں گی کہ میری محبت گپت دان ہے۔

گپت دان۔ چپکے سے خیرات کر دینے والی محبت۔ جو جتائی نہیں ہے اور نہ ہی دکھاوا ہے۔ ایسی محبت جو بھی کسی سے واپسی کا تقاضا نہیں کرتی۔''

''عینی بچے! میری دعا ہے کہ تم اپنے خواب پا لو لیکن اگر کبھی تمہاری زندگی میں مشکل وقت آئے تو کبیر جیسی بزدلی مت دکھانا بلکہ مجھے صرف ایک بار دل سے پکار لینا۔''

فیروزہ ممی اس روز یہ کہہ کر میرے پاس سے اٹھ کر چلی گئی تھیں اور میرے اندر جیسے ایک خالی پن بھرتا گیا۔

بالکل وہی کیفیت اب مجھ پر اُترتی جا رہی تھی اور میرا دل کیا کہ میں زور زور سے چلا کر فیروزہ ممی کو پکاروں۔ بس آخری بار انہیں کہوں۔

''ماں ہماری نفرت ہار گئی اور آپ کی محبت جیت گئی۔'' اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ آگے ایک مشکل وقت میرا بھی منتظر ہے۔

اور اب اس وقت یہ سوچ کر میرے آنسو بہتے جا رہے ہیں تبھی میں نے بے اختیاری میں گھر کا نمبر ملایا اور پھر اسی تیزی سے کاٹ دیا— اسی وقت میرا فون بجنے لگا اور یوں تواتر سے کہ مجھے کال اٹھانی پڑی۔ مجھ سے کچھ بولا نہیں گیا مگر ایک سسکی منہ سے نکل گئی جسے سن کر فیروزہ ممی تڑپ اٹھیں۔

''عینی بچے! اب میرے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں بچا، دیکھ کچھ غلط مت کرنا اور واپس کر

عنبرین ابدال

تو میری راہ گزر

"میں جب محبت کے جذبے کو مانتی ہی نہیں تو پھر محبت کرنے کا سوال کہاں سے پیدا ہوگیا۔" شفا نے اپنے سامنے کھیلتے بچوں پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنی دانست میں بہت عام سے لہجے میں کہا تھا مگر اس کا استہزائیہ لہجہ حاسم کو سرتاپیر جلا کر خاکستر کر گیا تھا۔

"تم اسے نہ ماننے سے محبت کا وجود ختم تھوڑی ہو جائے گا۔ محبت تو انسان کی مٹی میں گھلی ہوئی ہے اور چاہے جانا تو آدم وحوا کی سرشت میں ہے۔ ہم چاہ کر بھی محبت کی شیرینی کو خود سے الگ نہیں کر سکتے۔ پھر تم کیوں محبت کی اس مٹھاس سے مجھے زندگی بھر کے لیے محروم کرنا چاہتی ہو۔" اب کے حاسم کے لہجے میں یاسیت در آئی تھی۔

شفا نے نظروں کا زاویہ بدلا اور خود سے ذرا فاصلے پر بیٹھے حاسم کو دیکھا۔ دماغ دل کی ساری دلیلوں کو رد کیے جا رہا تھا اور اس کا دل.....

شفا نے اپنے دل کو ٹٹولا جو کسی ضدی بچے کی طرح ضد پر اڑا ہوا تھا اور دماغ میں مسلسل ناں ناں کی تکرار بڑھتی جا رہی تھی اور شفا امین دماغ کی ہی سنتی تھی۔ بالآخر اس نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کر ہی دیئے۔

"تم بڑے شوق سے محبت کر سکتے ہو لیکن تم مجھے بھی قائل کرنے کی کوشش نہ کرو۔" شفا نے رک کر تائیدی نظروں سے حاسم کی سمت دیکھا جو لب بھینچے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مکمل ناول

pklibrary.com

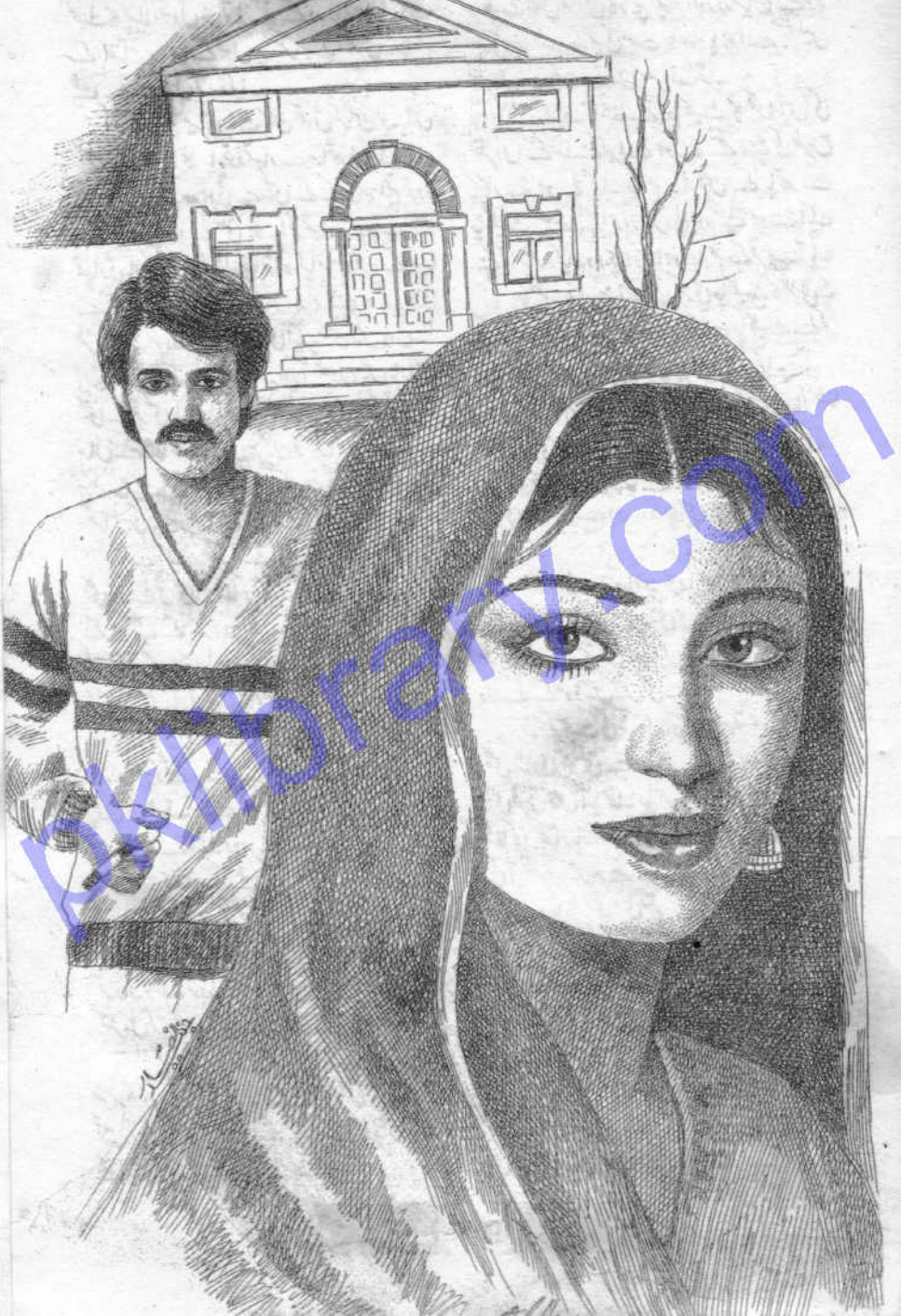
pklibrary.com

محبت کا پہلا اصول ہی توڑنے کے درپے ہو۔'' بات کے اختتام پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔ حاسم غصے سے پہلو بدل کر رہ گیا۔

''شفا! تم میری بات کان کھول کر سن لو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ یا خود تمہارے ساتھ زیادتی نہیں کرنے دوں گا۔ حد ہوتی ہے، کسی کے کیے کی سزا تم خود کو یا پھر مجھے کیسے دے سکتی ہو۔ اگر تمہارے باپ نے تمہاری ماں کے ساتھ غلط کیا تھا تو کیا ہر مرد ان کے جیسا ہے۔ جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، اسی طرح سب مردوں کی فطرت بھی ایک جیسی نہیں ہوتی۔''

حاسم کے لہجے میں غصہ اور آنکھوں میں ناراضی تھی۔ آخر کسی بات کی حد بھی ہوتی ہے۔ وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے شفا کو منانے کی ہر ممکن کوشش کر چکا تھا۔ اسے ہر طرح سے اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی ناں، ہاں میں نہیں بدلی تھی۔

اب تو اسے غصہ آنے کے ساتھ ساتھ جھنجلاہٹ بھی ہونے لگی تھی مگر شفا کو تو جیسے کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اور انداز میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جو اول روز کا جواب تھا، وہی آج تھا۔

''میں نے کب کہا، تم میرے باپ جیسے ہو۔ تم بلاوجہ خود کو ان سے کیوں کمپیئر کرنے لگتے ہو؟'' شفا نے حاسم کو گھورتے ہوئے قدرے خفگی سے کہا۔ پھر بچوں کی طرف دیکھنے لگی جو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے ایک دوسرے کو پکڑنے کی کوشش میں ہلکان ہوئے جا رہے تھے۔

''تو پھر تم میری محبت قبول کیوں نہیں کر لیتی ہو۔ کیا تم ساری زندگی شادی نہیں کرو گی۔ ساری عمر گھر بیٹھ کر خالہ کو تنگ کرو گی؟'' حاسم نے اب کے اپنے غصے کو کنٹرول کر کے رسانیت بھرے انداز میں استفسار کیا۔

''کیوں نہیں کروں گی شادی؟ ارے بھئی میں شادی ضرور کروں گی۔ اپنا گھر بناؤں گی لیکن بس میں کبھی محبت نہیں کروں گی تاکہ اگر کوئی مجھے بیچ راہ میں چھوڑ بھی جائے تو مجھے زیادہ تکلیف نہ ہو، زیادہ اذیت نہ ہو۔''

چاکلیٹ نکال کر اس کا ریپر پھاڑا اور درمیان سے توڑ کر آدھا حصہ حاسم کی سمت بڑھا دیا جو اسے خشمگیں نظروں سے گھورنے میں مصروف تھا۔

''لے لو۔'' شفا نے چاکلیٹ کا ٹکڑا اس کی نظروں کے سامنے لہراتے ہوئے ننھے بچے کی طرح پچکارتے ہوئے کہا۔ حاسم نے اس کے ہاتھ سے چاکلیٹ چھیننے کے انداز میں لی اور کھیلتے ہوئے ایک بچے کو اشارہ کیا۔ وہ بچہ دوڑتا ہوا حاسم کے قریب آیا۔

حاسم نے اپنے ہاتھ میں پکڑی چاکلیٹ کا ٹکڑا بچے کی طرف بڑھایا۔ بچہ اس کے ہاتھ سے چاکلیٹ لے کر خوشی خوشی واپس اپنے دوستوں کی سمت بڑھ گیا۔

''اگر نہیں کھانی تھی تو مجھے واپس کر دیتے۔'' شفا نے منہ بنا کر دہائی دی۔

''تم اپنے لفظوں کے کڑوے کسیلے ذائقے کو یہ ذرا سی مٹھاس سے دور کرنا چاہتی ہو۔'' حاسم نے چبا چبا کر کہا۔

شفا نے بے ساختہ ہی اپنی ہنسی کا گلا گھونٹ ڈالا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی حاسم کو مزید طیش دلا سکتی تھی اور اس وقت شفا اسے مزید تاؤ دلانے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''اگر محبت کی شادی ہو سکتی ہے تو محبت کے بغیر بھی شادی ہو سکتی ہے۔'' اس کے انداز میں رتی بھر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ حاسم کتنی ہی دیر بنا کچھ بولے شفا کو دیکھتا رہا۔ شفا نے گردن کو ذرا سا موڑا اور حاسم کی آنکھوں میں دیکھا۔

وہ چاہ کر بھی اپنی نظریں حاسم کی نظروں سے ہٹا نہیں پائی تھی۔ حاسم کی آنکھوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔ شفا کو اپنا دل گہری کھائی میں گرتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ چند لمحے بالکل بھی نہیں بول پائی تھی مگر جلد ہی وہ اس سحر سے باہر آ گئی۔

''حاسم! تم میری بات.....'' شفا نے کہتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ حاسم نے اگلے ہی لمحے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ

pkibrary.com

شفا نے لمحہ بہ لمحہ دور جاتے حاسم کی پشت کو دیکھا اور پھر ہاتھ میں پکڑی چاکلیٹ کو واپس ریپر میں لپیٹ کر اپنے بیگ میں رکھ کر زپ کو بند کیا اور گہرا سانس لے کر اٹھ گئی۔ بیگ کندھے پر ڈالا اور اطمینان سے سہج سہج کر قدم اٹھاتی پارک سے باہر آ گئی۔

وہ جانتی تھی، باہر پارکنگ میں حاسم بائیک پر اس کا انتظار کر رہا ہوگا اور یہی ہوا۔ اس کی توقع کے عین مطابق حاسم پیشانی پر ان گنت بل لیے آنکھوں پر گاگلز لگائے بائیک پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی حاسم زن سے بائیک لے اڑا۔

☆☆☆

شفا جس وقت گھر میں داخل ہوئی تو سعدیہ بیگم ثمینہ بیگم کے ساتھ برآمدے میں بیٹھی ساگ بنوا رہی تھیں۔ شفا نے صحن کے بیچ و بیچ کھڑے ہو کر ان دونوں کو سلام کیا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ اتنے میں حاسم بھی بائیک صحن میں کھڑی کر کے ایک طرف لگے بیسن میں منہ ہاتھ دھونے لگا۔

''میں ذرا حاسم کو کھانا دے دوں۔'' ثمینہ بیگم نے ہاتھ میں پکڑا ساگ واپس پرات میں رکھتے ہوئے کہا اور شفا کو آوازیں دینے لگیں۔

''جی خالہ!'' شفا جو ابھی اوپری منزل پر پہنچی ہی تھی، پلٹ کر جنگلے سے جھک کر ثمینہ بیگم کو استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''آجاؤ بیٹا! میں حاسم کو کھانا دے رہی ہوں۔ تم بھی آ کر کھالو۔ تمہاری ماں تو نیچے بیٹھی ہے۔'' انہوں نے کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''نہیں خالہ! مجھے بھوک نہیں ہے۔'' شفا نے کہا اور پلٹ کر کن انکھیوں سے حاسم کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر ناراضی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

''یہ تو پاگل ہے، مگر میں پاگل نہیں بن سکتی۔'' شفا نے یاسیت سے سوچا اور سر جھٹک کر کمرے میں چلی گئی۔

اس نے کندھے پر لٹکا پرس میز پر رکھا اور گرنے کے سے انداز میں اپنے بستر پر آ بیٹھی۔

جگہ ایسی زندگی میں کیسے بن سکتی ہے؟ ''محبت''۔ اس نے زیر لب استہزائیہ انداز میں ہنکارا بھرا۔ باہر سے آتی قدموں کی چاپ سن کر جلدی سے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

''شفا..... شفا.....'' سعدیہ بیگم اسے آوازیں دیتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔

''امی! میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ مجھے اس وقت بس سونا ہے۔'' شفا نے آنکھیں بند کیے ہی انہیں جواب دیا اور کروٹ بدل لی۔

''سونا ہے تو اپنا یونیفارم تو بدل لو۔ پھر آرام سے سو جانا۔'' سعدیہ بیگم نے جھک کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''امی! بس سونے دیں۔'' شفا نے اپنا کندھا ہلاتے ہوئے کھسک کر کہا تو سعدیہ بیگم گہرا سانس لے کر سیدھی کھڑی ہو گئیں اور رضائی لا کر اس کے اوپر اوڑھا دی۔

شفا کی آنکھ نیچے سے آنے والی آواز کے سبب کھلی تھی۔ وہ یک دم ہڑبڑا کر اٹھی اور چھوٹے برآمدے میں آ کر رک گئی۔ نیچے خالو اونچی آواز سے چیخ رہے تھے۔ شفا نے گہرا سانس لیا اور گردن موڑ کر چارپائی پر سر جھکا کر بیٹھی سعدیہ بیگم کو دیکھا۔

سعدیہ شرمندگی سے زمین میں گڑی جا رہی تھیں اور یہ شرمندگی آج کی تھوڑی تھی۔ یہ تو برسوں پرانی تھی۔ خالو جب چپ بھی ہوتے، وہ تب بھی سر جھکا کر بیٹھیں۔ وہ تو ان کی آواز اور لہجے میں اتنی بے چارگی ہوتی کہ سامنے والے کو خواہ مخواہ ہی ان پر ترس آنے لگتا۔ شفا نے بے بسی سے اپنی ماں کے جھکے سر کو دیکھا اور مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی ان کے برابر آ بیٹھی اور ماں کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

اس کا کندھے پر دھرا ہاتھ سعدیہ کو اور بھی شرمندہ کر گیا۔

''آہستہ بولیں۔ خدا کے لیے آہستہ بولیں۔ کیوں محلے والوں کو سنا رہے ہیں۔''

ثمینہ بیگم کی پتلی آواز اوپر تک سنائی دی۔

"لو کر لو بات۔ خوب بھئی خوب۔ بچپن سے ایک فقرہ سنتے آرہے تھے۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ آج دیکھ بھی لیا بلکہ آج کیا برسوں سے دیکھ رہا ہوں۔ کون سا وہ منحوس دن تھا، جس دن تم سے میری شادی ہوئی تھی۔ ارے میری اماں نے خوب دیکھ بھال کر شریف لوگوں میں میرا رشتہ کیا تھا، مگر میری بھولی ماں کو کیا خبر تھی۔ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور...... ارے کیا سوچا تھا اور کیا نکلا۔ اچھا ہوا، بہت اچھا ہوا۔ میری ماں پہلے ہی مر گئی، اگر اس کی زندگی میں یہ سب ہوتا تو شاید وہ بے چاری تو صدمے سے ہی مر جاتی۔" اسحاق صاحب کی آواز بنا کسی دقت کے سنی جا سکتی تھی۔

"اچھا، اب بس بھی کریں۔" ثمینہ نے دکھی لہجے میں کہتے ہوئے ان کے بازو کو تھاما۔

"بس میں کروں، ارے اب بس کرنے کے لیے میرے پاس بچا ہی کیا ہے۔ کچھ نہیں بچا ثمینہ بیگم! کچھ بھی نہیں۔ بڑی آئی مجھے بس کرانے والی۔"

انہوں نے بے دردی سے اپنی بیوی کا ہاتھ جھٹکا اور غصے سے بڑبڑاتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ ثمینہ بیگم برآمدے میں رکھے تخت پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور کمرے میں دبکی ندا بھی باہر چلی آئی۔

"پتا نہیں امی! ابو کو کیا مسئلہ ہے۔ ہر دس بارہ دن کے بعد یونہی تماشا لگا دیتے ہیں۔" ندا ناراضی سے کہتی ماں کے پاس آ بیٹھی اور انہیں اپنے ساتھ لگا کر چپ کروانے لگی۔ یہی حال اوپر منزل کا تھا، جہاں شفا ماں کو اپنے ساتھ لگائے انہیں چپ کروانے کی کوشش میں خود بھی رو دی تھی۔

"کیا بات ہے۔ آج گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے؟"

حاسم ابھی کچھ دیر پہلے ہی ٹیوشنز پڑھا کر گھر آیا تھا اور اب کھانا کھاتے ہوئے خاموش بیٹھی ندا کو چھیڑ رہا تھا۔ ندا نے منہ بنا کر بھائی کو دیکھا اور پھر سے سر جھکا کر سلائی مشین پر جھک گئی۔

"کیا ہوا؟" اب کے اس نے ماں کے ستے

ہوئے چہرے...

"وہی ہوا ہے، جو ہر چند دن بعد اس گھر میں ہوتا ہے۔ بھائی! آخر ابو کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ کیوں کچھ دنوں کے بعد چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ دکان نہیں چل رہی تو کیا ہوا، بھوکے پیٹ تو نہیں سو رہے۔ آپ کی پڑھائی مکمل ہوتے ہی آپ کو اچھی سی نوکری مل جائے گی، سب ٹھیک ہو جائے گا مگر ابو......"

ندا اب مشین کے پاس سے اٹھ کر حاسم کے قریب آ بیٹھی۔ حاسم نے ہاتھ میں پکڑا نوالہ پلیٹ میں واپس رکھا اور خفگی سے اٹھنا چاہتا ہی تھا، جب ثمینہ بیگم کی آواز پر رک گیا۔

"بیٹھ جاؤ حاسم! اپنے ابو سے کوئی بھی بات مت کرنا۔ پہلے ہی بہت مشکل سے ان کا غصہ کم ہوا ہے۔"

ثمینہ بیگم نے رسانیت سے کہا اور ہاتھ میں پکڑی قمیص کو لپیٹ کر پیچھے کی طرف رکھ دیا۔

"امی! یہ کیا بات ہے۔ میں آپ سے کب سے کہہ رہا ہوں، ابو کی دکان ختم کروا دیں۔ میری ٹیوشنز اور ندا کی سلائی سے ہمارا گھر بہت اچھے سے چل سکتا ہے۔ بس چند ماہ کی تو بات ہے، مجھے نوکری مل جائے گی تو میں ندا کی سلائی کے ساتھ ساتھ شفا کی نوکری بھی چھڑوا دوں گا۔ آپ بس ابو سے کہیں، اس دکان کا قصہ ختم کریں۔" وہ واپس اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے قدرے ناراضی سے بولا۔

"تم کھانا کھاؤ۔ ندا! جاؤ، تم بھائی کے لیے پانی لاؤ۔"

ثمینہ بیگم نے حاسم کی بات کا کوئی بھی جواب دیے بنا ندا کو اس کے لیے پانی لانے کا کہا۔

"امی!" حاسم نے جھنجلا کر انہیں پکارا اور احتجاجاً اپنے سامنے رکھی کھانے کی پلیٹ کو آگے کی طرف سرکا دیا۔

"حاسم! کھانا کھاؤ۔" ثمینہ بیگم نے اسے گھر کا۔

"اگر آپ ابو سے بات نہیں کر سکتیں تو میں کر لوں۔" حاسم نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے ابو سے کوئی بھی بات نہیں کرو گے۔ دکان

pklibrary.com

گھر میں بیٹھ گئے تو اور بھی ڈپریشن کے مریض بن جائیں گے۔ اب تو ہفتہ دس دن گزرنے کے بعد بولتے ہیں پھر تو صبح شام بولا کریں گے۔ یوں بھی انہیں پہلے ہی اپنی دکان کا صدمہ برداشت نہیں ہوا۔ تم اب مزید انہیں یہ بات کرکے پریشان مت کرنا، یوں بھی اگر وہ بول لیتے ہیں، اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں تو اس میں کیا برائی ہے۔''

ثمینہ بیگم نے لپیٹ کر رکھی شرٹ کو دوبارہ کھولا اور اس کی تر پائی کرنے لگیں جو کچھ دیر پہلے وہ نامکمل چھوڑ گئی تھیں۔

''امی! دل کی بھڑاس نکال لینے میں کوئی برائی نہیں ہے، لیکن اونچا بولنے اور محلے والوں کو سنانے میں تو برائی ہے نا۔''

ندا نے منہ بنا کر حاسم کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

ثمینہ بیگم ہاتھ روک کر ندا اور حاسم کو دیکھنے لگیں اور پھر سر جھٹک کر تر پائی کرنے لگیں۔ ندا بھی پھر اٹھ کر مشین پر آ بیٹھی۔ حاسم نے گہرا سانس لیا اور پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

☆☆☆

''امی! بہت سردی ہو رہی ہے، اٹھیں اور اندر چلیں۔'' وہ دونوں ماں بیٹی کافی دیر تک روتی رہی تھیں۔ سردی کی شدت کا احساس ہر لمحے کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ شفا ماں کو زبردستی اٹھا کر اندر کمرے میں لے آئی۔

''آپ اپنے بستر پر بیٹھیں، میں روٹی بنا کر لاتی ہوں۔'' شفا نے سعدیہ بیگم کو رضائی اوڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، مجھے کھانا نہیں کھانا۔'' سعدیہ بیگم نے کہہ کر ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں نہیں کھانا۔ کھانا نہیں کھائیں گی تو اپنی بی پی کی دوا کیسے لیں گی۔ تھوڑا سا کھا لیں۔'' شفا کہہ کر پلٹی ہی تھی کہ دروازے میں حاسم آ کر کھڑا ہو گیا۔

شفا نے اس کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریز کیا چھوٹے سے پنکھے کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''تم مجھ سے ناراض ہو۔''

''نن..... نہیں تو..... میں کیوں تم سے ناراض ہوں گی۔'' شفا نے پیڑے بناتے ہوئے مصروف سے انداز میں کہا۔

''تم روئی ہو؟'' وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر آ رکا۔

''حاسم! تم اوپر کیوں آئے ہو؟'' شفا نے اس کے سوالوں سے گھبرا کر جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

''کیوں اب میرا اوپر آنا بھی منع ہے۔'' اس کی صبیح پیشانی پر بلوں کا اضافہ ہوا۔

''نہیں، اوپر آنا منع نہیں لیکن اس طرح میرے پاس کھڑے ہونا ضرور منع ہے۔ اپنی خالہ کے پاس بیٹھنا ہے تو اندر چلے جاؤ، ورنہ تو واپس نیچے چلے جاؤ۔''

شفا نے چبا چبا کر کہتے ہوئے حاسم کی طرف دیکھا اور پھر چولہا جلا کر توا رکھ دیا۔

''ہاں، سنو۔'' حاسم چند لمحے لب بھینچے اسے دیکھتا رہا۔ ''میں چائے پی کر جاؤں گا۔'' چند لمحے بعد وہ کہہ کر سعدیہ بیگم کے پاس جا بیٹھا۔ جس وقت شفا ماں کو کھانا دینے کے لیے کمرے میں آئی تو سعدیہ بیگم حاسم کی باتوں پر مسکرا رہی تھیں۔ ٹرے سعدیہ بیگم کے سامنے رکھتے ہوئے شفا نے پلٹ کر ممنون نظروں سے حاسم کی طرف دیکھا جو ابھی بھی سعدیہ بیگم کی طرف ہی متوجہ تھا۔

''تو پھر خالہ! یوں ہوا، میری شرط لگ گئی۔ میرے دوست کو لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر پہنچنا تھا اور مجھے سیڑھیوں کے ذریعے اور ذرا بتائیں تو شرط بھلا کون جیتا؟''

حاسم نے گردن اکڑا کر سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''حاسم!'' سعدیہ بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بالکل صحیح جواب۔'' حاسم نے قہقہہ لگا کر دونوں ہاتھوں سے تالیوں بجاتے ہوئے کہا تو بے

''ارے لڑکی! تم کیا کھڑی ہماری باتیں سن کر مسکرا رہی ہو۔ چلو، جلدی سے میرے لیے چائے لاؤ۔''

حاسم نے آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت، مگر سنجیدہ لہجے میں اتنی اچانک سے شفا سے کہا کہ وہ پڑبڑا کر فوراً ہی اپنے لبوں کے کنارے بکھری مسکراہٹ کو سمیٹتی باہر کی طرف لپکی۔

''دیکھا خالہ! آپ کے بھانجے کی پرسنالٹی کا کمال۔''

حاسم نے کہتے ہوئے اپنے فرضی کالر جھاڑے اور جھک کر سرگوشیانہ انداز میں باتیں کرنے لگا۔

☆☆☆

انیلا جب سے آئی تھی، تب سے روئے چلی جا رہی تھی۔

''اے انیلا! اگر تم تھوڑی دیر اپنا یہ رونا دھونا بھول کر ڈھنگ سے مجھے بتاؤ گی، تب ہی کوئی بات میرے پلے پڑے گی۔ تمہارے ان آنسوؤں اور ہچکیوں کے بیچ مجھے چند لفظوں کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

ثمینہ بیگم نے ہاتھ اٹھا کر قدرے خفگی سے شادی شدہ بیٹی سے کہا جس کی ایک سال پہلے ہی شادی ہوئی تھی۔

''امی! اب اولاد نہیں ہو رہی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ بات بات میں سب طعنے دیتے ہیں اور سب سے زیادہ تو خود کاشف۔'' وہ کہہ کر پھر سے رونے لگی۔

''پاگل ہو گئے ہیں۔ ابھی شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے اور ویسے بھی دولت ہو یا پھر اولاد، یہ تو قسمت سے ملتی ہے۔''

سعدیہ بیگم نے کہہ کر روتی ہوئی بھانجی کو اپنے گلے لگا لیا۔

''خالہ! آپ اور امی سدا کی بھولی ہی رہنا۔ اصل میں تو ان کا مقصد علاج کے لیے ابو سے پیسے منگوانا ہے اور وہ پیسے میں یہاں سے لے جا کر ان کے ہاتھ میں رکھ دوں، تب ہی وہ مجھ سے راضی ہوں گے۔'' انیلا نے

''تو ہم کہاں سے تمہیں پیسے دیں۔ پیسے کیا درختوں پر لگ رہے ہیں، جہاں سے توڑ کر تمہیں دیتی جاؤں۔ تمہارے ابو کا کام تو پہلے ہی مندا ہے۔ ایسے میں اب ان سے کسی بھی خرچے کی بات کرنا، سمجھو بنا ٹکٹ کے پورے محلے میں تماشے کا کہنا ہے۔ میں تو انیلا! تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔''

ثمینہ بیگم نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے صاف ہری جھنڈی دکھائی۔

''ارے آپا! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ بچی اپنا مسئلہ لے کر آئی ہے اور آپ یوں صاف انکار کر رہی ہیں۔ تم فکر مت کرو انیلا! میں نے شفا کی تنخواہ میں سے کچھ پیسے بچا کر رکھے ہیں، وہ تمہیں لا کر دیتی ہوں۔''

سعدیہ بیگم اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے بولیں۔

''خالہ! امی! آخر آپ دونوں کو کب عقل آئے گی۔ ایک بار پیسے دے دیے نا تو مانو ان کی تو لاٹری نکل آئے گی۔ ہر بار یونہی کریں گے، ہر بار یہی مطالبہ کر کے مجھے یہاں بھیج دیں گے۔''

انیلا نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر.....'' سعدیہ نے واپس اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے انیلا کو دیکھا۔

''تو پھر یہ خالہ! آپ اور امی یا تو کاشف بھائی کو بلا کر صاف صاف ان سے بات کریں یا پھر آپ دونوں خود ہی انیلا کے ساتھ اس کے گھر جائیں اور اس کی ساس کے سامنے کاشف بھائی سے بات کریں۔ ہم تو خود سفید پوش لوگ ہیں۔ ہم کہاں سے ان کے مطالبے پورے کریں گے۔''

ندا نے جیسے ماں اور خالہ دونوں کی عقلوں پر ماتم کرتے ہوئے رسانیت سے کہا۔

''ہاں، کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔''

سعدیہ نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی بڑی بہن کی طرف دیکھا۔

اس کے گھر والوں کو خود خیال ہونا چاہیے اور کچھ ہی دن میں نازیہ بھی آجائے گی۔ اس کا سارا خرچا بھی ہمیں ہی کرنا ہے۔'' ثمینہ بیگم نے فکرمندی سے کہا اور اپنے ہاتھوں کو مسلنے لگیں۔

''باجی صحیح کہہ رہی ہے ندا! ابھی بات کرلیں گے تو ہی بہتر رہے گا، ورنہ انہوں نے یہی وطیرہ اپنا لینا ہے۔'' سعدیہ نے متانت سے کہا تو ثمینہ بیگم جل کر انہیں شکوہ کناں نظروں سے دیکھنے لگیں۔

سعدیہ ان نظروں کا مفہوم بہت اچھے سے سمجھتی تھیں۔ اسی لیے بہن کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگیں اور پانچ منٹ کے بعد ہی اٹھ کر اپنے پورشن میں چلی گئیں۔

☆☆☆

سعدیہ بیگم کمرے سے نکل کر برآمدے میں آبیٹھیں۔ عجیب طرح کی بے کلی اور بے چینی ان کے جسم و جاں میں سرایت کرگئی تھی۔ بہن کی شکوہ کناں نظریں نہیں جیسے کوئی تیز دھار چاقو تھا۔ جس نے ان کے سارے زخموں کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ سعدیہ بیگم نے سر اٹھا کر شکوہ بھری نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ جہاں کچھ دیر پہلے سورج جھپ دکھا رہا تھا۔ وہاں اب بادلوں کے کچھ آوارہ جھنڈ سورج کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے میں مگن تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے جسم میں سردیوں کی پھریری بھر رہے تھے لیکن سعدیہ بیگم کو اس وقت نہ سردی لگنے کی پروا تھی اور نہ ہی کسی اور کی۔ وہ تو بس آسمان کی سمت دیکھے جارہی تھیں۔

''کیسی قسمت ہے میری۔ ایک چھوٹی سی غلطی کی سزا مجھے ساری عمر بھگتنا پڑی اور نہ جانے کب تک بھگتنا پڑے گی۔ ثمینہ باجی اور اسحاق بھائی بھی غلط تو نہیں ہیں۔ میری غلطی کی سزا انہیں بھی ملی حالانکہ ان کا کیا قصور تھا۔ وہ دونوں تو بے چارے یونہی پس گئے۔ صحیح تو کہتے ہیں، اسحاق بھائی کہاں سے کہاں آگئے، صرف میری وجہ سے، کاش میں پیدا ہوتے ہی مرجاتی۔ اپنے نصیب کی کالک میں نے اپنی بہن،

کیسی حریاں نصیب ہوں میں، نصیبوں جلی۔ وہ روئے جارہی تھیں۔ آسمان پر اٹھکیلیاں کرتے بادلوں نے جھک کر روتی ہوئی سعدیہ کو دیکھا تو شاید ان کا یوں رونا برداشت نہ کرسکے اور خود بھی ٹپ ٹپ برسنے لگے۔ قسمت نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا پھر انہوں نے خود اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ وہ کبھی فیصلہ نہیں کرپائی تھیں مگر جو بھی تھا..... تھا بہت برا۔ بہت بھیانک، کرب ناک اور اذیت والا بھی۔ اب تو شاید اس درد کے تریاق کی کوئی صورت بھی نہیں تھی، کوئی مرہم نہیں تھا۔

☆☆☆

ثمینہ اور سعدیہ دو ہی بہنیں تھیں۔ ماں باپ نے دونوں مناسب تعلیم و تربیت دی۔ گھر میں بہت پیسہ نہیں تھا مگر اتنا کم بھی نہیں تھا کہ عزت سے دو وقت کی روٹی نہ کھائی جاسکے۔

فتح محمد ایک دفتر میں چپڑاسی تھے۔ انتہائی امانت دار اور شریف النفس انسان تھے۔ لوگ ان کی عزت کرتے۔ کبھی بھی حرام کا نوالہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو نہ کھلایا تھا۔ ان کی شرافت دیکھ کر ہی اسحاق احمد کی والدہ نے ان سے ان کی بڑی بیٹی کا رشتہ طلب کیا۔ اس وقت اسحاق احمد کی پورے علاقے میں سب سے بڑی کریانہ کی دکان تھی جو بعد میں ایک بڑے جنرل اسٹور کی صورت اختیار کرچکی تھی۔ وہ اپنی ماں کی اکلوتی اولاد تھے، جہاں ماں نے کہا، وہیں شادی کے لیے ہاں کردی۔

ثمینہ بیگم تو اپنی قسمت پر رشک کرتیں تو فتح محمد اور ان کی بیوی کبھی اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے کہ اتنا اچھا رشتہ خود چل کر ان کے گھر آیا۔ یوں چند ماہ کے بعد ہی ثمینہ اسحاق کی دلہن بن کر اپنے گھر رخصت ہوگئی تھیں۔ شادی کے بعد اللہ نے انہیں پہلے نازیہ پھر حاسم اور اس کے بعد انیلا اور ندا سے نوازا۔ گھر میں محبت، آسودگی اور خلوص تھا۔ اسی دوران اسحاق کی والدہ معمولی بیماری کے بعد اپنے ابدی سفر پر

ہیں ہوں۔ کتنے ہی مہینوں وہ اپنی ساس کو یاد کر کے روتی رہیں، مگر وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔

وہ بھی اس زخم کو بھول کر بچوں اور گھر کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ ابھی تو وہ پوری طرح اپنی ساس کے صدمے سے باہر نہیں نکل سکی تھیں کہ اچانک ہی فتح محمد اور خدیجہ بھی مختصر علالت کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ہنستا بستا گھر دنوں میں خالی ہوگیا تھا۔ سعدیہ اکیلی، اکیلے گھر میں کیسے رہ سکتی تھی۔ اسی لیے ثمینہ اسے اپنے ساتھ سسرال لے آئیں۔ اب بھلا جوان بہن کو اکیلا کیسے چھوڑ دیتیں حالانکہ ایک دور پرے کی رشتے کی خالہ نے ان سے کہا بھی تھا، وہ سعدیہ کے پاس رہ لیتی ہیں۔ مگر ثمینہ کا دل نہ مانا اور بہن کی حفاظت خود اپنے ذمہ لے لی۔ یہاں آ کر سعدیہ زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہتی اور روتی رہتی۔ ثمینہ بیگم نے اسے خود اپنے گھر کے قریب پارلر جانے کا کہا۔

''اچھا ہے، تمہارا دل بھی لگ جائے گا اور ایک ہنر بھی تمہارے ہاتھ آ جائے گا۔'' انہوں نے ہانڈی میں چمچہ ہلاتے ہوئے سر جھکا کر بیٹھی سعدیہ سے کہا تو وہ بادل نخواستہ اثبات میں سر ہلا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''اسحاق سے کہتی ہوں، اگر کوئی اچھا لڑکا ہو تو ہم سعدیہ کی شادی کر دیتے ہیں یا پھر فی الحال منگنی وغیرہ ہی سہی تاکہ اس کا کچھ تو ذہن بدلے۔ سارا دن اماں، ابا کو یاد کر کے روتی رہتی ہے۔'' ہانڈی بھونتے ہوئے ثمینہ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور پھر کچن میں داخل ہوتی نازیہ کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

سعدیہ کو بھیجا تو انہوں نے اچھے کے لیے تھا۔ اسی دوران انہوں نے اسحاق صاحب سے بات کر کے رشتے کروانے والی خالہ سے بھی سعدیہ کے رشتے کی بات کر ڈالی تھی مگر وہ نہیں جانتی تھیں۔ ان کی سب تدبیریں الٹی پڑنے والی تھیں، حفاظت کے خیال سے انہوں نے سعدیہ کو اپنی پاس لا کر اپنی زندگی کی ایسی غلطی کر ڈالی تھی، جس کا خمیازہ انہیں ہی

☆☆☆

جانے کب اور کیسے سعدیہ کی ملاقات امین سے ہوئی تھی۔ امین محلے بھر میں نکھٹو اور آوارہ مشہور تھا۔ بس شکل وصورت خدا نے فرصت سے عطا کی تھی اور سعدیہ اس کی صورت پر دل و جان دونوں ہی ہار چکی تھی۔ ثمینہ کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی، ان کے پیٹھ پیچھے سعدیہ کیا کھیل کھیل رہی ہے، یہ راز تب کھلا جب امین کی والدہ رشتہ لے کر ثمینہ کے پاس آئیں۔

''خالہ! آپ بھی حد کرتی ہیں، بھلا کیا سوچ کر آپ امین کا رشتہ لے کر آئی ہیں۔ کوئی ان دیکھے مکھی تو نگل سکتا مگر دیکھ کر نہیں۔ ہماری طرف سے انکار ہے۔'' ثمینہ کو غصہ تو بہت آیا تھا مگر پھر بھی انہوں نے تحمل سے امین کی ماں کو انکار کر دیا۔

''اپنی بہن سے تو پوچھ لو۔'' چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے زینت خالہ نے لبوں پر استہزائیہ ہنسی سجاتے ہوئے کہا۔

''بہن سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے خالہ! جو بھی فیصلہ کرنا ہے، وہ مجھے اور اسحاق نے کرنا ہے۔ ہمارے گھروں کی بیٹیاں رشتے ناتوں میں نہیں بولتیں۔'' اس وقت ثمینہ کے لہجے میں کیا کچھ نہیں تھا۔ مان، اعتبار اور بہن کے لیے ڈھیر ساری فکر۔

''چلو ٹھیک ہے۔ میں چلتی ہوں۔''

زینت خالہ نے کپ واپس رکھ کر کہتے ہوئے کہا اور اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

ثمینہ ان کی ہنسی دیکھ کر الجھ کر رہ گئیں۔ شام میں سعدیہ پارلر سے گھر آئی تو سیدھا تن فن کرتی کچن میں چلی آئی۔ جہاں ثمینہ اسحاق صاحب کے لیے روٹیاں بنا رہی تھیں۔

''آپ نے امین کے رشتے سے انکار کیوں کیا۔ وہ بھی بنا مجھ سے پوچھے۔''

آنکھوں میں ڈھیروں غصہ اور ناراضی سجائے وہ بہن سے سوال کر رہی تھی۔

''بکواس مت کرو اور آہستہ بولو، اسحاق

کرتے ہیں، ہیں اور تم یہ کن بچے میں مجھ سے بات
کررہی ہو۔" ثمینہ نے روٹی اتار کر ہاٹ پاٹ میں رکھتے ہوئے سعدیہ کو ڈپٹا۔

"باجی میں۔" اس سے پہلے کے سعدیہ بات پوری کرتی اسحاق صاحب دروازے میں آ کھڑے ہوئے۔

"السلام علیکم!" سعدیہ نے انہیں دیکھ کر جلدی سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔" انہوں نے سعدیہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں آ کر کھانا کھاؤں گا۔ ذرا آصف سے مل آؤں۔" انہوں نے پلٹ کر ثمینہ سے کہا۔

"کھانا تو تیار ہے، کھا کر چلے جائیں۔" ثمینہ نے جلدی سے کہا۔

"نہیں، میں آ کر کھاؤں گا۔ آصف میرا انتظار کررہا ہے اور سعدیہ بیٹا! تمہیں کچھ چاہیے تو بتادو۔ میں آتے ہوئے لے آؤں گا۔"

انہوں نے اپنے دوپٹے کا کونا مروڑتی سعدیہ سے پوچھا۔

"نن ...... نہیں...... اسحاق بھائی! کچھ نہیں چاہیے۔" سعدیہ نے جلدی سے کہا۔

"ابو مجھے چاکلیٹ اور کینڈی لینی ہے۔" ننھا حاسم جانے کب کچن میں چلا آیا تھا اور اب اپنا فرمائشی نوٹ درج کروارہا تھا۔

"اچھا، میرے شہزادے میں آتے ہوئے لے آؤں گا۔" انہوں نے حاسم کے گال ہلکے سے تھپتھپائے اور بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گئے۔

"کنڈی لگالو۔" انہوں نے باہر نکلنے سے پہلے آواز دے کر کہا اور دروازہ پار کر گئے۔ سعدیہ بھاگ کر کنڈی لگا کر پھر سے ثمینہ کے پاس آ گئی۔

"باجی! آپ نے امین کے رشتے کو کیوں انکار کیا؟" اسحاق کے جانے کے بعد سعدیہ نے اب کے قدرے اونچی آواز میں ثمینہ سے استفسار کیا۔

"تو کیا تمہارا ہاتھ ایسے شخص کے ہاتھ میں دے دوں، جو زمانے بھر کا کام چور اور آوارہ ہے۔" ثمینہ کہہ کر کچن سے نکل کر لاؤنج میں پنکھے کے نیچے آ بیٹھیں۔ چاروں بچے اندر کمرے میں ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً ثمینہ چونک گئیں۔

"تمہیں کیسے پتا امین کی ماں تمہارا رشتہ لائی تھی؟" انہوں نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی سعدیہ سے پوچھا۔

"آپ کو مجھ سے پوچھے بنا انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔" سعدیہ نے ثمینہ کی بات کا جواب دیے بنا جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں ان سے کہا۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔ تمہیں امین کے بارے میں پتا ہی کیا ہے، جو تم اتاؤلی ہوئی جارہی ہو۔"
ثمینہ کو اب کے اس پر غصہ آیا اور وہ ذرا تیز لہجے میں بولیں۔

"آپ کو امین کے بارے میں نہیں پتا، اس لیے ایسی بے وقوفی کیے جارہی ہیں۔ میں امین سے محبت کرتی ہوں اور اسی سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"
سعدیہ نے بے خوفی سے بڑی بہن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ لفظ تھے کہ بم کا گولہ جو سعدیہ نے ثمینہ کی سماعتوں پر گرائے تھے۔ وہ حیرت سے منہ کھولے ہونق بنی سعدیہ کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

"مجھے امین سے محبت ہے اور میں اس کے سوا کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔"

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے لیکن میرا دماغ ابھی ٹھیک ہے، تمہیں محبت کرنے کے لیے وہ زمانے بھر کا لعنتی شخص ہی ملا تھا۔ کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا۔ اپنے ذہن سے یہ امین کا فتور نکال دو۔ تمہارے بھائی کبھی نہیں مانیں گے۔"

ثمینہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے اسے اسحاق کی ناراضی کا احساس دلانا چاہا۔

"تو نہ مانیں، شادی مجھے کرنی ہے۔ اسحاق بھائی نے نہیں۔" سعدیہ نے تیزی سے کہا۔

"سعدیہ تم......" ثمینہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے سامنے بیٹھی سعدیہ سے کیا کہیں۔ انہیں تو یہ سعدیہ اپنی سعدیہ نہیں لگ رہی تھی۔

pklibrary.com

"باجی پلیز، میری مجبوری سمجھیں۔" سعدیہ اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھی اور ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"سعدیہ! امین اچھا انسان نہیں ہے اور تمہیں کیا ایسی کیا ------ مجبوری پڑ گئی ہے جو تم......" لفظ ابھی ثمینہ کے منہ میں ہی تھے کہ سعدیہ نے جو خبر انہیں سنائی، ان کے تو حواس باختہ ہو گئے۔ ہاتھوں کے طوطے چڑیاں کیا کوے تک اڑ گئے تھے۔ وہ اب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بہن کو دیکھ رہی تھیں جو کہہ رہی تھی۔

"باجی مجھ سے غلطی ہو گئی، میں پہلے ہی جانتی تھی۔ اسحاق بھائی کا جو جھگڑا امین کے ساتھ ہوا تھا، اس کی وجہ سے آپ اور اسحاق بھائی کبھی بھی اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہوں گے۔ اسی لیے میں نے امین کے ساتھ چھپ کر نکاح کر لیا اور اب میں......"

سعدیہ روتے ہوئے ثمینہ کے قدموں میں آ بیٹھی۔

"کیا اب تم......؟" ثمینہ نے تھوک نگل کر اپنا خشک ہوتا گلا تر کیا، انہیں خود اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جانے وہ کیوں لرزنے لگی تھیں۔

"میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

انکشاف تھا کہ موت کی خبر جو سعدیہ نے ثمینہ کو سنایا تھا۔ وہ تو کتنی ہی دیر کچھ بول ہی نہیں سکی تھیں اور جب بولنے کے قابل ہوئیں تو آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں نے ان کے حلق میں گولہ سا بنا دیا۔

"یہ...... یہ تم نے کیا کیا سعدیہ! یہ سب کرنے سے پہلے کچھ تو سوچ لیتیں۔ میرا کچھ خیال کر لیتیں...... میری بچیوں کا تو خیال کر لیتیں...... تمہارے اس قدم سے میری بیٹیوں پر کیسا اثر پڑے گا۔ لوگ کبھی بھی عورت کی غلطی کو معاف نہیں کرتے۔ مرد کا گناہ بھول جاتے ہیں۔" ان کی سرسراتی ہوئی آواز سعدیہ کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔

"میں نے گناہ نہیں کیا، ہم نے باقاعدہ نکاح کیا ہے اور پھر امین نے بھی مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ وہ خود کو ٹھیک کرے گا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ وہ کام بھی کرے گا، ہم اپنا گھر بھی بنا لیں گے۔ باجی! اس نے بہت مشکل سے اپنی ماں کو رشتہ لینے کے لیے بھیجا تھا اور آپ نے صاف انکار کر دیا۔" سعدیہ نے فکرمندی سے اپنی انگلیوں کو چٹخاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں پتا ہے، تم نے نکاح کیا ہے۔ میں یقین کر لوں گی مگر تم لوگوں کو کیسے یقین دلاؤ گی۔" ثمینہ کی سوئی تو بچے پر اٹکی ہوئی تھی۔ اندیشے اور خدشے اس کی جان نکالے جا رہے تھے۔

"کسی کو کچھ بھی پتا نہیں چلے گا باجی! شادی کے بعد ساری عورتیں ہی بچہ پیدا کرتی ہیں۔ پلیز باجی! اب میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ چاہے تو پوری دنیا میں تماشا بنا دیں، چاہیں تو میری لاج رکھ لیں۔" اس نے کہتے ہوئے ملتجی لہجے میں ثمینہ کے ہاتھ تھامے۔ ثمینہ کو تو غش آ رہے تھے۔

"تم نے میرے اعتبار کا یہ صلہ دیا سعدیہ! تم پارلر جانے کے بجائے امین کا دل بہلا رہی تھیں۔" ثمینہ نے تاسف بھرے لہجے میں کہا اور اس کے ہاتھوں کو جھٹک کر اپنے کمرے میں چلی آئیں۔

☆☆☆

رات تو جیسے تیسے بے چینی میں دعائیں کرتے ہوئے گزاری تھی۔ صبح ہوتے ہی اسحاق صاحب کے دکان پر جانے کے بعد ثمینہ نے امین کی ماں کو فون کیا اور اپنے گھر آنے کی دعوت دی مگر زینت خالہ نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا۔

"کل کا انکار امین کو اپنی سخت توہین لگا۔ اب اس نے خود ہی سعدیہ سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ اب وہ کسی بھی صورت سعدیہ سے شادی نہیں کرے گا۔"

خبر تھی کہ بم جو سعدیہ اور ثمینہ کی سماعتوں پر پھوٹا تھا۔

"یہ...... یہ خود سے کہہ رہی ہیں۔ یہ میرے اور امین کے رشتے کے لیے راضی نہیں تھیں۔ میں ابھی اپنے فون سے امین کو کال کرتی ہوں۔" سعدیہ نے

pklibrary.com

خود کو سنبھالتے ہوئے بہن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی اور کمرے سے اپنا فون اٹھا کر لائی۔ سعدیہ نے کئی بار امین کا نمبر ملایا، پہلے تو بیل جا رہی تھی پھر تیسری بیل پر فون ہی بند ہو گیا۔

''باجی! آپ فکر نہ کریں۔ امین کے فون کی بیٹری ختم ہو گئی ہو گی۔ آپ دیکھنا وہ تھوڑی دیر میں مجھے خود فون کرے گا۔''

سعدیہ نے ثمینہ سے کہیں زیادہ خود کو تسلی دی تھی اور پھر یہ تھوڑی دیر شام تک نہ ہوئی تھی۔ امین کا فون نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی میسج آیا۔ چار و ناچار دو دن کے بعد ثمینہ بیگم کو اسحاق صاحب کو ساری صورت حال سے آگاہ کرنا پڑا۔

اسحاق صاحب دیر تک بے یقینی سے اپنی شریک حیات کا چہرہ دیکھتے رہے اور جب وہ بولے تو ثمینہ کو اپنے حواس مختل ہوتے محسوس ہوئے۔

''تم نے میرے گھر میں اپنی بہن کو رکھ کر یہ گل کھلایا ہے۔ اس لیے تم سعدیہ کو میرے گھر لے کر آئی تھیں کہ وہ مجھے یوں ساری دنیا میں ذلیل و رسوا کر ڈالے۔''

غصے سے ان کے منہ سے کف اڑ رہا تھا۔

''اسحاق! غلطی ہو گئی۔ بچی ہے، نادان ہے۔ سعدیہ امین کی باتوں میں آ گئی تھی، وہ تو خود پریشان ہے۔ کل سے رو رہی ہے۔ بار بار معافیاں مانگ رہی ہے لیکن اس نے گناہ نہیں کیا، باقاعدہ امین کے ساتھ نکاح کیا ہے۔''

''نکاح کیا ہے..... تو نکاح نامہ کہاں ہے؟'' اسحاق احمد دھاڑے۔

''وہ تو امین کے پاس ہی ہے۔'' ثمینہ نے اتنی آہستگی سے کہا تھا کہ اسحاق بمشکل ہی سن سکے تھے۔ ثمینہ کا دل چاہ رہا تھا یا تو سعدیہ کو گھر سے نکال دیں یا پھر اس کا گلا اپنے ہاتھوں سے دبا دیں مگر وہ ایسا سوچ سکتی تھیں۔ ان کے اندر یہ دونوں کام کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

''یہ تم دونوں بہنوں نے مل کر کیا کیا میرے ساتھ۔ برسوں کی کمائی ہوئی عزت کو مٹی میں ملا دیا۔ اگر امین بارات لے کر نہ آیا، میں کہاں منہ چھپاتا پھروں گا۔'' وہ بے چینی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔

''وہ سعدیہ سے محبت کرتا ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں خالہ سے معافی مانگ لوں گی۔ امین سے بھی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لوں گی۔ ہم صبح ہی ان کے گھر جا کر سب معاملہ ٹھیک کر دیں گے۔'' ثمینہ نے التجائی لہجے میں اسحاق صاحب سے کہا تھا کہ وہ بے حد غصے میں ہونے کے باوجود اثبات میں سر ہلا گئے تھے۔

☆☆☆

مگر پھر سب کچھ ٹھیک ہونے والی صبح ان سب کی زندگیوں میں کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ سعدیہ کے نمبر پر آنے والی امین کی کال نے سب کچھ ختم کر دیا تھا۔ ہر امید دم توڑ چکی تھی۔ سعدیہ کی چیخوں نے اسحاق اور ثمینہ کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے سعدیہ کے کمرے میں گئے، جہاں سعدیہ زمین پر بیٹھی اپنے بال نوچ رہی تھی اور چلا چلا کر رو رہی تھی۔

''سعدیہ..... سعدیہ.....! کیا ہوا؟'' ثمینہ تیزی سے آگے بڑھیں اور زمین پر بیٹھی بہن کو سنبھالنے لگی۔

''باجی! وہ کبھی نہیں آئے گا..... اس نے مجھے استعمال کیا..... اس نے اسحاق بھائی سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے میرا استعمال کیا..... میں نے خود کو برباد کر لیا باجی! محبت کے نام پر ساری زندگی کے لیے سیاہ گھنگھور اندھیرے کو اپنا مقدر بنا لیا۔ میں کس کس کو یقین دلاؤں گی۔''

سعدیہ رو رہی تھی۔ اپنا منہ نوچ رہی تھی۔ اسحاق احمد گرنے کے انداز میں کمرے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔ یہ چند سال پہلے کی ہی تو بات تھی، جب امین ان کی دکان پر کام کرتا تھا اور ہر روز کوئی نہ کوئی چیز چرا کر اپنی جیب میں ڈال لیتا۔

انہوں نے دو تین بار اسے آرام سے تنبیہ کی

pklibrary.com

مگر وہ اپنی عادت سے باز نہ آیا اور ایک دن تو حد ہی ہوگئی تھی۔ اسحاق احمد نے پانچ لاکھ گلے میں رکھے، جو کچھ دیر پہلے ہی پے منٹ کی مد میں ملے تھے۔ انہیں کچھ دیر میں وہ پیسے بینک میں جمع کروانے جانا تھا لیکن اس سے پہلے ہی امین نے نظر بچا کر سارے پیسے نکالے اور گھر آ کر اپنا بیگ تیار کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ گھر سے نکلتا، اسحاق احمد پولیس سمیت اس کے دروازے پر آ گئے۔ پیسوں کی بازیابی ہوئی اور پولیس امین کو پورے محلے کے سامنے مارتے ہوئے تھانے لے گئی۔ اگلے کئی ماہ امین چوری کے مقدمے میں جیل میں رہا۔ یوں اس کے دل میں اسحاق اور ان کے گھر والوں کے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔ وہ اسحاق احمد سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور اس کے لیے اس کا شکار سعدیہ تھی۔ سعدیہ محبت کے نام پر بچھائے گئے جال میں پھنستی چلی گئی تھی اور اب امین نے جال میں پھنسی سعدیہ کو دھکا مار کر ذلت کے عمیق گڑھے میں پھینک دیا تھا۔

''مم..... میں دیکھتا ہوں، اگر امین ملتا ہے تو میں اس سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ میں کچھ کرتا ہوں۔'' اسحاق احمد نے خود کو اور ثمینہ، سعدیہ کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا اور اٹھ کر باہر کی جانب لپکے مگر جب وہ دو گلیاں چھوڑ کر امین کے گھر پہنچے تو وہاں موٹا سا تالا ان کا منہ چڑا رہا تھا۔

دروازے پر پڑے تالے کو دیکھ کر اسحاق احمد کو اپنا دل بند ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

''میں حاجی صاحب سے پوچھتا ہوں۔'' انہوں نے ساتھ ہی مالک مکان کے گھر کی گھنٹی بجائی۔

''ارے اسحاق صاحب! کیسے ہیں آپ؟'' حاجی مراد انہیں دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائے۔

''ٹھیک ہوں۔'' اسحاق احمد بمشکل مسکرائے۔

''آئیں، اندر آئیں۔ میں ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولتا ہوں۔''

''نہیں..... نہیں۔ پھر کبھی سہی۔ وہ..... میں امین کے گھر آیا تھا یہاں تو تالا..... انہوں نے دروازے کی سمت اشارہ کیا۔

''ارے شکر کریں اسحاق صاحب! اس آوارہ سے ہماری جان چھوٹی۔ نہ کرایہ وقت پر دیتے تھے اور نہ ہی سکون لینے دیتے۔ بیٹا سارا دن چوریاں کرتا اور ماں سارا دن محلے والوں سے لڑتی۔ خس کم جہاں پاک۔''

حاجی صاحب نے اطمینان بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اسحاق احمد کا اطمینان مزید غارت کیا۔

''کہاں چلے گئے؟ کچھ تو بتایا ہوگا۔ کہاں جا رہے ہیں؟'' اسحاق صاحب نے بے تابی سے استفسار کیا۔

''ارے اسحاق صاحب! آپ کیوں اتنی بے قراری سے امین کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ کہیں پھر تو نہیں آپ کے ہاں چوری کر ڈالی۔'' آنکھوں کو سکیڑتے ہوئے انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

''اس بار تو وہ میرا سب کچھ چرا لے گیا۔'' اسحاق احمد نے اپنی پیشانی پر چمکتے پسینے کے قطروں کو صاف کرتے ہوئے سوچا۔ ''آپ بتائیں تو سہی کہاں گئے ہیں؟''

''یہ تو نہیں بتا کر گئے، چل پڑے ہوں گے کسی اور جگہ..... کسی اور کو لوٹنے۔ ان ماں بیٹے کا کام ہی یہی ہے۔''

حاجی مراد نے بے زاری سے کہا تو اسحاق احمد نے بمشکل خود کو سنبھالا اور ان کے روکنے کے باوجود گھر واپس چلے آئے۔

''مل گیا امین.....! آپ نے اس سے بات کی۔ مان گیا وہ.....''

ثمینہ بے قراری سے اسحاق کی طرف بڑھی۔

''وہ لوگ گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔'' انہوں نے کہتے ہوئے کھا جانے والی نظروں سے ثمینہ کو دیکھا اور خود کو کمرے میں بند کر لیا۔

☆☆☆

pklibrary.com

ملا۔ ہاں یہ ضرور ہوا تھا، اپنے جیسے اوباش اور آوارہ دوستوں کو وہ اپنی اور سعدیہ کی ساری باتیں من وعن سنا گیا تھا اور یہ بھی کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے، وہ بھی بنا شادی کے۔

ثمینہ اور اسحاق کی ہر تدبیر بے کار ٹھہری۔ دن میں محلے کی عورتیں کبھی افسوس تو کبھی ٹوہ لینے کے لیے ان کے گھر آتیں۔

''بھلا لڑکے کا کیا جاتا ہے۔ ارے لڑکی کو اپنی عزت کی حفاظت کرنی ہوتی ہے۔ ہائے ثمینہ! تمہاری بہن نے تو ذرا حیا نہ کی۔ ذرا شرم نہ آئی اسے یہ گل کھلاتے ہوئے۔''

ثمینہ بے چاری منہ چھپائے سر جھکا کر بیٹھی رہتیں۔ وہ کہنے کی کوشش بھی کرتیں کہ سعدیہ نے نکاح کیا ہے مگر سامنے موجود خواتین کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ انہیں زمین میں گاڑ دیتی اور یہیں پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا۔ اب تو مرد حضرات بھی اسحاق احمد کو پکڑ کر سو سو طرح کے سوال پوچھتے۔ وہ بے چارے منہ چھپائے شرم سے پانی پانی ہو جاتے۔

''میں اتنی ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اس ذلت سے مر جاؤں گا۔''

وہ گھر آ کر چلاتے، لڑتے۔ اچھی بھلی زندگی زندگی برباد ہو گئی تھی۔ بچے الگ سہمے، ڈرتے رہتے۔

''کاش سعدیہ! میں تجھے اپنے گھر نہ لاتی۔ تو نے اپنے ساتھ مجھے بھی برباد کر دیا۔ میرا گھر بھی اجاڑ دیا۔'' ثمینہ روتی ہوئی سعدیہ سے کہتیں اور خود بھی رو دیتیں۔

بہت چاہنے کے باوجود بھی ثمینہ، سعدیہ کو اپنے گھر سے نہیں نکال سکی تھیں۔ جو بھی تھا، اگر کرب میں وہ تھیں تو سعدیہ دوہرے کرب سے گزر رہی تھی۔ سارے نقصان تو اس کے حصے میں آ ٹھہرے تھے۔ وہ روتی اور روتی ہی چلی جاتی۔ اتنی ذلت اور بے عزتی کے بعد اسحاق احمد نے اپنی دکان اور مکان کو اونے پونے داموں میں بیچ دیا اور دوسرے شہر چلے آئے۔

اسہزائیہ نظریں نہیں تھیں۔ ہمدردی میں چھپے طنز نہیں تھے۔

''بچے چھوٹے ہیں، نا سمجھ ہیں۔ ہم اپنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کریں گے۔ ہم یہاں لوگوں کو کہہ دیں گے، سعدیہ کی شادی کے دو ماہ بعد اس کا شوہر ایک حادثے میں مر گیا۔''

اسحاق احمد نے ثمینہ سے کہا تو ثمینہ نے ممنون نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا جس نے اس وقت بھی سعدیہ کو طعنے دینے کے بجائے تسلی اور شفقت کا ہاتھ رکھا اور یوں یہاں آنے کے بعد پانچ ماہ سعدیہ نے شفا کو جنم دیا تھا۔

☆☆☆

لیکن کچھ بھی ٹھیک نہ ہوا۔ کتنے موسم آئے اور گزر گئے لیکن یہ زخم مندمل نہ ہوا۔ نیا شہر، نئے لوگ، نیا کاروبار۔ اسحاق احمد کا کاروبار پھر سے کبھی جما ہی نہیں۔ بارہ مرلے کے مکان سے وہ اس چار مرلہ مکان میں آ بسے۔ اچھے اسکولوں میں پڑھتے بچے سرکاری اسکولوں میں آ گئے۔

اچھی خوراک کی جگہ چٹنی اور روٹی نے لے لی تھی۔ گزرتے وقت نے اسحاق احمد کو ڈپریشن کا مریض بنا دیا۔ وہ اکثر غصہ میں چلاتے۔ ثمینہ بیگم سے لڑنے لگتے۔ وہ بے چاری کیا کر سکتی تھیں، سوائے رونے کے۔ اچھے دن خواب ہو گئے تھے۔ جیسے تیسے نازیہ کو میٹرک کرایا اور اسے ایک چھوٹی سی پرچون والے دکان دار سے بیاہ دیا۔ پچھلے سال ہی انیلا کی شادی کی تو اس کے سسرال والے لالچی لوگ نکل آئے۔

ندا کپڑے سیتی تھی۔ شفا نے میٹرک کے بعد نرسنگ کا کورس کر لیا تھا۔ اب تو سب کی نظریں حاسم پر تھیں کہ وہ پڑھ لکھ کر کسی اچھی نوکری پر لگ جائے تو شاید حالات کچھ بہتر ہو جائیں۔

''تم لوگ مجھے ماریکوں نہیں دیتے تاکہ تم لوگوں کو کچھ تو سکون آ جائے۔ نہ جانے کون سا گناہ

خاموشی سے اٹھ کر کمرے میں چلی آئیں۔

''امی! آپ کیوں رو رہی ہیں؟ خالو کی عادت ہے۔ یونہی بول کر اپنی پریشانی دور کر لیتے ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد ٹھیک ہو جاتے ہیں۔''

شفا نے رسانیت سے کہتے ہوئے چائے کا کپ ماں کی سمت بڑھایا۔

''لیکن حقیقت تو نہیں بدلتی۔ وہ تو ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔'' سعدیہ نے کپ تھامتے ہوئے یاسیت سے کہا اور نظریں اٹھا کر شفا کی طرف دیکھا جس کے چہرے سے تھکن ہویدا تھی۔

''شفا! ایک بات پوچھوں؟'' سعدیہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''جی امی! پوچھیں اور مجھ سے سوال کرنے کے لیے آپ کو اجازت کی ضرورت کب سے پڑھنے لگی۔'' کہتے ہوئے اس نے ہولے سے سر جھٹکا اور چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا۔

''تمہیں کبھی مجھ سے نفرت محسوس نہیں ہوئی۔'' سعدیہ کا سوال زیادہ کاٹ دار تھا یا پھر چائے کی گرمی۔ جس نے شفا کے منہ کو جلا ڈالا تھا اور جلن کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کپ سامنے تپائی پر رکھا اور روتی ہوئی ماں کو دیکھنے لگی۔

''ایسی کوئی بات نہیں امی! میں کیوں آپ سے نفرت کروں گی، جو کچھ ہوا اس میں سارا قصور یا تو میرے باپ کا تھا یا پھر ہماری قسمت کا۔ جانے کاتب تقدیر نے کیسی تقدیر لکھی۔ ہمارے ساتھ تو کچھ بھی عام انسانوں جیسا نہیں، سب کچھ ہی عجیب ہے۔ لیکن میں نے اب اس زندگی، اپنی تقدیر سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ آپ بھی یہ بات سمجھ لیں۔''

وہ اٹھی اور سعدیہ کے برابر آ بیٹھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پر بہہ رہے تھے لیکن اس کے لہجے میں عزم تھا۔ سعدیہ نے ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا اور اسے اپنے سینے

سعدیہ نیچے سے آنے والی اسحاق احمد کی تیز آواز پر چونکیں۔ ماضی کا سفر طے کرنے میں وہ اتنی مگن تھیں کہ انہیں شفا کے آنے کی بھی خبر نہیں ہوئی تھی، جواب چولہے پر چائے کا پانی رکھ رہی تھی۔

''میرے پاس ایک روپیہ بھی نہیں ہے، ایک روپیہ..... سب کچھ تو تم میرا کھا گئے ہو۔ بس ایک جان بچی ہے، اب وہ لینا چاہتے ہو۔'' ہاتھ میں پکڑا اسٹیل کا گلاس زور سے زمین پر مارا گیا۔

''ابو! کیا ہو گیا ہے آپ کو.....'' حاسم کی آواز گونجی۔ ''آپ کیوں اتنا غصہ کر رہے ہیں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ میں ہوں ناں، میں سنبھال لوں گا۔ بس آپ پریشان مت ہوں۔'' حاسم نے باپ کی پیٹھ سہلاتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

''ندا! تم امی کو اندر لے جاؤ۔'' حاسم نے روتی ہوئی ماں کی طرف اشارہ کر کے بہن سے کہا۔ انیلا بے چاری ایک طرف کھڑی اپنے ہونٹ کچلنے میں مصروف تھی۔ آنکھوں میں موجود آنسو کسی بھی وقت بند توڑ کر رخساروں پر بکھرنے کو تیار تھے۔

''انیلا! تم بھی اندر جاؤ۔''

حاسم نے انیلا سے کہا تو وہ مرے مرے قدموں سے اندر کمرے کی طرف چل دی۔ یہ سارا تماشا اس کی وجہ سے تو ہو رہا تھا۔ کاشف نے ڈائریکٹ اسحاق صاحب کو فون کر کے انیلا کے علاج کے لیے پیسے دینے کا کہا تھا۔ وہ بے چاری جو پچھلے کئی ماہ سے باپ اور گھر والوں کے سامنے اپنا بھرم رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ منٹوں میں زمین بوس ہو گیا تھا۔ اس کا تو دل تھا، ماں اور خالہ سے کہے گی۔ کاشف اور اس کے گھر والوں کو خود ہی سمجھا دیں۔ ابو اور حاسم کو یہ بات بہانہ چلے مگر.....!!

☆☆☆

''امی! بیمار ہونے کا ارادہ ہے۔ چلیں اٹھیں، اندر رضائی میں بیٹھیں۔'' شفا نے کھولتے پانی میں پتی ڈالتے ہوئے سعدیہ سے کہا۔

''مجھے معاف کردینا شفا! لیکن کبھی مجھ سے نفرت نہ کرنا۔ میں نے بہت کچھ بہت حوصلے سے برداشت کرلیا تھا لیکن میرے اندر تمہاری نفرت اور بدگمانی سہنے کی ہمت نہیں۔''

سعدیہ اس کے پالوں میں ہاتھ چلاتی منت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا امی! کبھی بھی نہیں۔'' شفا نے سر اٹھا کر کہا اور پھر سے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔

☆☆☆

''سسٹر..... سسٹر! دیکھو تو میری ڈرپ ختم کیوں نہیں ہورہی۔''

شفا کی آج وارڈ میں ڈیوٹی تھی۔ بیڈ نمبر نو پر آنے والا مریض ہر پندرہ منٹ کے بعد شروع ہوجاتا۔ شفا پہلے بھی اس مریض کے پاس دو بار جاچکی تھی اور اب تیسری بار اس کے چلانے پر وہ قدرے جھنجلا گئی۔

''آپ کیوں شور مچا رہے ہیں۔ آپ کی وجہ سے باقی لوگ بھی ڈسٹرب ہورہے ہیں۔ جب ڈرپ ختم ہوگی تو میں خود اتار دوں گی۔'' شفا نے اس کے بیڈ کے پاس آکر قدرے خفگی سے کہا۔

''تھک گیا ہوں، دیکھو تو سب کے پاس کوئی نہ کوئی گھر والا موجود ہے۔ جو مریض کا خیال رکھ رہا ہے، باتیں کررہا ہے۔ میں اکیلا پڑا سڑ رہا ہوں۔ وہ میرا بھانجا مجھے چھوڑ کر خود آرام سے چلا گیا۔ اب میں کیا کروں۔''

اس نے اتنی بے بسی سے کہا تھا کہ شفا نے سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ پچاس، پچپن کے پیٹے میں ہوگا۔ اس کا کمزور وجود اور اندر کو دھنسی آنکھیں، بڑھی ہوئی شیو اسے ترحم آمیز بنا رہی تھی۔

''بھانجا چلا گیا، تو اپنی بیوی اور بچوں کو بلالو۔'' شفا نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ڈرپ کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر تھوڑی سی اسپیڈ تیز کردی۔

''میرا تو کوئی بھی نہیں۔'' وہ کہہ کر رونے لگا۔

''ارے، ارے آپ رو کیوں رہے ہیں؟ ایم سوری، مجھے معلوم نہیں تھا۔'' شفا اسے روتے دیکھ کر پہلے تو حواس باختہ ہوئی مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور اس مریض کو تسلی دینے لگی۔

''تم کیا جانو سسٹر! یہ تنہائی کا کرب کیا ہوتا ہے۔ کتنے ارمانوں سے میں نے شادی کی تھی، مگر دیکھو وہ چھوڑ کر چلی گئی۔'' اس نے مظلومیت سے کہا تو شفا کا دل دکھ سے بھر گیا۔

''کیوں چھوڑ کر چلی گئی؟'' اس نے یونہی ازراہ ہمدردی پوچھا۔

''بہت لمبی اسٹوری ہے۔ اب کیا بتاؤں تمہیں۔'' اس نے اپنی آستین سے آنسو صاف کرتے ہوئے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر راؤنڈ پر آنے والے ہیں۔'' شفا کی نظر جیسے ہی بڑے سے وال کلاک پر پڑی۔ وہ کہہ کر واپس اپنی جگہ پر آکھڑی ہوئی۔

ہاں، یہ ضرور ہوا تھا۔ وہ رات بھر وقفے وقفے سے جاکر اس کی خیریت معلوم کرلیتی۔ یہ الگ بات تھی۔ وہ دو منٹ کے لیے اس کے پاس جاتی اور دس پندرہ منٹ کے بعد ہی واپس اپنی ڈیوٹی پر آکر کھڑی ہوجاتی۔ شاید اسے کافی عرصے سے بولنے کا موقع نہیں ملا تھا یا پھر کوئی اچھا سامع۔ اور شاید یہ کمی شفا نے پوری کردی تھی۔

☆☆☆

وہ ڈیوٹی کے بعد صبح نو بجے گھر آئی تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ آج ندا دروازہ بند کرنا کیسے بھول گئی۔ وہ دل ہی دل میں سوچتی دروازہ عبور کرکے صحن میں چلی آئی۔ صحن کو دھو کر وائپر لگایا ہوا تھا لیکن ابھی بھی صحن مکمل طور پر خشک نہیں ہوا تھا۔ ندا کی یہ شروع سے ہی عادت تھی۔ پہلے صفائی کرتی اور بعد میں ناشتا کرتی۔ آج تو ندا صاحبہ نے پودوں کی بھی کانٹ چھانٹ کر رکھی ہے۔ شفا نے سوچا اور سر جھٹک کر سیڑھیاں چڑھ

pklibrary.com

آئی۔ اوپر سعدیہ موجود نہیں تھیں، وہ الٹے پاؤں پلٹی اور سیڑھیاں اتر آئی۔ وہ ماں کو اپنے آنے کی اطلاع دے کر لمبی تان کر سونا چاہتی تھی۔ ابھی وہ برآمدے میں پہنچی تھی، جب اسحاق احمد کی غصے سے بھری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں کبھی بھی حاسم کی شادی شفا سے نہیں کروں گا۔ تم اپنے بیٹے کو سمجھا دو۔" شفا کے قدم ٹھٹک کر رکے۔

"گھر کی بچی ہے اور پھر حاسم کی پسند......"
ثمینہ بیگم کی منمناتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"تو حاسم کو کہو اپنی پسند بدل لے، جس طرح تمہاری بہن نے مجھے اور میرے بچوں کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اب اس کی بیٹی سے رہی سہی، کسر پوری کروانا چاہتی ہو۔ جس طرح میری بیٹیاں رل رہی ہیں۔ اس طرح سعدیہ کی بیٹی بھی غریب گھر میں جائے گی۔ محنت کرے گی۔ تب میرے دل کو تھوڑا سکون ملے گا۔ میری بچیوں کا یہ مقدر نہیں تھا، یہ تم بھی جانتی ہو اگر ہم وہیں رہتے۔ میں انہیں اچھے گھروں میں بیاہ سکتا تھا۔"

"جو ہونا تھا، وہ تو ہو گیا۔" ثمینہ نے انہیں رام کرنا چاہا۔

"یہی تو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ جو ہونا تھا، ہو گیا۔ اب تو بس کر دو۔ اب تو ہماری جان چھوڑ دو اور ویسے بھی جو بات میں کہنا چاہتا تھا، تم وہی سننا چاہتی ہو۔ پتا نہیں امین نے سعدیہ سے نکاح کیا بھی تھا یا نہیں۔ بغیر نکاح کے ہی......"

شفا کا سر زور سے چکرایا تھا۔

"اللہ کے لیے ایسی بات نہ کریں۔ نکاح کیا تھا، تب ہی تو ساری زندگی وہ اس کے نام پر بیٹھی رہی۔ چاہتی تو شادی کر لیتی مگر سعدیہ نے......"

اس سے زیادہ سننے کی سکت شفا میں نہیں تھی۔ وہ بمشکل خود کو سنبھالتی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آئی اور اپنے بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے تی۔

☆☆☆

وہ جانے کتنی دیر یونہی روتی رہی اور منہ چھپا کر لیٹی رہی۔ سعدیہ بیگم جوندا کے ساتھ بازار گئی تھیں، واپس آ چکی تھیں اور کئی بار شفا کے پاس آ کر اسے دیکھ چکی تھیں کہ وہ اٹھ گئی ہے یا نہیں۔ سورج نے شرما کر مغرب کی بانہوں میں سر رکھ دیا تھا۔ جب شفا اٹھی اور سیدھا باتھ روم میں گھس گئی۔ فریش ہونے کے بعد جب اس کے جلتے بلتے جسم اور روح کو تھوڑا سا سکون ملا تھا، وہ باہر نکلی تو سعدیہ میز پر کھانا چن چکی تھی۔

"میں کب سے تمہارے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی مگر تم......"

بات کرتے کرتے سعدیہ نے شفا کے ستے چہرے اور متورم آنکھوں کو دیکھا تو چونک اٹھی۔

"شفا! میری بچی! کیا ہوا؟" وہ بے قراری سے اٹھ کر اس کے پاس چلی آئیں۔

"کچھ نہیں ہوا۔" شفا نے بے دلی سے کہا اور رخ بدل گئی۔

"شفا!" سعدیہ نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔" شفا نے کہا اور یونیفارم بدلنے چلی گئی۔

"کھانا تو کھا لو۔" سعدیہ نے اسے سر پر چادر اوڑھتے دیکھ کر بے تابی سے کہا۔

"امی! بھوک نہیں ہے۔ میں وہیں سے کھا لوں گی۔ آپ فکر مت کرنا۔"

شفا نے بدقت مسکرا کر ماں کی طرف دیکھا۔ آہ! کتنی تکلیف ہوتی ہے جب آپ محسوس کر رہے ہوں، اسے بیان نہ کر سکیں۔

"تمہیں کتنی بار کہا ہے، تم رات کی ڈیوٹی مت لیا کرو۔ میرا دل نہیں مانتا، ڈر لگتا ہے۔" سعدیہ نے اب کے خفگی سے شفا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم زندگی میں بہت سے ایسے کام کرتے ہیں جس میں دل نہیں مانتا ہے۔" شفا نے سوچا اور پرس اٹھا کر کندھے پر لٹکا لیا۔

pklibrary.com

تمہاری نیند پوری نہیں ہوئی، یونہی چڑچڑی ہو جاتی ہو۔ سر میں درد الگ ہوتا ہے مگر تم میری بات سنو تب نا۔''

سعدیہ بیگم اس کی طبیعت کو نیند پوری نہ ہونے کی وجہ قرار دے رہی تھیں۔

''اللہ حافظ۔'' شفا نے آہستہ سے کہا اور سیڑھیاں اتر آئی۔

سیڑھیوں کے اختتام پر اس کا سامنا حاسم سے ہوا جو منہ ہاتھ دھونے کے بعد تولیے سے منہ صاف کر رہا تھا۔ وہ شاید ابھی ابھی گھر لوٹا تھا۔

''شفا!'' حاسم کا چہرہ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا اور وہ مسکراتا ہوا اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''تمہیں میں نے کتنی بار کہا ہے، میرے راستے میں مت آیا کرو۔'' درشتگی سے کہتے ہوئے شفا نے شعلہ بار نظروں سے حاسم کو دیکھا۔

''یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو۔'' حاسم نے حیرت سے شفا کی طرف دیکھا۔ شفا نے کوئی بھی جواب دیے بنا اس کے پاس سے گزرنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی اس کا بازو حاسم کے ہاتھ میں گرفت میں آ چکا تھا۔

''حاسم! تم اپنی حد سے بڑھ رہے ہو۔ چھوڑو مجھے۔'' شفا نے غراتے ہوئے حاسم سے کہا اور اپنا بازو چھڑانے لگی۔

''میرا ہر راستہ ــــ تم تک ہی آتا ہے، یاد رکھنا یہ بات..... اور شرافت سے میرے ساتھ چلو، میں تمہیں ہسپتال چھوڑ آتا ہوں۔'' کہتے ہوئے اس نے شفا کا بازو چھوڑا۔

''میں خود جا سکتی ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔'' شفا نے کہا اور دروازہ پار کر گئی۔ حاسم نے جلدی سے بائیک نکالی اور شفا کے پیچھے لپکا جو گلی کے سرے تک پہنچ چکی تھی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' بائیک عین اس کے سامنے لاتے ہوئے حاسم نے تحکم بھرے لہجے میں کہا۔

''مجھے تمہارے ساتھ.....'' اس سے پہلے کہ شفا اپنی بات مکمل کرتی، سامنے والے گھر سے دو لڑکے نکلے اور عجیب نظروں سے شفا اور حاسم کو دیکھنے لگے۔

''کیا ہے، کوئی مسئلہ ہے کیا۔ میری کزن ہے اور منگیتر بھی۔'' حاسم نے انہیں گھورتے ہوئے کہا تو وہ آگے چلے گئے۔

''چلو حاسم! تم.....'' شفا نے غصے سے اسے دیکھا اور پاؤں پٹختی بائیک پر آ بیٹھی۔

''آئندہ اگر تم نے منگیتر والی بکواس کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' اس نے حاسم کے کندھے پر ہاتھ رکھنے کے بجائے بائیک کے پیچھے لگے ہینڈل کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے خفگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، نہیں کہوں گا۔ شادی کر لو۔ بیگم کہہ دیا کروں گا۔'' حاسم نے کہہ کر بائیک اسٹارٹ کر لی۔ شفا سے کوئی بعید نہیں تھی، وہ فوراً اتر جاتی۔

''تم.....'' شفا نے زور سے اس کے کندھے پر مکا مارا۔

''اف یار! آہستہ۔ لیکن تم نے یہ جو حرکت کی ہے، یہ بھی خالصتاً بیویوں والی ہے۔'' حاسم کہہ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

شفا کا دل چاہا اس بار اپنے ہی بال نوچ ڈالے۔ ظاہر ہے ایسا ممکن نہیں تھا۔ اسی لیے وہ بھنا کر منہ بنا کر بیٹھی رہی۔ حالانکہ حاسم نے اس سے بات کرنے کی کتنی کوشش کی تھی مگر وہ ایک لفظ نہیں بولی۔ اسپتال کے سامنے بائیک رکتے ہی شفا جلدی سے نیچے اتری اور حاسم کی طرف دیکھے بنا اسپتال کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

''سسٹر..... سسٹر.....''

کل والا مریض پھر سے آوازیں دینے لگا۔ شفا کی آواز کو نظر انداز کیے بیٹھی رہی۔ آج تو وہ خود بہت اداس تھی۔ دل چاہ رہا تھا۔ آج وہ اتنا روئے کہ اس کا اندر کا سارا درد آنسو بن کر بہہ جائے۔

''سسٹر..... سسٹر.....''

دس منٹ کے بعد پھر سے آواز گونجنے لگی۔

"یار! یہ کیا مصیبت ہے۔" شفا کے ساتھ ڈیوٹی پر موجود صدف جھنجلا کر بولی اور اٹھ کر اس کے پاس گئی۔

"دیکھیں، اگر اب آپ نے اس طرح آوازیں دیں تو میں آپ کو وارڈ سے باہر پھنکوا دوں گی۔ آپ کی وجہ سے سب مریض ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔" صدف نے اسے اچھی خاصی جھاڑ پلا دی۔

"ہائے، کتنی بدتمیز ہو تم۔ کل والی لڑکی کو بلاؤ۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے۔" اس نے منہ بنا کر کہا تو صدف اسے گھورتی ہوئی شفا کے پاس آ گئی۔

"یار! کچھ لوگوں کو اپنی عمر کا بھی لحاظ نہیں ہوتا اور تم نے کون سی اچھی باتیں کی ہیں، جو وہ بار بار تمہیں بلا رہا ہے۔" صدف نے ابرو اچکا کر شفا سے استفسار کیا۔

"یار صدف! اس وقت میرے اپنے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔" شفا نے بے دلی سے کہا اور چائے کا کپ اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

"سسٹر...... سسٹر......" یہ آواز ایک بار پھر گونجی۔ شفا نے خالی کپ رکھا اور غصے سے اٹھ کر اس کی طرف آ گئی۔

"آخر آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ کیوں بار بار آوازیں دے رہے ہیں؟ چپ کر کے لیٹ جائیں ورنہ میں آپ کو نیند کا انجکشن لگا دوں گی۔"

شفا نے انگلی اٹھا کر اسے متنبہ کیا لیکن اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی ساری خفگی ہوا ہو گئی۔ وہ اتنی بے چارگی سے اسے دیکھ رہا تھا کہ شفا میکانکی انداز میں اس کے پاس پڑے بینچ پر بیٹھ گئی۔

"آپ کا بھانجا نہیں آیا آج بھی......" شفا نے یونہی پوچھا۔

"وہ کیوں آئے گا، وہ تو جان چھڑانا چاہتا ہے۔ اس نے تو شکر کیا ہوگا۔ چلو، چند دن کے لیے سہی، جان تو چھوٹی۔" منہ بنا کر کہا گیا۔

"اس دنیا میں ماں باپ سے بڑھ کر کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ میری اماں تھیں تو وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ہائے میری اماں تو نے جانے کی بڑی جلدی کی۔ ایک بار میرے بارے میں سوچ لیتی۔" اس نے دہائی دی۔

"کبھی کبھی باپ کا رشتہ بھی کچھ نہیں ہوتا۔" شفا نے آہستہ سے کہا اور گود میں دھرے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

"ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟"

"بس ویسے ہی۔" شفا نے تجاہل عارفانہ انداز میں کہا۔

"اگر آپ کو آپ کی بیوی چھوڑ کر چلی گئی تھی تو پھر دوسری شادی کر لیتے۔"

"شادی تو ہو سکتی تھی، دوسری بھی اور تیسری بھی...... مگر محبت تو بس ایک بار ہی ہوتی ہے۔" اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

"محبت۔" شفا نے زیرلب کہا۔

"اس لفظ محبت سے مجھے بڑی نفرت ہے۔ اس دنیا میں سب سے زیادہ دھوکہ اس محبت کے نام پر ملتا ہے۔" شفا نے کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

"تمہیں کیا محبت میں دھوکا ملا ہے؟"

"مجھے نہیں، میری ماں کو ملا ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ کیسا انسان تھا وہ، محبت کے نام پر ایک عورت کی زندگی برباد کر گیا۔ وہ بھول گیا تھا۔ اس کی ماں، بہن بھی تو عورت ہے۔ اس کی بیٹی بھی تو عورت ہے، اگر کوئی ان کے ساتھ ایسا کرے تو...... پتا نہیں ہم دوسری عورتوں کو انسان کیوں نہیں سمجھتے اور مردوں کی اسی نادانی کی وجہ سے ــ خاندان کے خاندان برباد ہو جاتے ہیں۔ زندگیاں سسکنے لگتی ہیں۔"

وہ بہت قنوطی ہو رہی تھی۔

"کیا مطلب میں کچھ سمجھا نہیں۔" اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو شفا نے اسے سہارا دے کر بٹھا دیا۔

"کیا کریں گے جان کر۔" شفا اداسی سے مسکرائی۔

''بتاؤ نا، دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔'' اس نے جیسے ضد کی۔ شفا نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ پہلی بار کسی کے سامنے اپنی زندگی کے حالات بتا رہی تھی، اگر وہ ایک بار سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھ لیتی تو ٹھٹک ضرور جاتی۔ سامنے بیٹھے شخص کی آنکھیں حیرت سے باہر نکلنے کو تھیں۔ وہ دم سادھے بس شفا کو سن رہا تھا۔

''کیا ایک بار بھی انہیں اپنے کیے پر پچھتاوا نہیں ہوا ہوگا۔ ان کا دل کرلایا نہیں ہوگا؟ ان کے ضمیر نے ملامت نہیں کی ہوگی۔'' شفا نے آنسوؤں بھری نظریں اٹھا کر اپنے سامنے دھندلائی شکل دیکھا۔

''چھوڑیں، میں بھی کیا باتیں کرنے لگ گئی۔'' شفا نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور بدقت مسکرائی۔

''ڈاکٹر کے راؤنڈ پر آنے کا وقت ہونے والا ہے۔ میں چلتی ہوں۔'' وہ کہتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ وہ دو قدم آگے بڑھی اور پھر واپس پلٹ کر آئی۔

''میں آپ کا نام بھول گئی۔ کیا نام ہے آپ کا؟'' شفا نے اپنے ذہن پر زور ڈالا مگر اسے اس نو نمبر بیڈ والے کا نام نہیں یاد آ رہا تھا۔

''امین..... امین بھٹی۔'' بیڈ پر بیٹھے شخص نے پہلی بار حیرت کے سمندر سے نکلتے ہوئے کہا اور شفا کی طرف دیکھا جس کے چہرے کا رنگ یک دم بدلا تھا۔

''اس نام سے مجھے نفرت ہے کیونکہ بدقسمتی سے میرے باپ کا نام بھی امین تھا۔'' اس نے کہا اور ہٹ گئی۔ امین کی نظروں نے دور تک شفا کا پیچھا کیا۔

''سسٹر شفا..... نہیں شفا امین یعنی میری بیٹی.....'' امین نے زیر لب کہا اور سوچ میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

زندگی کئی رنگ بدلتی ہے۔ ایسے ایسے رنگ کہ انسان ان رنگوں کو پہچاننے کی کوشش میں ہلکان ہو جاتا ہے۔ شفا بھی اس وقت حیرت سے زندگی کے اس رخ کو دیکھ رہی تھی۔

وہ اپنے سامنے بیٹھے اس مریض کو دیکھ رہی تھی، جو اب اسے بتا رہا تھا کہ وہ اس کا باپ ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے، بھیڑ میں کھو جانے والے لوگ اس طرح کیسے اچانک مل سکتے ہیں؟ اس نے سوچا اور ایک بار پھر بڑی دقت سے امین کے چہرے کی طرف دیکھا۔

کچھ دیر امین کا چہرہ دیکھتے رہنے کے بعد اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی اور اگر آپ واقعی میں میرے باپ ہیں تب تو مجھے آپ کی شکل بھی نہیں دیکھنی۔'' وہ غصے سے پلٹی۔

''یک طرفہ فیصلہ کرنا ناانصافی ہے۔ ایک بار ماموں کی بات تو سن لیں، جس دن سے ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو کر گئے ہیں، ایک منٹ بھی سکون سے نہیں بلکہ وہ تو بیس، بائیس سالوں سے سکون میں نہیں۔'' امین کے ساتھ آئے فیصل نے جلدی سے شفا کے راستے میں آتے ہوئے کہا۔

''مجھے کوئی بات.....'' اس سے پہلے شفا اپنی بات مکمل کرتی، امین اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اپنے بوڑھے ہاتھ جوڑ کر شفا کے سامنے کر دیئے۔

''یہ..... یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' شفا نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''ایک بار میری بات سن لو۔ ایک بار بس..... ایک بار..... پھر تم جو بھی فیصلہ کرو گی، میں مان لوں گا لیکن اس طرح مجھے دل پر بوجھ لے کر مرنے کے لیے مت چھوڑو۔''

آنسوؤں نے امین کے گالوں پر راستہ بنا لیا۔ اردگرد بیٹھے لوگوں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا، وہ اس وقت ہاسپٹل کی کینٹین میں موجود تھے۔

''مجھے کچھ نہیں جاننا، بس ایک بات بتا دیں۔ آپ نے میری ماں کے ساتھ نکاح کیا تھا یا.....''

''کیا تھا۔ ہم نے نکاح کیا تھا۔ میں نے تو

pklibrary.com

سعدیہ سے کہا بھی تھا، ایک کاپی وہ رکھ لے مگر وہ تمہارے خالو اور خالہ سے بہت ڈرتی تھی۔ ان ہی کے ڈر کی وجہ سے اس نے مجھ سے نکاح نامہ کی کاپی نہیں لی کہ کہیں گھر میں کسی کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ بیٹی! دھوکہ میں نے نہیں بلکہ ان سب نے مل کر مجھے دیا۔"

امین نے کہا تو شفا نے چونک کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"ماموں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" فیصل نے جلدی سے تائید کی۔

"آؤ نا، ہم بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" امین نے شفا کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ لیکن شفا نے تیزی سے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا اور آگے بڑھ کر خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ہم نے نکاح کر لیا تھا۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ تمہارے خالو کبھی بھی اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہوتے۔ ہمارا خیال تھا، جب ہم نکاح نامہ ان کے سامنے رکھیں گے تو وہ انکار نہیں کر سکیں گے۔ میں نے اماں کو رشتہ لینے کے لیے بھیجا بھی تھا اور اماں ایک بار نہیں بلکہ کئی بار ان کے گھر گئیں اور ہر بار وہاں سے بے عزت ہو کر واپس آجاتیں لیکن میں نے اور اماں نے سب برداشت کیا۔ ان ہی دنوں فیصل کے ابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور ہم لوگ گاؤں چلے گئے۔ چند دن بعد اس کے ابا کا انتقال ہو گیا اور ہمیں مزید کئی دن وہاں رہنا پڑا۔ جب ہم لوگ واپس آئے، تب تک یہ لوگ وہ گھر اور شہر چھوڑ کر جانے کہاں چلے گئے تھے۔ ہم نے کتنا ڈھونڈا، کتنا تلاش کیا مگر....."

امین نے آنکھوں میں آنسو بھر کر شفا کی طرف دیکھا۔

"ماموں یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائے۔ اسی لیے نشہ کرنے لگے۔ نشے نے ماموں کا یہ حال کر دیا۔ پھیپھڑے تو مکمل طور پر خراب ہو گئے ہیں۔ دیکھو، ماموں سچے اور ان کی نیت ٹھیک تھی۔ تب ہی تو تم یہاں انہیں مل گئیں۔ ان سے باتیں کیں۔ یہ خون کی کشش تھی شفا! ورنہ تم خود بتاؤ، تم نے پہلے کبھی کسی سے یہ سب باتیں شیئر کی تھیں کیا۔"

فیصل نے کہہ کر استفہامیہ نظروں سے شفا کی طرف دیکھا، جواب تذبذب میں گھری اپنے ہونٹ کچل رہی تھی۔

"یہ میرا فون نمبر ہے اور یہ ہمارے گھر کا ایڈریس۔ اگر کبھی تمہیں ماموں پر یقین آجائے تو ملنے چلی آنا۔"

"چلیں ماموں! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ گھر چلیں۔" فیصل نے ٹکٹکی باندھے شفا کی طرف دیکھتے امین سے کہا۔

"میری بیٹی!" امین نے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے شفا کی طرف اشارہ کیا۔

"اگر آپ سچے ہوئے تو آپ کی بیٹی آپ سے ملنے خود آئے گی۔ آپ چلیں۔" فیصل نے کہہ کر ان کا بازو تھاما اور سہارا دے کر کھڑا کیا۔

ان کے جانے کے بعد شفا میز پر سر ٹکا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ زندگی عجیب دوراہے پر لے آئی تھی۔ اسے تو ماں نے کچھ اور ہی بتایا تھا مگر یہاں تو..... وہ کوئی بھی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی، کوئی بھی.....

☆☆☆

شفا نے کینٹین سے نکلنے کے بعد آدھے دن کی چھٹی لی اور گھر جانے کے بجائے پارک میں چلی آئی۔ جہاں وہ اکثر آتی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر سنگی بینچ پر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اسے اپنے اردگرد کی خبر نہیں تھی۔ یہاں تک اسے بینچ کے دوسرے سرے پر بیٹھے حاسم کے آنے کی بھی خبر نہیں ہوئی۔

"لگتا ہے آج دوسرا پاکستان بنا کر ہی اٹھو گی۔" کافی دیر کے بعد اس کے متوجہ نہ ہونے پر حاسم نے مذاق میں کہا تو شفا نے تیزی سے سر اٹھا کر اپنے بائیں جانب بیٹھے حاسم کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی کے ساتھ اب حیرت بھی ہلکورے لے رہی تھی۔

"تم یقیناً یہی سوچ رہی ہو گی، میں یہاں کیسے؟ مگر وہ کہتے ہیں نا، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اور دیکھ لو، یہ محاورہ کتنا سچ ہے۔ میرے دل نے بتایا شفا صاحبہ

پارک میں تو موجودگی کی چ پڑتی، اردگرد سے بے نیاز بس میرا انتظار کررہی ہیں اور دیکھو، میں کیسے دوڑا چلا آیا۔"

حاسم کہہ کر دھیرے سے ہنس پڑا۔ شفا نے اس کے چہرے سے نظر ہٹائی اور سامنے دیکھنے لگی۔

"شفا آج میں بہت خوش ہوں۔" حاسم تھوڑا سا اس کے قریب کھسکتے ہوئے پرجوش لہجے میں بولا۔

"اور آج میں بہت اداس ہوں۔" شفا نے دکھی دل کے ساتھ سوچا۔ وہ اپنے باپ سے کبھی بھی ملنا نہیں چاہتی تھی تو پھر وہ کیوں مل گئے؟

"شفا! تم کہاں کھوئی ہوئی ہو۔ کوئی پریشانی ہے کیا؟" حاسم نے شفا کی نظروں کے سامنے چٹکی بجائی تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"نازیہ باجی کے ہاں بیٹا ہوا ہے اور پتا ہے، میرا رزلٹ بھی آ گیا۔ میں پاس ہوگیا ہوں شفا! مطلب ہمارے خوابوں کی تعبیر کا وقت آ گیا ہے۔"

اس کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی وہ نہ بھی بتاتا، تب بھی اس کا ہر انداز بتا رہا تھا، وہ بہت خوش ہے۔ شفا نے سپاٹ چہرے کے ساتھ حاسم کو دیکھا۔ اس وقت اسے کسی بھی چیز اور بات سے غرض نہیں تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور اپنا بیگ شانے پر ڈال لیا۔ حاسم کے چہرے پر تاریک سایہ لہرایا۔ اس سے پہلے شفا وہاں سے جاتی، حاسم نے ناراضی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"حاسم!" وہ تیزی سے پلٹی اور غصے سے حاسم کو دیکھنے لگی۔

"تمہارے اس گریز کو میں کیا سمجھوں۔"

"یہی کہ مجھے کسی بھی بات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" شفا نے کہہ کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکالنا چاہا۔

"کیوں دلچسپی نہیں؟" حاسم کے لہجے میں افسردگی گھلی۔ شفا کوئی بھی جواب دیے بنا ابھی بھی اپنے ہاتھ کی طرف متوجہ تھی۔

"اگر تمہیں لگتا ہے، تمہارے ایسا کرنے سے میں اپنا ارادہ بدل ڈالوں گا تو کان کھول کر سن لو، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تمہیں جو کرنا ہے، شوق سے کرو لیکن شادی مجھ سے ہی کرنی پڑے گی۔"

"کیوں زبردستی ہے کیا۔" کاٹ دار لہجے میں پوچھا گیا۔

"ہاں ہے زبردستی۔ جب تم آرام سے نہیں مانو گی تو زبردستی کرنی پڑے گی۔" اس نے طمانیت سے کہا۔

"ہاں زبردستی کرنا تو تمہارے گھر والوں کی عادت ہے۔ تم کیوں اس سے پیچھے رہو گے۔"

اس کے لہجے میں کچھ ضرور تھا کہ حاسم حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اسی دوران اس کی گرفت شفا کے ہاتھ پہ ڈھیلی ہوئی۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکالا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ پہلی بار حاسم اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ بلکہ وہیں کھڑا اسے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

"کیا بات ہے شفا؟ تم آج کل کچھ زیادہ ہی عجیب سانی ہو نہیں کررہی۔ بدتمیزی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ندا کتنی بار تمہیں بلانے کے لیے اوپر آئی۔ مگر تم نیچے اتر کر نہیں آئیں۔ کتنے عرصے بعد گھر میں خوشیاں آئی ہیں۔ سب کتنے خوش ہیں مگر تم....."

سعدیہ نے اس کے آگے کھانا رکھتے ہوئے رسانیت بھرے انداز میں کہا۔

"میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔" اس نے موبائل سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"فون استعمال کرتے ہوئے سر میں درد نہیں ہو رہا۔"

سعدیہ نے اپنے غصے کو قابو میں رکھتے ہوئے قدرے نیچی آواز میں کہا۔ شفا نے کچھ بھی کہے بنا فون رکھا اور کھانے کی ٹرے اپنے سامنے سرکالی۔

"شکر ہے اللہ کی ذات کا، نازیہ کو اللہ نے بیٹا دے دیا۔ باجی کی تو جان اٹکی ہوئی تھی۔ بیٹے کے انتظار میں پہلے ہی چار بیٹیاں ہوگئی تھیں۔ اس بار

مالک نے سن ہی لی۔ اور دیکھو، حاسم کا رزلٹ بھی آج ہی آیا۔ وہ بھی فرسٹ پوزیشن میں پاس ہو گیا۔ اسحاق بھائی برسوں بعد اتنے خوش ہیں۔'' سعدیہ شفا کے پاس بیٹھ کر اسے خود ہی بتانے لگیں۔

''امی! ایک بات پوچھوں۔'' شفا نے سر اٹھا کر ماں کے خوشی سے چمکتے چہرے کو دیکھا۔

''ہاں ہاں پوچھو۔'' سعدیہ نے کہہ کر بستر پہ پڑے دھلے ہوئے کپڑوں کو تہ لگانا شروع کیا۔

''امی! جب آپ نے ابو سے نکاح کیا تھا، اس کے بعد ان کی ماں یعنی میری دادی آپ کا رشتہ لے کر آئی تھیں؟'' شفا نے کہہ کر استفہامیہ نظروں سے ماں کی سمت دیکھا۔ سعدیہ کے کپڑے تہ کرتے ہاتھ لحظہ بھر کو رکے اور وہ حیرانی سے شفا کا منہ دیکھنے لگیں۔

''میں تم سے کیا بات کر رہی ہوں اور تم.....''

''امی! بتائیں نا۔'' شفا نے بے تابی سے کہا۔

سعدیہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہیں اور پھر گہرا سانس لے کر پھر سے کپڑوں کو تہ لگانے لگیں۔

''ہاں، آئی تھیں۔'' انہوں نے سرسری انداز میں کہا۔

''خالو کا ابو کے ساتھ جھگڑا ابھی ہوا تھا کیا؟ خالو ابو کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر آپ ابو سے چھپ کر نکاح نہ کرتیں، خالو اور خالہ کبھی بھی آپ کی شادی ابو سے نہیں کرتے۔ کیا ایسا ہی تھا؟'' اس نے بے قراری سے ایک اور سوال کیا۔

''تم کیوں یہ سوال پوچھ رہی ہو؟ اور یہ کیا تم نے ابو، ابو کی رٹ لگا رکھی ہے۔ تمہیں اس دنیا میں آنا تھا اور وہ شخص ذریعہ بن گیا۔ اس سے زیادہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔''

سعدیہ درشتی سے کہتی ہوئی اٹھیں اور تہ شدہ کپڑوں کو الماری میں رکھنے لگیں۔

''امی! جو میں پوچھ رہی ہوں وہ بتائیں نا۔'' شفا نے ہاتھ میں پکڑا نوالہ پلیٹ میں رکھ کر ضدی لہجے میں کہا۔

''ہاں ایسا ہی تھا۔ اسحاق بھائی اور باجی کبھی بھی اس سے میری شادی نہ کرتے۔ وہ تو اس نے مجھے.....'' اس سے پہلے کہ سعدیہ اپنی بات مکمل کرتیں، ندا انہیں بلانے کے لیے آ گئی۔

''خالہ! امی بلا رہی ہیں اور وہ کہہ رہی ہیں۔ آج آپ ہمارے ساتھ نیچے ہی سونا۔ شفا! تم بھی آ جاؤ۔''

ندا نے پلٹ کر لاتعلق بیٹھی شفا سے کہا۔

''نہیں، مجھے نہیں آنا۔'' شفا نے کہہ کر فون اٹھا کر اپنی نظروں کے سامنے کر لیا۔ سعدیہ کا دل چاہا شفا کو ایک تھپڑ لگائیں۔ آج ہی تو اسحاق بھائی نے خود حاسم کے لیے شفا کا ہاتھ مانگا تھا۔

ظاہری بات ہے یہ بات سن کر سعدیہ پہ تو شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ابھی وہ شفا سے یہ بات کرنے والی تھیں کہ اس نے پرانی باتوں کا پٹارا کھول لیا اور اب وہ.....

''شفا! تم.....'' اس سے پہلے کہ سعدیہ اسے ڈانٹتیں۔ ندا بول اٹھی۔

''کوئی بات نہیں خالہ! ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے شفا۔ نیچے شور میں اسے نیند کب آئے گی، صبح اس نے اپنی ڈیوٹی پہ جانا ہوتا ہے۔ نیند پوری نہ ہو تو کوئی بھی کام ٹھیک سے نہیں ہوتا۔ آپ چلیں، آئیں میرے ساتھ.....''

ندا نے مسکرا کر شفا کو دیکھا اور سعدیہ بیگم کا ہاتھ تھام کر انہیں اپنے ساتھ نیچے لے گئی۔

''اونہہ، ڈرامے باز۔ مفت کی نوکرانی جو ملی ہوئی ہیں۔'' شفا نے بڑبڑا کر غصے سے موبائل سائیڈ پہ پٹخا اور اپنی پیشانی مسلنے لگی۔

''اس کا مطلب ہے۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اپنی انا اور میں کو زندہ رکھنے کے لیے خالو اور خالہ نے یہ سب کیا اور ساری زندگی ہم خود کو گناہ گار سمجھتے رہے۔ کیسے لوگ ہیں دنیا میں۔ اپنی انا پہ رشتوں کو قربان کرنے والے۔ اور امی بے چاری ساری زندگی منہ چھپا چھپا کر روتی رہیں۔ ایک بار بھی وہ خالو اور خالہ کا اصلی چہرہ پہچان نہیں سکیں۔''

Khawateen Digest December 2021
pklibrary.com

بدلتی رہی۔ صبح ہوتے ہی وہ ہاسپٹل جانے کے بجائے سیدھا وہاں چلی آئی جہاں کا پتا اسے فیصل نے دیا تھا۔

☆☆☆

دروازہ فیصل نے کھولا تھا۔ شفا کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر ایک لمحے کو تو وہ سٹپٹا ہی گیا۔

"تم....." اس نے جلدی سے اپنے خشک ہوتے گلے کو تھوک نگل کر تر کیا۔

"وہ..... مجھے ان سے ملنا ہے۔" شفا چاہ کر بھی اس کے سامنے "ابو" نہیں کہہ سکی تھی۔

"ماموں سے۔ پر وہ تو اس وقت گھر میں نہیں ہیں۔ وہ تو ہاسپٹل گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے بے شک شفا مجھ سے بات نہ کرے۔ میری بات پہ یقین نہ کرے۔ لیکن میں تو اسے دیکھ لوں گا۔ برسوں بعد اپنی بیٹی کو دیکھا ہے۔ دل چاہ رہا ہے اسے بار بار دیکھوں۔" فیصل نے اسے بتایا۔

"آپ نے انہیں اس طرح جانے کیوں دیا۔ ان کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔" شفا نے بے اختیاری میں کہا۔

"اب تو جی وہ چلے گئے ہیں۔ میں آپ کو اندر نہیں بلا سکتا۔ گھر میں اکیلا ہوں۔ باقی گھر والے گاؤں میں ہیں۔" فیصل نے اسے اندر نہ بلانے کی وجہ بتائی۔

"نہیں، کوئی بات نہیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" شفا کہہ کر پلٹ گئی۔ فیصل کے لبوں پہ بڑی جان دار مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

"لگتا ہے۔ ماموں کو اپنی بیٹی مل گئی۔" اس نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ اور دروازہ بند کر لیا۔

☆☆☆

اب تو اکثر شفا ہاسپٹل کے بعد امین سے ملنے کے لیے چلی آتی۔ اس کی باتیں سن کر شفا کو دکھ ہوتا۔ کتنی محبت کرتے تھے وہ سعدیہ سے مگر خالو اور خالہ نے مل کر سب برباد کر دیا۔

میں بھی ایک اپنی زندگی بنا سکی تھی۔ اپنے ماں باپ کے سائے میں مگر....." اس نے سیب کاٹتے ہوئے تاسف سے سوچا۔

وہ آتے ہوئے پھل یا پھر کھانے کی چیزیں ساتھ لے آتی تھی۔ امین نے اسے نکاح نامہ بھی دکھایا اور نکاح نامے کی کاپی بھی۔

"یہ ایک میں لے لوں۔" اس نے نکاح نامے کی کاپی کی طرف اشارہ کیا۔ اسے لگا اسے اور اس کی ماں کو آج ایک شناخت مل گئی۔ وہ خود سے اور دنیا کی نظروں میں سرخرو ہو گئی۔ وہ یہ نکاح نامہ لے جا کر ان سب کو دکھانا چاہتی تھی۔ وہ بتانا چاہتی تھی۔ وہ سعدیہ اور امین کی جائز اولاد ہے۔ اس کا خون ناپاک نہیں ہے۔

"ہاں لے لو۔ لیکن تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا پڑے گا۔" امین نے ہاتھ اٹھا کر منت بھرے لہجے میں کہا۔

"وعدہ کیسا وعدہ....." شفا کی آنکھوں میں سوال اٹھا۔ جو امین کی نظروں سے مخفی نہیں رہا۔

"تم کسی کو یہ نکاح نامہ نہیں دکھاؤ گی۔ دیکھو، میں نہیں چاہتا۔ وہ لوگ تمہیں مجھ سے ملنے سے روک دیں۔ میں اپنی بیٹی سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب تک زندگی کے چند دن ہیں۔ تب تک میں تمہیں اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"آپ بے فکر رہیں۔ کوئی بھی مجھے آپ سے دور نہیں کر سکتا بلکہ میں تو سوچ رہی ہوں۔ کیوں نہ ہم چھوٹا سا ایک گھر لے لیں جس میں امی اور آپ رہیں۔ مجھے یقین ہے۔ امی کو جیسے ہی آپ کے بارے میں پتا چلے گا، وہ تو خود آپ سے ملنے کو بے تاب ہو جائیں گی۔ شوہر کے ہوتے ہوئے انہوں نے بیوہ کی طرح زندگی گزاری ہے۔"

"نہیں نہیں..... ابھی نہیں۔ ابھی تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔ تب تک، جب تک میں تمہیں نہ

pklibrary.com

ہوں۔ تم یہ رکھ لو۔" انہوں نے کاپی شفا کی طرف بڑھائی جسے شفا نے بے تابی سے تھام لیا۔

"وہ...... شفا بیٹا! کچھ پیسے مل سکتے ہیں۔ تم بھی کیا سوچتی ہوگی۔ تمہیں کچھ دینے کے بجائے الٹا تم سے مانگ رہا ہوں۔" امین نے شرمندگی سے کہا۔

"کیسی باتیں کررہے ہیں، آپ کے اور میرے پیسے الگ تھوڑی ہیں۔ آپ میرے پرس سے جتنے چاہیے لے لیں۔" شفا نے نکاح نامے پہ نظریں جمائے ہوئے کہا۔ وہ کتنی بار یہ کاغذ کا ٹکڑا پڑھ چکی تھی۔ مگر نہ دل بھر رہا تھا اور نہ ہی آنکھیں۔

امین نے اس کا پرس کھولا اور سو روپے کا نوٹ چھوڑ کر باقی سارے پیسے نکال لیے۔ اور ساتھ میں سونے کی وہ انگوٹھی بھی جو شفا نے پیسے جوڑ کر بنائی تھی۔ شفا نے اس کاغذ کے ٹکڑے کو تہ کیا اور مسکرا کر امین کی طرف دیکھا۔ جو ایک لمحے کو گڑبڑا گیا تھا۔

"ابو! میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے۔ ایک دو دن میں اپائنٹمنٹ مل جائے گی۔ آپ کا اچھے سے چیک کروا کر آپ کا علاج کرواؤں گی۔ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔" آنکھوں میں آنسو بھر کر تی، وہ امین کے سینے سے آلگی۔

"ہاں ہاں، میں بھی اپنی بچی کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ تم کچھ کھاؤ گی۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے کے لیے لاؤں۔" امین نے شفا سے پوچھا، اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"چلو ٹھیک ہے، مرضی ہے تمہاری۔" وہ کہہ کر پلیٹ میں موجود سیب کی قاش اٹھا کر منہ میں رکھ گیا۔

☆☆☆

"مجھے حاسم سے شادی نہیں کرنی۔ نہ آج نہ کل اور نہ ہی کبھی۔ آپ یہ بات اپنے مہان بھائی اور باجی کو بتا دیں۔ اس نے مقابلے کا امتحان پاس کرلیا۔ اسے پولیس میں اچھے عہدے پہ نوکری مل گئی۔ مجھے کسی بھی بات سے فرق نہیں پڑتا۔"

کھٹکے کی آواز پہ شفا نے پلٹے بغیر درشتی سے کہا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اس کی سعدیہ سے اسی بات کو

[illegible]

سعدیہ نیچے چلی گئی تھیں۔ شفا نے کہہ کر الماری کو بند کیا۔ اور پلٹی۔

مگر جونہی وہ پلٹی ایک لمحے کو گڑبڑا گئی۔ سامنے ہی حاسم اپنے سینے پہ دونوں بازو باندھے لب بھینچے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا طریقہ ہے آنے کا۔ میں سمجھی امی ہیں۔" شفا نے اگلے لمحے ہی خود کو سنبھال کر ڈھٹائی سے کہا۔

حاسم دھیرے دھیرے چلتا ہوا، اس کے عین سامنے آکھڑا ہوا۔

"تم آج کل کہاں جارہی ہو؟" اس کے لفظ بہت نارمل تھے مگر لہجہ...... شفا ایک لمحے کو ڈر سی گئی۔

"کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے۔ تم اس گھر میں کیا لینے جاتی ہو۔ جانتی بھی ہو، وہ محلہ اور وہ گھر کس لیے مشہور ہیں۔ تمہارا وہاں کیا کام ہے؟" شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"وہ...... م...... میری دوست رہتی ہے۔"

"کون سی دوست ہے تمہاری، نام بتاؤ؟" اب کے حاسم کے انداز پہ وہ ضبط نہیں کرپائی۔

"میری بات سنو حاسم! تم کون ہوتے ہو، مجھ سے یہ سوال پوچھنے والے۔"

"بتاؤں میں تمہیں، کون ہوتا ہوں میں۔" اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں کی آہنی گرفت میں جکڑتے ہوئے حاسم نے غصے سے کہا۔

"چھوڑو مجھے۔" شفا نے دوسرے ہاتھ کو حاسم کے چوڑے سینے پہ رکھا۔ اور اسے پوری قوت سے دھکا دیا۔ حاسم اپنی جگہ سے چند انچ بھی نہیں ہلا تھا۔

"پتا مجھے چل جائے گا۔ تم وہاں کس سے اور کیوں ملنے جاتی ہو۔ فی الوقت تو میں تمہیں یہ کہنے آیا ہوں۔ تم آج کے بعد وہاں دوبارہ گئیں تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔" کہتے ہوئے حاسم نے اس کا بازو ایک جھٹکے سے چھوڑا۔ اور جانے کے لیے پلٹا۔

"اور ہاں۔" وہ جاتے جاتے رکا۔

pklibrary.com

مانتے تو دل بھی کرے۔ بلاوجہ انکار کر کے......"

"میں بلاوجہ انکار نہیں کر رہی۔ مجھے فیصل پسند ہے اور میں اس سے شادی کروں گی۔" اب کے شفا نے حاسم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے کہا۔

"فیصل......کون ہے یہ فیصل؟" حاسم چونکا۔

"میں اپنی ماں کو بتا دوں گی۔ تمہیں بھی پتا چل جائے گا۔" شفا نے کہا اور نخوت سے سر جھٹکا۔

"تم۔" اس سے پہلے کہ حاسم کچھ کہتا۔ اس کا فون بول اٹھا۔

"تم سے میں آ کر بات کرتا ہوں۔" وہ انگلی اٹھا کر شفا سے کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ شفا نے غصے سے حاسم کی پشت کو گھورا۔ اور تیزی سے سائیڈ ٹیبل پر رکھے اپنے فون کی طرف بڑھی۔ اس نے جلدی سے فیصل کا نمبر ملایا۔ جو اس وقت بند جا رہا تھا۔

"یا اللہ، میں اب کیا کروں؟" شفا پریشانی سے اپنی پیشانی مسلتی ہوئی کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"اگر حاسم یا خالو کو پتا چل گیا، وہاں ابو ہیں تو نا جانے وہ ان کا کیا حال کریں گے۔ پولیس میں دے دیں گے۔ دھوکہ دینے کے الزام میں جیل کروا دیں گے۔ ان سے تو کوئی بعید نہیں ہے۔ اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ابو کو مزید تکلیفیں دے سکتے ہیں۔"

سوچتے ہوئے اس کے چہرے کی ہوائیاں اڑتی جا رہی تھیں۔ سعدیہ کمرے میں آئیں تو شفا کو پریشانی سے ٹہلتے دیکھ کر وہیں دروازے میں ٹھٹک کر رک گئیں۔

"تم آج کل کچھ زیادہ ہی عجیب بی ہیو نہیں کر رہی ہو شفا! تم مجھ سے کیا چھپا رہی ہو؟" سعدیہ متفکرانہ لہجے میں کہتی ہوئی۔ شفا کے قریب آئیں۔

"کچھ بھی نہیں امی۔" شفا نے لمحے بھر کو رک کر ان کی طرف دیکھا اور پھر سے ٹہلنے لگی۔

"ایسے کیسے کچھ نہیں۔ میں تم سے کئی دنوں سے ہی نہیں دیتیں۔ چل کیا رہا ہے آخر۔ گھر تم دیر سے آنے لگی ہو۔ روزانہ ہی تمہیں پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہاری رنگ اور چین کہاں ہیں۔ میں تم سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی ہوں۔" سعدیہ نے شفا کا بازو پکڑ کر اسے اپنے سامنے کھڑا کرتے ہوئے استفہامیہ لہجے میں سوال کیا۔

"امی بتایا تھا، پتا نہیں کہاں گئیں۔ میرے بیگ میں تھیں۔ شاید ہاسپٹل میں کسی نے نکال لی ہو یا کہیں بھی گر گئی ہوں گی۔" شفا نے جھنجھلا کر کہا۔ اور اپنا بازو چھڑا کر پھر سے فیصل کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس کے چہرے کی ہوائیاں اڑی جا رہی تھیں۔

"اس کا فون کیوں نہیں لگ رہا۔" اس نے غصے سے کہتے ہوئے۔ اپنا فون بستر کی طرف اچھالا۔

"کس کا فون نہیں لگ رہا۔" سعدیہ نے نا سمجھی سے اس کی طرف دیکھا۔

"امی! میں آپ سے ایک بات پوچھوں؟" شفا بے تابی سے کہتی ان کے قریب آئی۔ سعدیہ نے کچھ بھی کہے بنا اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ جہاں خوف متحرک تھا۔

"امی اگر ہمیں ابو مل جائیں۔ ہم یہ گھر چھوڑ کر ان کے ساتھ الگ گھر میں جا سکتے ہیں۔ ہم اپنی دنیا نئے سرے سے شروع کر سکتے ہیں۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو شفا! میں اس انسان کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی اور تم کیوں بات بات میں اس شخص کا ذکر کرتی ہو۔" سعدیہ نے غصے سے کہا۔

"امی آپ......" شفا دو قدم آگے بڑھی۔

"میں آپ سے آ کر بات کرتی ہوں۔ ابھی مجھے جانا ہے۔" اس نے کہتے ہوئے چادر اوڑھی۔ فون اور بیگ اٹھالیا۔

"شفا! تم کہاں جا رہی ہو؟" سعدیہ نے اسے روکنا چاہا۔

"میں آ کر بات کرتی ہوں امی۔" وہ کہتے ہوئے تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ اور سعدیہ اسے

pklibrary.com

☆☆☆

رکشے میں بیٹھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر فیصل کا نمبر ڈائل کیا۔ جو ابھی بھی بند جا رہا تھا۔ شفا نے غصے سے اپنی مٹھی کو بھینچ لیا۔

''میں ابو سے کہوں گی۔ وہ کچھ دنوں کے لیے گاؤں چلے جائیں۔ تب تک میں امی کے دل میں جو بدگمانی ہے، وہ نکال دوں گی۔ امی مان جائیں گی۔ پھر ہمیں کوئی پروا نہیں۔ نہ خالو کی اور نہ ہی خالہ کی۔ حاسم خود کو کیا سمجھتا ہے۔ ایس پی لگ گیا ہے۔ تو جو وہ چاہے گا، ویسا ہی ہوگا کبھی بھی نہیں۔ ہم نے ساری زندگی ان ہی کے کہنے پہ گزار دی۔ کاش امی ایک بار آنکھیں کھول لیتیں۔ خالو اور خالہ کا اصلی چہرہ پہچان لیتیں۔ تو مجھے اور انہیں یوں زمانے بھر سے ڈر کر زندگی گزارنا نہ پڑتی۔'' شفا نے یاسیت سے سوچا۔

برسیر کے آجانے سے وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔ اور کلائی میں بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھنے لگی۔

''بھائی! رکشہ ذرا تیز چلائیں۔'' اس نے رکشے والے سے کہا۔

''اچھا باجی۔'' رکشہ والے نے اثبات میں سر ہلایا۔

شفا گہرا سانس لے کر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ حاسم تو کل ہی آیا ہے۔ اسے کیسے پتا چلا میں کہاں جاتی ہوں؟ حاسم کی پوسٹنگ دوسرے شہر میں تھی۔ تو پھر اسے..... شفا نے پریشانی سے اپنی پیشانی مسلی۔

رکشہ رکنے کی آواز پہ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ رکشہ اس گلی کے باہر رک چکا تھا۔ جس گلی میں امین کا گھر تھا۔

شفا نے اتر کر رکشے والے کو پیسے دیے۔

''باجی! میرے پاس کھلے پیسے نہیں ہیں۔ میں لے کر آتا ہوں۔'' رکشہ والے نے اترتے ہوئے کہا۔

''نہیں، رہنے دو۔ تم سارے رکھ لو۔''

شفا ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مکان کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔ اس نے دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا۔ جب اس کی نظر کھلے دروازے پہ پڑی۔ شفا نے لکڑی کے دروازے پہ ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا۔ تو وہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ اندر سے لڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''کہیں جاسم تو نہیں آ گیا۔'' وہ گھبرا کر تیزی سے کمرے کی طرف بڑھی۔ ابھی وہ برآمدے میں ہی تھی۔ جب فیصل کی چلاتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''دیکھ ماموں! قرض داروں کے مطالبے بڑھتے جا رہے ہیں اور یہ جو تو چند ہزار اپنی بیٹی کے پرس سے نکالتا ہے۔ یہ ناکافی ہے۔ جو بھی کرنا ہے۔ اب جلدی کرنا پڑے گا۔'' فیصل کی غصیلی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''قرض..... ہاں ابو نے بات کی تھی کہ انہوں نے اپنے علاج کے لیے قرض لیا تھا۔ اور انہوں نے کہا بھی تھا۔ مجھ سے اگر تین لاکھ ہوں تو..... اور میں نے اس پہ دھیان ہی نہیں دیا۔ میرے پاس بینک میں پیسے پڑے ہیں۔ وہ پیسے میں ابو کو دے دوں گی۔''

شفا نے دل میں سوچا۔ یہ پیسے سعدیہ کو اسحاق احمد نے ان کا آبائی گھر بیچنے کے بعد دیے تھے۔ آدھے پیسے ثمینہ کے تھے۔ اور آدھے سعدیہ کے۔ سعدیہ نے وہ پیسے شفا کی شادی کے لیے بینک میں رکھوا دیے تھے۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھی۔

''تو فکر کیوں کر رہا ہے پیارے۔ شفا نہیں یوں سمجھ سونے کی چڑیا اپنے ہاتھ لگی ہے۔ دیکھ کہتے ہیں اللہ بڑا بے نیاز ہے۔ اب تو مجھے اس کی بے نیازی پہ یقین بھی آ گیا۔ کہاں سے پلی پلائی چڑیا ہمارے ہاتھ آ لگی۔''

امین کہہ کر خباثت سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

شفا نے حیرت سے اپنے اور دروازے کے بیچ کے فاصلے کو دیکھا۔ ایک، دو، تین بس اتنے ہی

pklibrary.com

زیادہ ہیرو بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا کزن ایس پی بن چکا ہے۔ یہ نہ ہو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ تو بس اسے فون کر۔ اسے یہاں بلا۔ ہم اسے لے چلتے ہیں۔ تیری اس سونے کی چڑیا کے بڑے اچھے دام مل رہے ہیں۔ یہ نہ ہو چڑیا اڑ جائے۔'' فیصل نے جھنجلا کر کہا۔

''تو فکر کیوں کر رہا ہے۔ میں نے سب انتظام کر رکھا ہے۔ ایک، دو دن میں وہ خود میرے پاس آ جائے گی۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے، مجھے اس کی شادی تجھ سے کرنی ہے تاکہ وہ میرے پاس رہے اور دیکھ بھال بھی گئی ہے۔ اپنی ماں کی وجہ سے ذرا معترض ہے۔ لیکن جتنی مظلومیت میں اسے دکھا چکا ہوں۔ وہ میرے پاس آ جائے گی۔ ہم اسے فضل داد کے ہاتھ بیچ کر اس بار پشاور بھاگ چلیں گے۔''

الفاظ تھے کہ تیزاب جس نے شفا کی روح تک جلا کر آبلہ پا کر دیا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا محسوس ہونے لگا۔ اس کی ٹانگیں اس کا وزن سہارنے سے انکار کر رہی تھیں۔ اس نے اپنے چکراتے ہوئے سر کو تھاما اور ہاتھ بڑھا کر دیوار کا سہارا لیا۔

''میں تو کہہ رہا ہوں اسے فون کر کے بلا لو۔ چند دن کے انتظار کی ضرورت کیوں ہے؟''

''دیکھ فیصل! تجھے میں جیسے کہہ رہا ہوں، ویسا ہی ہوگا۔ جلد بازی کر کے پوری گیم الٹنے کی ضرورت نہیں۔ گرم گرم کھانا منہ جلا دیتا ہے اور ٹھنڈا کھانا اکثر بدمزا ہوتا ہے۔ اسی لیے کھانا ہمیشہ اتنا گرم ہونا چاہیے کہ آسانی سے منہ میں ڈال کر چبایا جا سکے۔ جو ہضم بھی ہو جائے اور مزا بھی دے جائے۔'' امین نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

''چل پھر ٹھیک ہے۔ وہ چین اور انگوٹھی دے۔ جو تو نے اس چڑیا کے پرس سے اڑائی تھی، بیچ کر آتا ہوں۔ کھانے کے ساتھ آج پڑیا بھی لے آؤں گا۔ اور ساتھ میں فضل داد کے منہ پر چند ہزار مار آؤں گا۔ لہا۔

تو کیا میری چین اور انگوٹھی بھی ابو نے چرائی تھی۔ آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ چھانے لگی۔ شفا نے اپنی قمیص کی آستین سے اپنی آنکھوں کو صاف کیا اور جانے کے لیے پلٹی تو اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

وہ لمبی مونچھوں اور لمبے قد والے دو مرد تھے۔ شفا کو دیکھتے ہیں ان دونوں کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھری۔

''ارے یہ پری کہاں سے راستہ بھول کر یہاں آئی ہے؟'' پہلے شخص نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے لوفرانہ انداز میں سرتاپیر شفا کو دیکھا۔

''ارے او امین! باہر نکل۔'' دوسرے شخص نے اونچی آواز لگائی۔

شفا کو لگا اس کی جان نکل گئی۔ جانے اس کے اندر کہاں سے اتنی ہمت آئی تھی۔ اس نے پوری قوت سے اس شخص کو دھکا دیا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسی لیے لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔ شفا نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بیرونی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔

''ارے فضل داد! کیا ہوا۔''

باہر نکلنے سے پہلے شفا کے کانوں میں امین کی آواز آئی۔ اس سے پہلے امین اسے دیکھتا وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی سڑک پار کر گئی تھی۔

☆☆☆

وہ بھاگتے ہوئے رو رہی تھی، زار و قطار اور ہچکیوں سے۔ لوگ رک کر اسے دیکھ رہے تھے مگر اس وقت تو اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

جو کچھ وہ سن اور دیکھ کر آ رہی تھی۔ وہ اذیت اور دردان سب چیزوں سے کہیں بڑھ کر تھا۔ کوئی باپ ایسا بھی ہو سکتا ہے کیا؟

کوئی اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا بھی کر سکتا ہے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اب یقین کرنے کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ سب کچھ اپنے

تھی۔ کوئی اس لمحے شفا سے پوچھتا۔

"میں کہاں جاؤں؟" اس نے رک کر بے بسی سے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ان چند ماہ میں وہ اپنی ماں سے متنفر ہو چکی تھی۔ اسے لگنے لگا تھا۔ ساری غلطی اس کی ماں کی ہے۔ بھلا وہ کیوں خالو اور خالہ کے کہنے میں آئی۔ اور انہیں ایسی زندگی گزارنا پڑی۔

وہ بے حال سی ہو کر پارک میں موجود اپنے مخصوص بینچ پہ آ بیٹھی۔ وہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اب بس رو رہی تھی جس شخص نے اپنی اولاد تک کو نہ چھوڑا۔ وہ کسی دوسرے کی بیٹی کا کیسے خیال کر سکتا تھا۔ کوئی اتنا خود غرض کیسے ہو سکتا ہے؟

وہ روتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ کافی دیر تک یونہی سر جھکائے روتی رہی تھی۔ جب اچانک بینچ کے دوسری طرف کوئی آ کر بیٹھا۔ کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی شفا نے سر اٹھایا اور گردن کو موڑ کر دائیں جانب دیکھا۔ حاسم سینے پہ ہاتھ باندھے سامنے موجود پھولوں کی کیاریوں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی شفا کے رونے میں اور بھی شدت آ گئی۔

"یقین کرو، رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر واقعی میں کچھ ہوتا تو خالہ کی زندگی میں سب کچھ برسوں پہلے ہی ٹھیک ہو جاتا۔"

حاسم نے کہا۔ مگر اس کی نظریں بدستور پھولوں پہ جمی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر مزید رونے کے بعد شفا خود ہی چپ ہو گئی۔ ایک طویل خاموشی کا وقفہ ان دونوں کے بیچ حائل تھا۔

"کیا واقعی میں حاسم! کچھ لوگ اتنے نیچ اور گرے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی بیٹی اور بہن تک کو بھول جاتے ہیں۔ یاد رہتی ہے تو فقط اپنی غرض۔ اپنا لالچ۔" شفا نے استفہامیہ نظروں سے حاسم کی طرف دیکھا۔

"اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تو آ رہی ہو۔" اب دیکھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا میں کہاں اور کس سے ملنے کے لیے جاتی ہوں؟" ذہن میں کلبلاتے ہوئے سوال کو شفا لبوں تک لے آئی۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے تجاہل عارفانہ انداز میں کہا۔ شفا اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"تم بہت بدل گئی تھیں شفا! اور یہ بات میں نے ہی نہیں باقی سب گھر والوں نے بھی محسوس کی تھی اور سب سے زیادہ خالہ نے۔ میں ان چند ماہ میں بہت بڑی تھا۔ مجھے اپنا کریئر بنانا تھا تاکہ جلدی سے سیٹلڈ ہو کر تم سے شادی کر سکوں اور تم....." اس کے لبوں پہ دکھی مسکراہٹ ابھری۔

"خالہ نے برسوں فون کیا تھا مجھے۔ تمہارے آنے جانے کی ٹائمنگ کا بتایا۔ میں نے نبیل کو کہا۔ پتا کرے، تم کہاں جاتی ہو؟ اور جو اس نے مجھے بتایا۔ وہ بہت خوف ناک تھا۔ تمہیں ابھی بھی نہیں پتا شفا! تم کہاں جاتی تھیں۔ وہ تمہارے باپ کا گھر نہیں، نشات کا اڈا تھا۔ اور ساتھ میں لڑکیوں کی اسمگلنگ بھی کی جاتی تھی۔ تمہاری قسمت بہت اچھی ہے یا پھر خالہ کی دعائیں تمہارے ساتھ تھیں۔ تم اتنے ماہ وہاں اس گھر میں جا کر بھی بچ گئیں۔ اتنی بے وقوف کیسے ہو سکتی ہو۔ اس گھر میں موجود مردوں کو دیکھ کر بھی تم اندازہ نہیں کر پائیں۔"

"جب میں وہاں جاتی تھی۔ تب وہاں نبیل اور ابو کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا۔" شفا نے آہستہ سے کہا۔ اور اپنے ہاتھ مسلنے لگی۔

"انہوں نے کیوں ایسا کیا میرے ساتھ؟ میں نے سوچا تھا۔ ہم سب مل کر رہیں گے۔ میں امی اور ابو۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔

"وہ کم ظرف اور کمینہ انسان ہے۔ اسے نہ خالہ سے محبت تھی۔ اور نہ ہی تم سے کوئی سروکار۔ اسے پیسے سے مطلب تھا۔"

"پھر بھی ایسا میرے اور امی کے ساتھ ہی کیوں

pklibrary.com

قدر ہی نہیں۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی۔

''بارش جب آسمان سے قطروں کی صورت زمین پہ گرتی ہے تو وہ ایک جیسی پاک و شفاف ہوتی ہے۔ مگر اپنے اپنے ظرف کی بات ہوتی ہے۔ بارش کے قطرے سمندر میں گریں تو سیپ میں موتی بن جاتے ہیں اور یہی قطرے جب جوہڑ میں گریں تو تعفن پھیلاتے ہیں، بدبو پھیلاتے ہیں۔ سمجھ لو تمہارا باپ انسان نہیں، ایک جوہڑ ہے، گندگی کا ڈھیر ہے۔ رشتے ہوں یا محبت، خلوص ہو یا پھر عقیدت اس پہ کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ جب بھی گرے گا۔ ہاتھ گندے ہی کرے گا۔ ہر طرف گندگی پھیلائے گا۔'' حاسم نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ اور اپنے بجتے ہوئے فون کو آن کر کے کان سے لگالیا۔

''وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔''

فون بند کر کے حاسم نے گردن گھما کر شفا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مطلب۔'' اس نے نا سمجھی سے حاسم کی طرف دیکھا۔

''تمہارے وہاں سے نکلنے کے دو منٹ کے بعد ہی پولیس ریڈ پڑ گئی تھی۔ پولیس نے اس کے باقی ساتھیوں کو تو گرفتار کر لیا تھا۔ مگر امین بھٹی وہاں سے بھاگ نکلا۔ پولیس اس کے تعاقب میں تھی۔ اسی اثناء میں.....'' حاسم رکا۔

''کیا ہوا؟'' شفا کی سرسراتی ہوئی آواز گونجی۔

''وہ سامنے سے آتے تیز رفتار ٹرک کے نیچے آ گیا۔ اور موقع پہ ہی دم توڑ گیا۔'' حاسم نے آہستہ سے شفا کو بتایا۔ شفا کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

''تم ان سے کہاں ملی تھیں؟''

حاسم کے پوچھنے پر اس نے دھیرے دھیرے اسے سب بتا دیا۔

''لیکن پتا ہے۔ وہ شاید مجھے کیوں ملے تھے؟'' شفا نے آنسو صاف کرتے ہوئے حاسم سے کہا۔

''کیوں؟''

''بارش جب آسمان سے قطروں کی صورت زمین پہ گرتی ہے تو وہ ایک جیسی پاک و شفاف ہوتی ہے۔ مگر اپنے اپنے ظرف کی بات ہوتی ہے۔ بارش کے قطرے سمندر میں گریں تو سیپ میں موتی بن جاتے ہیں اور یہی قطرے جب جوہڑ میں گریں تو تعفن پھیلاتے ہیں، بدبو پھیلاتے ہیں۔ سمجھ لو تمہارا باپ انسان نہیں، ایک جوہڑ ہے، گندگی کا ڈھیر ہے۔ رشتے ہوں یا محبت، خلوص ہو یا پھر عقیدت اس پہ کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ جب بھی گرے گا۔ ہاتھ گندے ہی کرے گا۔ ہر طرف گندگی پھیلائے گا۔'' حاسم نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ اور اپنے بجتے ہوئے فون کو آن کر کے کان سے لگالیا۔

''وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔''

فون بند کر کے حاسم نے گردن گھما کر شفا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مطلب۔'' اس نے نا سمجھی سے حاسم کی طرف دیکھا۔

''تمہارے وہاں سے نکلنے کے دو منٹ کے بعد ہی پولیس ریڈ پڑ گئی تھی۔ پولیس نے اس کے باقی ساتھیوں کو تو گرفتار کر لیا تھا۔ مگر امین بھٹی وہاں سے بھاگ نکلا۔ پولیس اس کے تعاقب میں تھی۔ اسی اثناء میں.....'' حاسم رکا۔

''کیا ہوا؟'' شفا کی سرسراتی ہوئی آواز گونجی۔

''وہ سامنے سے آتے تیز رفتار ٹرک کے نیچے آ گیا۔ اور موقع پہ ہی دم توڑ گیا۔'' حاسم نے آہستہ سے شفا کو بتایا۔ شفا کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

''تم ان سے کہاں ملی تھیں؟''

حاسم کے پوچھنے پر اس نے دھیرے دھیرے اسے سب بتا دیا۔

''لیکن پتا ہے۔ وہ شاید مجھے کیوں ملے تھے؟'' شفا نے آنسو صاف کرتے ہوئے حاسم سے کہا۔

''کیوں؟''

''ہم نے کب کہا خالہ نے جھوٹ کہا تھا۔'' حاسم نے خفگی سے اس کی بات کاٹی۔

''لیکن خالو نے تو.....'' شفا نے کہتے ہوئے اپنے دانتوں تلے زبان دبائی۔

''جس انسان نے اچھا وقت دیکھا ہو۔ اسے یوں اچانک دربدری کی ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ یہ آسان نہیں تھا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا۔ ابو کا رویہ ٹھیک تھا۔ لیکن اپنے اندر کی فرسٹریشن کو باہر نکالنے کے لیے کوئی نہ کوئی تو راستہ چاہیے تھا۔ تمہارے ابو نے بہت نقصان دیا۔ لیکن دیکھو۔ اللہ نے پھر بھی ہمیں کامیاب کر دیا اور تمہارے ابو کا انجام۔''

''تم بار بار تمہارے ابو تمہارے ابو مت کہو۔'' شفا نے ناک چڑھایا۔

''ٹھیک ہے نہیں کہتا۔'' حاسم نے تابعداری سے کہا۔

''گھر چلیں، امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔''

کتنے ہی لمحے خاموشی کی گود میں سر رکھ کر سو گئے تھے۔ جب شفا نے کہا۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پارک میں رش بڑھتا جا رہا تھا۔ بچے سامنے ہی کھیل رہے تھے۔ اور سورج..... شفا نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ جہاں سورج اپنی سنہری کرنوں کو سمیٹنے کے بعد اب اپنی نارنجی کرنیں بھی سمیٹنے کی تیاری میں تھا۔ پرندوں کا ایک غول عین سورج کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

''اور جو میں انتظار کر رہا ہوں وہ.....'' حاسم نے ناراضی سے کہا۔ شفا نے آسمان سے نظریں ہٹا کر حاسم کی طرف دیکھا۔

''حاسم! تمہیں بہت اچھی لڑکی مل سکتی ہے۔ میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔'' شفا رسانیت سے

pklibrary.com

کہتے ہوئے اس کے پاس آ گئی۔

"تم ایسا کیوں سوچتی ہو شفا! کیا کبھی امی یا پھر میری بہنوں نے تمہیں کچھ کہا۔ جہاں تک بات ابو کی ہے۔ وہ تو سب کو ہی کہتے ہیں اور میں جانتا ہوں۔ مجھے بہت اچھی لڑکی مل سکتی ہے۔ جو مجھ سے بہت محبت بھی کر سکتی ہے۔ مگر میں اپنے دل کا کیا کروں جسے بس تم پسند ہو۔" کہتے ہوئے حاسم نے بے بسی سے شفا کو دیکھا۔

"میں تمہارے لائق نہیں ہوں حاسم!"

"یہ بھی تم نے ٹھیک کہا۔ لیکن کوشش کر لینا۔ میں تمہیں ٹائم دے دوں گا۔ اور ہاں یہ فیصل والا کیا سین تھا۔" حاسم کو جیسے یاد آیا۔ شفا کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"ہم ان لوگوں کو بھول نہیں سکتے۔" اس کے چہرے پہ غصے کی لالی بکھرنے لگی۔

"اوکے۔" حاسم نے فوراً ہاتھ اٹھا کر سیز فائر کیا۔ شفا چند لمحے حاسم کی طرف دیکھتی رہی۔ اور پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"چلو ایک کام کرتے ہیں۔ تم مجھ سے شادی کر لو۔ محبت تم سے میں کر لوں گا۔" حاسم نے کھڑے ہوتے ہوئے صلاح دی۔ شفا خاموشی سے حاسم کی طرف دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ چڑ گیا۔

"میں ہی گھامڑ ہوں، چغد ہوں۔ جو بار بار تمہیں کہتا ہوں۔" وہ کہتا ہوا غصے سے باہر کی طرف بڑھ گیا۔ شفا وہیں کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شفا نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کیا۔ اور پارک سے نکلنے سے پہلے اس نے اپنی مٹھی میں کچھ چھپا لیا۔

وہ باہر آئی۔ تو گاڑی سے ٹیک لگا کر حاسم چہرے پہ جہاں بھر کی ناراضی سجائے کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر شفا حاسم کی طرف مڑی۔

"سنو۔" اس نے حاسم کو پکارا۔

چہرہ شفا کی طرف موڑا۔ شفا نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنی بند مٹھی میں موجود پھول کو اس کے سامنے کر دیا۔ حاسم کے چہرے پہ بے یقینی کے تاثرات ابھرے۔

"یہ لیں۔" وہ پورے کا پورا شفا کی طرف مڑا۔ شفا نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مجھے نہیں معلوم محبت کیا ہے۔ لیکن حاسم! مجھے لگتا ہے۔ میں بہت لکی ہوں۔ مجھے عزت اور خلوص کے ساتھ بہت ساری محبت بھی ملے گی ہے نا۔"

شفا کہہ کر نم آنکھوں سے مسکرائی۔ حاسم نے خوب صورت مسکراہٹ کی ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ اور اس کی ہتھیلی پہ سجا پھول اٹھا کر اپنے ہاتھ میں سجا لیا۔

"محبت پہلے عزت سکھاتی ہے پھر خلوص۔" اس نے کہا اور پھول کی پتیاں کر کے شفا پہ ڈال دی۔ شفا کھلکھلا کر ہنسی۔ اور اس کی ہنسی میں حاسم کی ہنسی بھی شامل تھی۔ شفا کو لگا وہ دونوں ہی نہیں ہر چیز مسکرا دی ہے۔

"محبت درد نہیں، سکون کا نام ہے۔" وہ بڑبڑائی۔ اور اپنی آنکھوں کے بھیگے گوشوں کو صاف کرنے لگی۔

اسے یقین تھا۔ اس کی ماں اس کا جواب ہاں میں سن کر بہت خوش ہو گی یعنی اب ان کی زندگیوں میں خوشیوں کی پہلی دستک دی جا چکی تھی۔ اور شفا نے ہنستے ہوئے اپنے دل اور زندگی کے دروازے خوشیوں کے لیے وا کر دیے تھے۔

"چلیں۔" حاسم نے جھک کر شفا سے استفسار کیا۔

شفا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لی دو آنسو چپکے سے اس کی آنکھوں کے کنارے سے نکلے۔ اور دامن میں کھو گئے۔ یہ آخری آنسو تھے۔ جو اس نے امین بھٹی کے لیے بہائے تھے۔

☆

pklibrary.com

اُمِ ہانی

پوتی نواسی اور میں

''اب آپ بتائیں کہ نواسے نواسیاں زیادہ اچھے لگتے ہیں کہ پوتے پوتیاں؟''

دعوت کے اختتام پہ ازکیٰ کی ممانی اپنی اکلوتی بیٹی کے بچوں کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے پوچھنے لگیں تو میں جواب دیتے ہوئے کچھ متامل ہوئی۔ کہیں ازکی میرا جواب سن لیتی تو اسے بُرا بھی لگ سکتا تھا۔ میرے لیے مشکلات کھڑی ہو سکتی تھیں کیونکہ میں تو رہتی ہی تیمور اور ازکیٰ کے ساتھ تھی۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کون پالتا۔ ڈرائنگ روم میں اس وقت ازکیٰ کی ممانی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس کے ماموں تیمور کے ساتھ باہر ٹیرس پہ چلے گئے تھے۔ کھانے کے بعد وہ کافی کھلی فضا میں بیٹھ کر پیتے تھے۔ اسی لیے تیمور نے ان کے لیے باہر ٹیرس پہ کرسیاں لگا دی تھیں جبکہ ازکی کچن میں کافی بنا رہی تھی۔

''پوتی آپ کے پاس رہتی ہے، نواسہ نواسی دور ہوتے ہیں۔ کس سے زیادہ محبت محسوس ہوتی ہے۔'' وہ مجھ سے جواب لیے بنا ٹلنے والی نہیں تھیں۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا مبادا ازکی نہ سن لے۔

''یہ فطری بات ہے کہ وہ مجھ سے دور ہیں، کبھار آتے ہیں کچھ دنوں کے لیے تو ان سے زیادہ محبت ہے۔''

''لیکن پیار زیادہ وہ نہیں لگتا جو ہر دم ساتھ رہتا ہے۔ ہر وقت آنکھوں کے سامنے، آنکھوں کا تارہ بن کر۔ دور والوں سے تو قربت نہیں ہوتی۔۔۔

pklibrary.com

''نواسے نواسیاں زیادہ پیارے لگتے ہیں نجانے کیوں' بھلے دور ہی رہتے ہوں۔'' میں نے دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔

اسی وقت کافی کے مگ لیے ازکیٰ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح سپاٹ تھا۔ میں اندازہ نہیں لگا سکی کہ اس نے میرا جواب سنا ہے یا نہیں۔ اس کا چہرہ تاثرات چھپانے کا ماہر تھا۔ میں کبھی اندازہ نہیں لگا سکی تھی کہ وہ کیا سوچتی اور کیا محسوس کرتی ہے۔ اس وقت بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ازکیٰ کی ممانی آگے بھی کچھ کہہ رہی تھیں لیکن میری ساری حسیات اپنی بہو کے تاثرات کو ماپنے میں جت گئیں، جواب کافی کے مگ ہمارے سامنے رکھتے ہوئے اٹھ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا تھا کہ اس کا چہرہ تو بے تاثر تھا لیکن اس کی نگاہیں کچھ دھندلائی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

بات محض اتنی سی ہے کہ رملہ، میری اکلوتی پوتی ہے اور تارہ، میری اکلوتی نواسی۔ دونوں میں سال بھر کا فرق تھا۔ مجھے دونوں سے محبت ہے کیونکہ دونوں میرا خون ہیں لیکن تارہ سے محبت زیادہ ہے بلکہ بہت زیادہ۔ شاید سب نانیوں کو ہی اپنے نواسے نواسیوں سے زیادہ پیار ہوتا ہے۔ بیٹیاں دور ہوتی ہیں تو زیادہ پیاری لگتی ہیں۔ پھر دور رہ کر ماں باپ کی لیے متفکر رہتی ہیں۔ احساس زیادہ کرتی ہیں۔ ان کی اولاد بھی اسی سبب زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ازکی مجھے بطور بہو زیادہ پسند نہیں تھی۔ ایک تو خاندان سے نہیں تھی، دوسرا بہت کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والی۔ نہ کسی دکھ میں شامل نہ کسی سکھ پہ خوش۔ نہ کوئی شکوہ نہ شکایت۔ بس مٹی کی مورت سی خاموش، کاموں میں محو۔ وہ میری ہم مزاج نہیں تھی اسی لیے محبوب بھی نہیں تھی۔ رملہ کو دل نے ہمیشہ تیمور سے زیادہ ازکیٰ کی بیٹی کے روپ میں ہم دادیاں اکثر پوتے پوتیوں سے اسی حساب سے محبت کرتی ہیں جتنا ان کی ماں ہمیں پسند ہوتی ہے۔ اسی لیے مجھے بھی رملہ سے انسیت کم تھی حالانکہ وہ ہر وقت میرا سایہ بنی رہتی تھی۔ جس پیار سے وہ مجھے 'میری دادو' کہتی تھی کبھی عثمان یا تارہ نے 'ہماری نانو' نہیں کہا تھا۔ جس محبت سے وہ مجھ سے لاڈ کرتی تھی، عثمان اور تارہ کبھی نہیں کرتے تھے لیکن بات وہی ہے کہ وہ نور کے بچے تھے جو مجھے تیمور سے زیادہ عزیز تھی۔

نور کے لیے میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ بناتی، جوڑتی رہتی تھی کہ جب وہ ملنے آئے تو اسے ایک بیگ بھر کر واپس بھیجوں۔ سب ہی مائیں ایسا کرتی ہیں۔ بیٹیاں ایک بیگ میکے لاتی ہیں تو مائیں عموماً ایک اور بیگ ساتھ ضرور کر دیتی ہیں۔ میں بھی یہی کرتی تھی۔ سارا دن سلائی مشین پہ بیٹھ کر تارہ اور نور کے کپڑے سیتی رہتی۔ عثمان کے کرتا شلوار سلائی کرتی رہتی حالانکہ مجھے ٹھیک ٹھاک کمر درد رہتا تھا۔ اسی وجہ سے میں گھر کے کام کم ہی کرتی تھی۔

تارہ اور نور کے لیے کپڑے سلائی کرتے ہوئے ایک آدھ جوڑا میں رملہ کے لیے بھی سلائی کر دیتی تھی کہ بہو کا منہ نہ بنے اور وہ اسی پہ گھوم گھوم کر سب کو دکھاتی کہ اس کی دادو نے اس کے لیے فراک سی ہے۔

تیمور کے دیے جانے والے جیب خرچ میں سے بچا کر میں عثمان اور تارہ کے لیے ڈھیروں چیزیں خرید کر چھپا دیتی کہ کہیں ازکیٰ نہ دیکھ لے اور جاتے ہوئے وہ شاپرز ان کے بیگ میں چھپا دیتی۔ رملہ کے لیے کبھی کبھار ہی دل کچھ لینے پہ تیار ہوتا تھا کہ اس کے پاس خالہ، ماموں اور نانی کے دیے ہوئے بے تحاشا تحائف اور کھلونے ہوتے تھے۔

اسے ہمیشہ میں نے دور دور سے ہی پیار کیا تھا۔ دور کا لاڈ، اوپر اوپر کی فکر۔ دل سے مجھے اس کی اور ازکی کی کبھی زیادہ پروا نہیں رہی تھی۔ وہ جو دادیاں

کوئی چڑتی ہیں، ان کا جیاں اڑتی ہیں، ان
دادیوں میں میرا شمار نہیں ہوتا۔ بلکہ مجھے کہنے دیجیے کہ میں ان دادیوں میں شمار ہوتی ہوں جو پوتی کے پاس کچھ نیا، کچھ اچھا دیکھ کر تلملا اٹھتی ہیں۔ جو اپنی ہی پوتی کی کامیابی سے حسد کرتی ہیں۔

ہاں یہ حسد ہی تھا جو از کی سے شروع ہوا تھا کہ اس نے میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا اور اب رملہ اس کی زد میں آ رہی تھی۔ اور حسد ایسا جذبہ ہے کہ اگر خونی رشتوں میں در آئے تو کبھی ان کی خوشی اور بھلا چاہ ہی نہیں سکتا بے شک پھر سامنے دادی پوتی کا پیارا رشتہ ہی کیوں نہ ہو۔

☆☆☆

زندگی اسی طرح گزرتی رہی۔ ہر اچھی چیز نور اور تارہ کے لیے میرے دل کا ارمان بن جاتی اور ہر کری پڑی شے رملہ کو دے جانے کی خواہش ہوتی۔ لیکن ایک قسمت ہی خواہش اور چاہت بھی تو ہوتی ہے جس سے انسان نہیں جیت سکتا۔ قدرت کی کرنی تھی کہ رملہ تارہ سے کہیں زیادہ ذہین، دوسروں کی توجہ کا مرکز بننے والی اور خوب صورت تھی۔ اور یہ نعمتیں میں اس سے چاہ کر بھی چھین نہیں سکتی تھی۔ ہمیشہ تعلیمی لحاظ سے وہ تارہ سے آگے رہی تھی۔ اسی وجہ سے اس نے الیکٹریکل انجینئرنگ مکمل کر لی اور تارہ محض بی بی اے کر سکی۔ مجھے رملہ کی اس کامیابی پہ خوشی سے زیادہ تارہ کا دکھ تھا کہ وہ کیوں اس طرح کامیاب نہیں ہو سکی جیسے رملہ تھی۔

رملہ کے انجینئر بننے کی دیر تھی کہ نور نے عثمان کے لیے اس کے رشتے کی بات کی۔ مجھے نور کی یہ خواہش کسی طور بھی نہیں بھائی تھی۔

''میرا نہیں خیال کہ رملہ اور عثمان کا کوئی جوڑ ہے۔'' نور نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ اسے اپنی بھتیجی سے بہت محبت تھی، اسی لیے وہ ایسا چاہتی تھی کہ وہ اس کی بہو بنے۔

''کیوں امی۔ ایک ساتھ کتنا جچتے ہیں اور...

کہ اس کے سوتن ہی تو مجھے نہیں بھاتے۔

''تم حمنہ کے لیے کیوں نہیں سوچتیں۔ وہ تمہاری نظروں کے سامنے پلی ہوئی بچی ہے۔'' میں نے اس کا دھیان اس کے دیور کی بیٹی طرف دلایا۔

''وہ بھی اچھی ہے لیکن رملہ میرا اپنا خون ہے۔ مجھے زیادہ پیاری ہے۔'' میرا اعتراض وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

''سمجھا کرو بیٹا۔ از کی نے کبھی ہم ماں بیٹیوں سے ہمدردی نہیں کی۔ کبھی ہم سے اپنائیت نہیں جتائی۔ اس کی بیٹی بھی ایسی ہی ہوگی۔ پھر اس کا دماغ اتنا پڑھ لکھ کر بہت آسمان پہ پہنچ چکا ہے۔ عثمان ایسی لڑکی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گا۔''

نور جواباً خاموش ہو گئی تھی اور پھر اس نے عثمان اور حمنہ کا رشتہ طے کر دیا۔ ان کے رشتے کی اطلاع جب میں نے تیمور اور از کی کو دی تو ایک سایہ سا از کی کے چہرے پہ لہرا گیا لیکن وہ خاموش رہی تھی۔ یقیناً اس کی ایک امید ٹوٹ گئی تھی مگر میں اندر سے مطمئن تھی۔

تب ہی رملہ کے لیے میرے منہ بولے بھتیجے نے اپنے ڈاکٹر بیٹے کا رشتہ بھیجا تھا۔ اس رشتے سے میرے دل پہ سانپ لوٹنے لگے۔ بھلا تارہ میں کیا کمی تھی کہ اس نے رملہ کے لیے سوچا۔ مجھے ہر حال میں اسے تارہ کے لیے منانا تھا۔ یہی سوچ کر میں گھر سے نکل رہی تھی کہ گیٹ سے نکلتے میرا پیر پھسلا اور میرے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ آپریشن کے بعد بستر سے لگی تو اٹھ ہی نہیں سکی۔

☆☆☆

نور اور بچے آئے تھے۔ حال احوال پوچھا، دو دن رکے اور چلے گئے۔ جس تارہ سے میں جی جان سے محبت کرتی تھی، وہ میرے لاغر وجود کے پاس بھی نہیں پھٹکی۔ اس کا حال چال پوچھنا دور دور سے تھا۔ میرے کمرے سے اسے دوائیوں کی بدبو آتی تھی اسی لیے وہ ناک پہ رومال رکھ کر اندر آئی۔ کچھ دیر بیٹھ کر

pklibrary.com

مجھے اٹھانا بٹھانا، کھلانا پلانا، میرے کپڑے بدلنا، بال بنانا سب کچھ تو رملہ کرتی تھی۔ اس نے اپنی نئی نوکری چھوڑ دی وہ بھی میری خاطر۔

"کیوں اپنا مستقبل ضائع کر رہی ہو۔ نجانے تمہاری دادی کتنے عرصے بستر پہ رہیں۔ تم کب تک ان کے لیے گھر بیٹھ سکتی ہو؟" ازکی کی دبی دبی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ اندر کچھ ٹوٹا تھا۔ لیکن میرے ساتھ وہی سب تو ہو رہا تھا جو میں نے بویا تھا۔ محبت بوئی نہیں تو کانٹے کا خواب کیوں بُن رہی تھی۔

"جب تک دادو ٹھیک نہیں ہو جاتیں، میں ان کے ساتھ رہوں گی ماما۔ آپ اکیلی ان کا خیال نہیں رکھ سکتیں۔ بستر پہ پڑے بندے کے سو کام ہوتے ہیں۔" میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"ساری زندگی تارہ تارہ کرتی رہیں، اب کہاں گئی تارہ؟ بلائیں نا اپنی نواسی کو کہ آ کر انھیں دیکھے۔"

پہلی بار ازکی کو میں نے یوں اپنے خلاف بولتے سنا تھا۔ یہ سوال میں نے خود سے بھی کیا کہ کہاں گئی اب تارہ۔ ساری زندگی جس پہ میں محبتیں نچھاور کرتی رہی، وہ کیوں چند دن تیمارداری کے لیے میرے لیے نہیں آ سکی۔

"دادو ہماری ذمہ داری ہیں، پھپھو اور ان کے بچوں کی نہیں ہیں۔ ساری زندگی وہ ہمارے پاس رہی ہیں، اب جب بستر سے لگی ہیں تو انھیں پھپھو اور ان کے بچوں کے حوالے کر دیا جائے کیا؟"

آہ، دل میں کہیں ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔ یہ سوچ کبھی میرے اندر کیوں نہیں پیدا ہو سکی کہ جن رشتوں کے درمیان رہ رہی ہوں، خلوص اور محبت بھی ان ہی سے نبھاؤں۔ کیوں میں ساری زندگی پوتی، نواسی میں اتنا فرق کرتی رہی۔ ایک سے دل و جان سے محبت اور دوسری سے حسد اور رقابت۔

ازکی میرے لیے پرہیزی کھانے بناتی تو رملہ سارے کام اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتی تھی۔ ازکی مجھ پہ ایک خاموش نگاہ ڈال کر پلٹ جاتی۔ نجانے کیوں لگتا تھا کہ وہ مجھے بہت کچھ جتا رہی ہے۔ یہ وہی رملہ تھی جس کی کوئی خوشی مجھے نہیں بھاتی تھی۔ جس کو ہمیشہ میں نے بیٹے کی بیٹی نہیں، بہو کی بیٹی کی نظر سے دیکھا تھا۔ آج اسی رملہ نے مجھے کیسے سنبھال لیا تھا۔ آج تارہ کہیں نہیں تھی اور بس رملہ ہی رملہ تھی۔

اس رات وہ مجھے کھچڑی کھلا رہی تھی۔ جب میں نے روتے ہوئے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

"سدا خوش اور سکھی رہو۔ کامیابی تمہارے قدم چومے اور کبھی کسی قسم کی تکلیف اور مصیبت نہ دیکھو۔" پہلی بار بہت دل سے دعا کی تھی۔

رملہ نے میرے ہاتھ چوم لیے۔

"آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گی دادو۔" یہ اس کی کوششیں ہی تھیں جن کی بدولت میں اب بیٹھنے لگی۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ پہلی بار میں نے اسے تیمور کی بیٹی کے طور پہ قبول کیا تھا۔ اپنی پوتی کے طور پہ۔

"رملہ کے لیے آئے رشتے کا کیا بنا؟" ازکی جو میرے کپڑے الماری میں رکھ رہی تھی میرے سوال پہ مڑی۔

"جواب دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

"فون کر کے بلا لو۔ اس سے اچھا کیا رشتہ ملے گا۔" ازکی سر ہلا کر چلی گئی۔

میں نے رملہ کو گلے لگا لیا۔ وہ مسکرا دی اور میری آنکھ میں آئے آنسو صاف کر ڈالے۔

پہلی بار مجھے لگا تھا کہ رشتے وہی اپنائیت بھرے ہوتے ہیں جن میں احساس ہو، قربت ہو، ہمدردی ہو۔ ورنہ خونی رشتے بھی اپنے نہیں لگتے۔ رملہ میری پوتی، میرے اکلوتے بیٹے کی بیٹی، مجھے ہر وقت 'میری دادو' کہنے والی، میری تیماردار، میری ہمدرد۔ کل جس سے میں حسد کرتی تھی، آج میں اس کی محبت میں بری طرح مبتلا ہو چکی تھی۔

☆

pklibrary.com

صبا زین

نازک

راحیل کو اچانک وکالت پڑھنے کا شوق ہوتا ہے۔ کومل بھی اس کے کالج میں پڑھتی ہے۔ اس کی کزن لائبہ ایک خوب صورت لیکن غریب لڑکی ہے۔ کومل ایک انتہائی عام سی شکل وصورت کی لڑکی ہے لیکن پڑھائی میں بہت اچھی ہے عادت واخلاق کی بھی۔ راحیل اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔
راحیل اور کومل کا رشتے طے ہو جاتا ہے۔ راحیل اپنے دوستوں کے ساتھ ساتھ کومل اور اس کی کزن کو بھی اپنے فارم ہاؤس پر مدعو کرتا ہے اور راحیل کی بہن بھی وہاں ہوتی ہے۔ کسی کام سے کومل اور راحیل کی بہن باہر جاتی ہیں۔ لائبہ ایک کمرے میں سو رہی ہے۔ راحیل اس کمرے میں جاتا ہے۔

دوسری اور آخری قسط

اس نے راحیل کو بتایا تو اس نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔
"تیار ہو جانا۔" اس کا جواب دو لفظی تھا۔
اور یہ دو الفاظ بھی اس نے ایسے ادا کیے تھے، جیسے اس کو گن گن کر الفاظ دان کیے گئے تھے۔
مگر کبھی کبھی یہ خاموشی انسان کو اندر سے کاٹ دیتی ہے۔
آج وہ خاص تیاری کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔

ایسی تیاری جو راحیل کی خاموشی توڑ دے۔
اسے یاد تھا جب ولیمے کے اگلے دن زرنش

اس کا زیور لے کر اس کے پاس آئی تھی۔
"یہ رہی تمہاری امانت۔ اب اسے سنبھال کر رکھو۔"

مکمل ناول

pklibrary.com

اس کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ لاکر کی چابی کہاں ہے؟

وہ کونوں کھدروں میں لاکر کی چابی ڈھونڈنے لگ گئی تھی۔

اس کے میکے کی طرف سے کوئی زیور نہیں پہنایا گیا تھا۔

اس کے کانوں میں شادی سے پہلے جو چھوٹے چھوٹے ٹاپس تھے، وہ بھی اس نے جانے سے پہلے سیما کو دے دیے تھے۔

اگر قیمت ادا کرنی تھی تو پوری طرح ہی ہو جائے۔

ہر جگہ تلاش کرنے کے باوجود اس کو چابی نہیں مل کر دے رہی تھی۔

اس کو ایسا لگ رہا تھا اس کمرے کے مکین کی طرح اس کے فرنیچر نے بھی اس کو قبول نہیں کیا تھا۔

جب وہ چابی ڈھونڈ رہی تھی تو اس کو ایک شاپنگ بیگ ملا۔

یہ شاپنگ بیگ راحیل کے کپڑوں کے پاس پڑا تھا۔

اس کا اور راحیل کا ایسا تعلق نہیں تھا کہ وہ اس کی الماری درست کرتی یا اس کو کپڑے نکال کر دیتی۔

تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے سوٹ باہر نکالا تو وہ لان کا زنانہ جوڑا تھا۔

اس کو لگا کہ اس نے یہ سوٹ پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔

ذہن کی سلیٹ پر ایک یاد ابھری۔

"یار! یہ ڈریس کتنا زبردست ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ یہ ڈریس آرڈر کر دوں۔" یہ کومل تھی جو ایک تصویر کو گھورے جا رہی تھی۔

اس وقت وہ فارغ پیریڈ میں انسٹاگرام چیک کر رہی تھی۔

اس نے کومل کے اسمارٹ فون میں جھانکا تو وہاں ایک دلکش سی ماڈل، خوب صورت سا جوڑا پہنے

وہ خواب میں بھی اس جوڑے کو آرڈر کرنے کا سوچ نہیں سکتی تھی۔

"فائدہ کچھ نہیں ہوگا اگر تم یہ لے بھی لو تو۔ ضروری نہیں کہ ہر چیز ہر انسان پر اتنی ہی پیاری لگے، جتنی اس پر لگ رہی ہے۔" اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

کومل کے چہرے پر ایک پل کے لیے سیاہ رنگ گزر گیا۔ پھر دوسرے پل وہ خود کو کمپوز کر کے سر ہلا کر رہ گئی۔

"صحیح کہہ رہی ہو تم۔ ویسے بھی مجھے اتنے شوخ رنگ کہاں پسند ہیں۔" اس کا لہجہ عام سا تھا، تقریباً بے تاثر۔

"انگور کھٹے ہیں۔" وہ منہ ہی منہ بڑبڑائی۔

"مجھے دکھاؤ۔" راحیل ان کے پاس والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور خود بھی موبائل پر لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنا موبائل ایک طرف رکھا اور پیچھے جا کر کومل کے فون میں جھانکا۔

"یہ برانڈ میں جانتا ہوں۔ اکثر ایشا اس سے آن لائن شاپنگ کرتی ہے۔ میں اس کو کہہ کر تمہیں منگوا دوں گا۔"

"نہیں بھئی، یہ رنگ مجھ پر کہاں اچھا لگے گا۔" اس نے عام سے لہجے میں جواب دیا اور لائبہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

اس کو نہیں معلوم تھا کہ بعد میں راحیل نے کومل کو اور کومل نے راحیل کو کیا کہا تھا۔

اس نے بیگ میں ہاتھ ڈالا تو وہاں پر ایک مستطیل مخملی ڈبہ پڑا ہوا تھا۔

وہ ڈبہ اس کے کسی زیور کا نہیں تھا۔

وہ دیکھنا تو نہ چاہتی تھی مگر پھر بھی کھول لیا۔

وہ سونے کی باریک چوڑیاں تھیں۔

ایسے جیسے کانچ کی چوڑیاں ہوتی ہیں۔

اس کے نقش و نگار اتنے دلکش تھے کہ وہ ایک پل کے لیے مبہوت ہو گئی۔ اس نے ان کو ڈبے سے

pklibrary.com

''پتا نہیں تم دونوں کا گزارا کیسے ہوگا؟ یونو کومل، اس کو بہت شوق ہے ان ساری چیزوں کا! ہر شادی کے موقع پر اتنی ساری مہندی اور چوڑیاں میرے اور بھابھی کے لیے لے کر آتا ہے ناں! بھلے ہم پہنیں یا نہ پہنیں اور تمہیں پتا ہے، اس نے تمہاری منہ دکھائی کیا پلان کی ہے؟''

ایشا کی آواز اس کے خیالوں میں گونجی۔

اگر یہ راحیل کی دلہن کی منہ دکھائی تھی تو وہ سونے ہاتھوں کے ساتھ کیوں تھی؟

اس نے اس وقت چابی ڈھونڈ کر چوڑیاں بھی اپنے زیور کے ساتھ الماری میں رکھ دیں۔

اس نے اس دن سے آج تک نہ اس ڈریس کو ہاتھ لگایا تھا اور نہ ہی چوڑیوں کو۔

اس نے الماری سے دونوں چیزیں باہر نکال لیں۔

نہ آج الماری نے اس کو دیکھ کر چوں کیا، نہ ہی چابی کہیں چھپ کر بیٹھ گئی۔

اصل مالک خاموش تھا، اور اسی خاموشی کو توڑنے کے لیے وہ آج یہ سب پہننے والی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ وہ اور کومل دیکھنے میں جتنے بھی الگ ہوں، ان کی جسامت ایک جیسی تھی۔

دونوں چیزیں اس کو ایسے پوری آئی تھیں، جیسے اسی کے لیے ہی بنی تھیں۔

اگر ڈاکہ ڈالنا تھا ہی تو پوری طرح ڈالنا چاہیے۔ تاکہ کوئی افسوس باقی نہ رہ جائے۔

راحیل اس کی تیاری دیکھ کر ایک پل کے لیے چونکا۔ کسی یاد کا سایہ اس کے چہرے پر ایک پل کے لیے آیا اور دوسرے ہی پل اس نے اپنے تاثرات پتھر کر لیے۔

اگر وہ اس سے نظریں چرانے میں تھوڑی جلدی کر لیتا تو لائبہ اس کی سبز آنکھوں میں ماضی کی سیاہی بھی نہیں دیکھ پاتی۔

سارا راستہ خاموشی سے کٹا۔ راحیل اس کو گلی

اس کو نہیں معلوم تھا کہ وہ واپس بھی آئے گا یا نہیں۔

گلہ شکوہ اس کو کبھی بھی راحیل سے نہیں تھا۔ اس لیے چپ چاپ اندر آ گئی۔

اندر یمنیٰ آپی پہلے سے ہی موجود تھیں۔

''حمنہ آپی نہیں آئیں؟'' اس نے سلام دعا کے بعد بیٹھتے ساتھ ہی پوچھا۔

''نہیں، نعیم بھائی نے اس کو اپنے پاس کویت بلا لیا ہے۔ تمہیں نہیں پتا چلا؟'' یمنیٰ آپی نے حیرت سے پوچھا۔

عرصہ ہوا لائبہ کا خود سے رابطہ بڑی مشکل سے ہو پاتا تھا، وہ کسی اور سے رابطہ کیا رکھتی؟

''یہ رشتہ کس نے کروایا ہے؟'' یمنیٰ آپی نے شاید ابھی امی سے معلومات نہیں لی تھیں۔

''کومل کے توسط سے آیا ہے۔''

وہ مختصراً جواب دے کر اپنے مینی کیور ہوئے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔

''کومل کب سے رشتے کروانے لگی ہے؟''

''اس کا کوئی ساتھی وکیل ہے۔ اس کی امی لڑکی دیکھ رہی تھیں تو اس نے امی سے رابطہ کروا دیا۔''

''ویسے خالہ نے عاصمہ کے لیے اسد کا نہیں بولا تھا؟ عاصمہ چھوٹی سی تھی، تب سے خالہ کہتی تھیں کہ وہ اس کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔'' یمنیٰ اپنی شادی کے بعد سسرال کی ہی ہو گئی تھی، اس لیے میکے کی خبر کم کم ہی رکھتی تھی۔

''گئے وہ دن جب امی ابو کسی بھی ایرے غیرے کو اپنی بیٹی کا ہاتھ تھما دیں گے۔'' لائبہ نے بظاہر کندھے اچکا کر لاپروائی سے کہا۔

''خالہ کون سا غیر ہیں؟'' یمنیٰ کو حیرت ہوئی

''مگر غریب تو ہیں ناں؟''

''چلو شکر کرو کہ حمنہ آپی کو بھی سکھ نصیب ہوا۔ نعیم بھائی کو بھی یاد آ ہے کہ ان کے پردیس جانے کے بعد ان کے بیوی بچے اکیلے رہتے ہیں، اب ان

pklibrary.com

''اور آپ کا کیا؟ آپ کی سن لی گئی ہے یا نہیں؟''

''میری تو خیر بات ہی الگ ہے۔ نعیم بھائی جیسے بھی تھے، ان کو کم از کم احساس تو تھا، مگر جہاں احساس ہی نہ ہو، وہاں کیا گلہ شکوہ۔'' یمنیٰ آپی نے ایک آہ بھری۔

ایسی آہ جو لائبہ بھی بھرنا چاہتی تھی۔ مگر اجازت نہیں تھی۔

''ہاں، سمجھ سکتی ہوں۔''

اس جملے کے بعد یمنیٰ نے بے حد گہری نظروں سے اس کو دیکھا۔

لائبہ نے ان کے دیکھنے پر نظریں چرائیں۔

''تم خوش ہو نا لائبہ؟''

لائبہ نے ان کو ایک نظر دیکھا پھر چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

''خوشی بہت بڑا لفظ ہے آپی! میں ویسی ہی ہوں جیسی سب مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ مجھے ہونا چاہیے..... خوش حال۔''

''راحیل کیوں نہیں آیا؟ شادی سے پہلے جب میں اس سے ملی تھی تو وہ تو بڑا ہنستا مسکراتا لڑکا تھا۔ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ جب امی نے بتایا کہ تمہاری شادی اس سے ہو رہی ہے تو مجھے تو بہت خوشی ہوئی تھی کہ چلو کوئی تو ہم میں سے ہوگا جس کو ایک اچھا شوہر ملے گا۔ مگر اب تو ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی اور ہی شخص ہے۔ تم بتاؤ اس کا اصل روپ کون سا ہے؟''

''دونوں ہی اصل روپ ہیں۔ بس ایک چھپا تو دوسرا سامنے آ گیا۔'' لائبہ نے اپنی چوڑیوں کو بے خیالی سے چھوا۔

''پتا نہیں کیا ہوا ہے؟ اس وقت تو لگ رہا تھا کہ تم دونوں کی بڑی دھواں دار محبت ہے۔ تم نے بھی تو کہا تھا کہ آپی وہ میری خوب صورتی کے سحر میں ہیں۔''

''محبت تو کسی اور سے تھی ان کو۔ مگر میری پھیر دی تھیں۔ اب خوب صورتی کا نشہ تو اتر گیا تو پھر پیچھے صرف محبت رہ گئی۔''

''ویسے میں نے سنا تھا کہ اس نے تمہارے ساتھ؟'' آپی چاہ کر بھی جملہ مکمل نہ کر پائیں۔

''نہیں، بالکل بھی نہیں۔'' وہ پھر کر پیچھے ہٹی۔ جس راز کو وہ خود کے سامنے بھی نہیں دوہرانی تھی، وہ کسی اور کے سامنے کیسے فاش کرتی۔

''اچھا، ٹھیک ہے۔ اتنا غصہ تو نہیں کرو۔ یہ کومل کا پھپھو نے کہیں رشتہ نہیں کیا؟ دوسروں کے تو ڈھونڈ رہی ہے اپنے لیے بھی ڈھونڈ لے کوئی۔'' یمنیٰ نے فوراً بات بدلی۔

''مجھے کیا معلوم آپی، میرا کون سا پھپھو سے کوئی رابطہ ہے۔ پڑھائی، پھر گھر، ابھی تو جا کر میری گرومنگ کی کلاس ختم ہوئی ہے۔ اپنی بہن کا تو باہر جانے کا مجھے معلوم نہیں تھا تو کومل کے رشتے کا کیا پتا چلتا۔'' لائبہ کے لہجے میں صاف بیزاری تھی۔

''میں تو صرف یہ پوچھ رہی تھی کہ تمہاری شادی سے پہلے پھپھو نے بڑا چرچا کیا تھا کہ اس کے کسی کلاس فیلو کا رشتہ آیا ہوا ہے۔ مگر پھر اچانک سب چپ ہو گئے۔ تمہیں تو پتا ہی ہوگا۔ تم دونوں ایک ساتھ ہی یونیورسٹی جاتی تھیں۔''

''کیا پتا آپی۔ وہ الگ کلاس میں پڑھتی تھی اور میں الگ۔ مجھے اس کی ساری کلاس کا تھوڑی کوئی پتا ہے۔'' اب کی بار لائبہ کے لہجے میں حد سے زیادہ بیزاری تھی۔

''نہیں، تم دونوں کی دوستی بھی بہت زیادہ تھی۔ تمہیں کچھ نہ کچھ تو بتایا ہوگا۔'' آپی ابھی بھی ہار ماننے کو تیار نہ تھیں۔ لائبہ اچھی طرح جانتی تھی کہ آپی یہ اس لیے کہہ رہی تھیں کہ وہ کومل کو نیچا دکھا سکیں۔

کومل کے لیے اس طرح کا رویہ ان سب کے لیے عام تھا۔ یہ ان کے ساتھ پھپھو کے رویے کا ردعمل تھا۔

پھپھو اٹھتے بیٹھتے یہ جتاتی رہتی تھیں کہ وہ پانچ

غریب ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ بھی آگے سے جواب دینے لگ گئیں۔ چونکہ وہ بہنیں ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت تھیں۔ تو وہ اکثر باتوں ہی باتوں میں کومل کو اس کی کم صورتی کا اپنے رویے سے ڈھکے چھپے انداز میں احساس دلاتی رہتی تھیں۔

پھپھو کے رویے کا بدلہ وہ ان ڈائریکٹ کومل سے لے رہی تھیں۔

جب کہ اب ان تینوں بہنوں کی اچھی جگہ شادی ہوگئی تھی اور چوتھی کی بھی ہونے والی تھی تو یمنیٰ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔

بس ایک کمینی سی خوشی کہ پھپھو کے گھر پر اتنے وسائل کے باوجود ان کی بیٹی ابھی تک بیٹھی ہوئی تھی۔

''جب تک مجھے کومل کی ضرورت تھی تب تک میں اس کو استعمال کرتی رہی۔ اب جب کہ میں اتنی خوش حال ہوں تو آپ کے خیال میں مجھے کومل کی ضرورت ہے جو اس سے دوستی رکھوں؟'' اب کی بار اس نے سرد لہجے میں یمنیٰ کو دیکھ کر جواب دیا۔

اس کو گرومنگ کی کلاس میں سکھایا گیا تھا کہ اگر کوئی انسان آپ کو زچ کرے تو غصہ نہیں دکھانا۔ بلکہ ایسی بات کرنی ہے کہ اگلا انسان آگے سے کچھ بولنے کے لائق نہیں رہے۔

اسے نہیں پتا تھا کہ یہ حربہ اس کو اپنی بہن پر آزمانا پڑے گا۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو۔ چلو اب امی کا ہاتھ بٹاتے ہیں کچن میں۔'' یمنیٰ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی تو لائبہ بھی اس کے پیچھے چل دی۔

مگر جاتے جاتے یمنیٰ کے دل میں یہ خیال ضرور آیا کہ بھلے پہلے اس کی بہن جیسی بھی تھی لیکن اس قدر سرد مہری لائبہ کے اندر کہاں سے آگئی؟

☆☆☆

اس نے پورے ایک سال، تین مہینے اور چار دن بعد کومل کو دیکھا تھا۔

لائبہ کی بہن کا رشتہ آیا تھا اور اس کو یہ ایت

چونکہ یہ ہدایت براہ راست بابا کی طرف سے تھی تو وہ چاہ کر بھی انکار نہ کر سکا تھا۔

اس پورے دورانیے میں وہ صرف بحالت مجبوری ہی لائبہ کے گھر گیا تھا۔

اس کے اندر ابھی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان لوگوں کا سامنا کر سکے۔

وہ سب بھول سکتے تھے کہ اس نے کیا کیا تھا۔ مگر وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا کہ اس نے کیا کیا تھا۔

لائبہ کا اس کی زندگی میں ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ کبھی بھول نہیں پائے گا کہ اس نے لائبہ کے ساتھ، کومل کے ساتھ اور اپنے ساتھ کیا کیا تھا۔

وہ اس وقت گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا جب کومل نظر آئی تھی۔

لائبہ کے گھر کی طرف جاتی ہوئی گلیاں بہت تنگ اور تاریک تھیں۔ وہ جانے کے لیے جگہ ڈھونڈ رہی تھی۔

اس نے اپنا کالا کوٹ پہنا ہوا تھا اور شاید وہ کورٹ سے سیدھا وہیں آئی تھی۔

وہ اب نہ واپس مڑ سکتا تھا اور نہ ہی آگے جا سکتا تھا۔

نجانے کیوں اس تنگ جاتے اس کے سارے رستے مسدود ہو جاتے تھے۔

کومل کو جب راستہ نہ ملا تو اس نے سامنے دیکھا اور وہیں بت بن گئی۔

اس کی آنکھوں میں شناخت کے بعد کوئی اور بھی جذبہ چمکا تھا۔

نفرت تھی یا محبت راحیل جان نہ پایا تھا۔

اس نے دوبارہ اس کی آنکھوں میں دیکھا تو سوائے اجنبیت کے اس کو کچھ نہیں ملا۔

وہ جو اس کے پاس سے خاموشی سے گزر جانا چاہتی تھی تو وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے راحیل کی طرف سرد نگاہ سے دیکھا۔

''میرا راستہ چھوڑ دو۔''

pklibrary.com

ہے۔'' ایک بار پھر سے صرف کچھ لمحے..... چند لمحے وہ اس کو دیکھنا چاہتا تھا۔

اس کا دل بے چین ہوا..... وہ دل جو نہ جانے کتنے عرصے سے سرد خانے میں پڑا ہوا تھا، اس کی ایک جھلک سے جیسے اس کے آس پاس کی برف پگھلنے لگی تھی۔

''تو پھر بہتر ہے کہ اپنے راستے پر ہی چلو۔''

اب کی بار وہ زمین پر دیکھ رہی تھی، ایسے جیسے اس کی طرف دیکھا تو وہ پتھر کی ہو جائے گی۔

''کومل! میری بات سنو۔'' کیا سنانا چاہتا تھا وہ اس کو؟ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

اتنے عرصے میں وہ ایک بار بھی اس کا خیال دل سے نہیں نکال پایا تھا۔

مگر کبھی بھی ایک پل کے لیے بھی اس کے دل میں اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس سے رابطہ کرے۔ مگر اب جب اس کو دیکھا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں جائے؟ کیسے جائے؟

اگر وہ کسی لوک داستان کا کردار ہوتا تو وہ اس کے لیے دودھ کی نہر کھود نکال لاتا۔

مگر وہ اس سے نظریں چراتی، اس کی طرف اجنبیت سے دیکھتی ہوئی، کالے کوٹ میں کھڑی لڑکی کوئی شیریں نہ تھی۔

وہ اپنے گناہوں کے داغ دھوتا، زندگی سے ہار مانتا ہوا، لڑکا کوئی فرہاد نہ تھا۔

تو ان کی داستان کوئی لوک داستان کیسے ہوتی؟

اس لمحے راحیل نے جانا کہ دودھ کی نہریں نکالنا آسان کام تھا، اپنے نفس پر قابو پانا بہت مشکل.....

''سناؤ، کیا کہنا ہے؟'' اس نے زمانے بھر کی سرد مہری اپنی آنکھوں میں سمو کر اس کی طرف دیکھا۔

راحیل نے اس سرد مہری سے اپنے دل کو ٹھنڈا ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

کچھ جذبے آگ کی طرح ہوتے ہیں۔ کچھ لائبہ کی شکل دیکھ کر وہ برف کا بن جاتا تھا۔

تو آج کومل اس کو برف کیسے بنا رہی تھی؟

زبان پر رکھے سارے جملے بھی جیسے برف بن گئے تھے۔ وہ کیا بولنا چاہتا تھا؟

کیا وہ اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا؟ معافی کی امید میں یا پھر خیر خیریت؟

کچھ بھی تو اس کے پاس نہ تھا۔

سارے الفاظ منجمد ہو گئے تھے۔

کومل نے اس کو سرد ہوتے ہوئے دیکھا اور دوسرے کنارے سے اپنا راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

اس بار اس نے اس کا راستہ نہیں روکا تھا۔

☆☆☆

اس کا پہلے بھی لائبہ کے گھر جانے کا دل نہیں تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ عمیر نے زبردستی اس کو کہا تھا کہ اس کی موجودگی وہاں ضروری تھی۔

اس کو لگا تھا کہ وہاں لائبہ ہوگی مگر راحیل کے ہونے کا امکان اس کے ذہن میں دور دور تک نہ تھا۔ جتنا وہ راحیل کو جانتی تھی، وہ ایک بزدل انسان تھا جو بھاگنے کو آسان راستہ سمجھتا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ لائبہ کے گھر والوں میں آ کر نہیں بیٹھے گا۔ مگر شاید وقت نے کچھ حوصلہ اور ہمت اس کے اندر ڈال دی تھی۔

وہ ممانی سے اچھی طرح ملی تھی اور معذرت خواہ تھی کہ وہ ایسے حلیے میں آ گئی تھی۔

کسی زمانے میں یہ گھر اس کے لیے دوسرے گھر جیسا تھا جہاں آ کر وہ فریش بھی ہو جاتی اور کھانا بھی فرمائش کر کے کھا لیتی تھی۔

مگر آج اس کو جو پروٹوکول مل رہا تھا، وہ ان کی بھانجی ہونے پر نہیں، بلکہ لڑکے کی منہ بولی بہن ہونے پر تھا۔

ابھی عمیر اور اس کی امی نہیں آئے تھے۔ اس کو پچھتاوا ہوا کہ تھوڑا لیٹ ہی آ جاتی۔

pklibrary.com

"نہیں، یہیں پر کرلو۔ میں سیما سے کہہ کر تمہارے کپڑے منگوالیتی ہوں۔" یہ ممانی تھیں۔ جو کل تک اس سے بات کرنے کی روادار نہ تھیں۔

اس کو ایک دم جیسے یہاں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

مگر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کے شعبہ نے اس کو سخت ناپسندیدہ سچویشن کو ہینڈل کرنا سکھا دیا تھا۔

وہ چینج کر کے باہر آئی تو وہ سامنے ہی تھا۔

صد شکر کہ اکیلا نہ تھا۔

لائبہ کے پاس اس کو ایسے بٹھایا گیا تھا جیسے دولہا اپنی ان چاہی دلہن کے پاس بیٹھا ہو۔

اگر تصویر کو اس رخ سے دیکھا جائے تو کچھ غلط بھی نہ تھا۔

اس سے نظریں ملتے ہی کومل نے نظریں چرا لیں۔

اس کو لائبہ کی نظریں اپنے بہت اندر تک جاتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

مگر آج وہ یہاں کسی پرانے رشتے کو نبھانے نہیں آئی تھی۔ ایک نئے رشتے کی خوشیوں کے لیے وہ یہاں تھی۔

اس نے عاصمہ کو دیکھا جو بے خیالی میں اپنے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا چشمہ شاید آج کے لیے بطور خاص غیر حاضر تھا۔

"اچھی لگ رہی ہو۔" وہ عاصمہ کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی تو وہ شرما گئی۔

("وہ بھاگے گی نہیں..... اس نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ وہ بھاگے۔" ایشا نے اس کو اور اس نے خود کو پورا یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ اس نے ان دونوں کو اکیلا چھوڑ کر غلطی ضرور کی تھی مگر وہ غلطی اتنی بڑی نہ تھی۔

اگر وہ دونوں اپنے نفس پر قابو نہیں پا سکے تو اس میں کومل کا نہیں ان دونوں کا قصور تھا۔

جس پر ان دونوں کی شادی کے کچھ دن بعد ایشا پہنچی تھی۔)

عمیر اور اس کی امی تھوڑی دیر بعد آ گئے تھے۔

اس کی امی ساٹھ کے پیٹے میں تھیں اور ان کو عاصمہ بہت پسند آئی تھی۔

وہ کومل سے بھی بہت اچھے سے ملی تھیں۔

اس نے جو ان کا تصور اپنے دماغ میں بنایا ہوا تھا، وہ اس سے بالکل مختلف تھیں۔

اتنی شفیق اور سمجھ دار عورت اپنے بیٹے کے لیے صرف خوب صورتی کا معیار کیوں مقدم رکھتی تھی؟ یہ کومل سمجھ نہیں پائی تھی۔

سب کچھ اچھی طرح ہو گیا تو کومل نے بھی عمیر کے گھر والوں کے نکلتے ہی باہر کی راہ دیکھی۔

اس کا ہاتھ پکڑ کر روکنے والی غیر متوقع طور پر لائبہ تھی۔

"اتنے عرصے بعد ہم تینوں ایک جگہ مل کر بیٹھے ہیں تو پھر بھاگ کیوں رہی ہو؟"

اس وقت لائبہ کے کمرے میں صرف وہ تینوں ہی تھے۔

یمنیٰ اور باقی سب ممانی کے ساتھ کام بٹا رہے تھے۔

لائبہ شروع سے ہی کام چور تھی، وہ جانتی تھی۔

اب سسرال نے اس کو اور بھی آرام طلب بنا دیا تھا۔

"گھر جا کر آرام کروں گی لائبہ! پورے دن کی تھکی ہوئی ہوں۔"

"کم آن یار! بیٹھو۔" اس نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنے پاس بٹھا لیا۔

"میں چلتا ہوں۔" راحیل اٹھا تو لائبہ نے اس کا بھی ہاتھ پکڑ کر اس کو بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔

راحیل نے ایک نظر اس کے ہاتھوں میں اپنا بازو دیکھا۔ پھر ایسے چھڑایا جیسے وہ جگہ جل گئی ہو، جہاں لائبہ نے اس کو چھوا ہے۔

آؤ، آئی پرانی یادیں تازہ کرتے ہیں۔

لائبہ نے شستہ انگریزی میں جملہ ادا کیا۔

کومل کو بیزاری کی نئی لہر نے بھگو دیا۔

اس نے ایک نظر بظاہر مسکراتی ہوئی لائبہ کو، پھر وحشت کے گھیرے میں بیٹھے راحیل کو دیکھا۔

"تم میرے اور راحیل کے ساتھ کوئی ماضی کی یاد تازہ نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔ ورنہ تمہاری حال کی زندگی مشکل ہو جائے گی۔" اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔

"اچھا، میرے ساتھ نہ کرو، راحیل کے ساتھ کرلو۔ یہ تو تمہاری یاد میں دن رات سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے ہیں۔ ان کا تو پتا نہیں، مجھے انہوں نے بی پی کا مریض ضرور بنا دینا ہے۔" لائبہ کب سے اتنی اچھی اداکارہ ہو گئی تھی۔

راحیل فوراً کھڑا ہو گیا۔

"لائبہ! تم چل رہی ہو یا میں تمہارے لیے ڈرائیور بھیج دوں؟" اب کی بار راحیل کا لہجہ دوٹوک تھا۔

لائبہ نے اپنا ہاتھ بیٹھے بیٹھے راحیل کی طرف بڑھایا۔

"چلتی ہوں۔ آپ کا حکم ماننا تو میری پہلی ترجیح ہے۔" راحیل نے ایک نظر کومل کی طرف دیکھا، پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

کومل نے نظریں چرالیں۔

لائبہ پوری ادا کے ساتھ اپنا بیگ لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ بھی جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

لائبہ' راحیل کا ہاتھ پکڑے پکڑے اس کے پاس آئی اور اس کو گلے لگا کر دونوں گالوں پر بوسہ دیا۔

"آنا ناں ہمارے گھر کبھی...... ایڈریس تو تمہیں پتا ہوگا۔ آئی ہو گی تم وہاں کبھی؟"

لائبہ کے استفسار پر کومل نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"نہ میں وہاں آئی ہوں اور نہ مجھے آنے کا کوئی کون ہے۔"

"مگر میں تو تمہیں وہاں ہر وقت چلتا پھرتا دیکھتی ہوں۔ تم وہاں بھلے نہ آئی ہو مگر وہاں سے کبھی گئیں بھی نہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بولتی، راحیل زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو باہر لے گیا۔

وہ وہیں کھڑی ان کے جانے کا انتظار کرتی رہی۔

☆☆☆

آپ سب نے زندگی میں کاہل گدھے کی کہانی ضرور سنی ہو گی۔

وہی گدھا جس نے اپنے بوجھ سے جان چھڑانے کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔

نہیں سنی؟

چلیں میں سناتی ہوں۔

ایک زمانے میں ایک نمک کا تاجر تھا۔ وہ روزانہ اپنے گدھے پر نمک کی بوریاں لاد کر بازار لے کر جاتا تھا۔

بازار کے راستے میں اسے ایک ندی کو پار کرنا پڑتا تھا۔

ایک بار ندی پار کرتے ہوئے گدھے کا پاؤں پھسل گیا اور چند بوریاں ندی میں گر گئیں۔

چونکہ ان بوریوں میں نمک تھا، اس لیے وہ نمک پانی میں گھل کر حل ہو گیا اور بوریاں ہلکی ہو گئیں۔

گدھے کو جیسے ہی اس بات کا احساس ہوا، اس نے روزانہ یہ حرکت کرنا شروع کر دی۔

مگر جلد ہی مالک کو بھی اس بات کا ادراک ہو گیا۔

اس نے ایک دن نمک کی جگہ روئی بوریوں میں بھر دی۔

نتیجتاً جب گدھے نے چند بوریاں ندی میں پھینک دیں تو روئی میں پانی بھرنے کی وجہ سے وہ وزنی ہو گئیں۔

pklibrary.com

راحیل سے شادی لائیے کے لیے وہ روئی کی بوریاں تھیں، جن کو وہ نمک سمجھی تھی۔

اس کو بچپن سے ہی اپنی خوب صورتی کا ادراک تھا۔

اس لیے وہ ذرا سا معصوم چہرہ بنا کر، ذرا سی آنکھیں پٹپٹا کر بہت سارے مشکل کاموں سے بچ جاتی تھی۔

مگر زندگی کی چالیں اس کی چالوں سے زیادہ تیز تھیں۔

زندگی نے اس کو راحیل کے گھرانے کی صورت میں چیونٹیوں بھرا کباب پکڑا دیا تھا۔

امیروں کی زندگی کے بارے میں جو اس کے دماغ میں تصور تھا، وہ راحیل کے گھر آ کر کہیں ٹوٹ گیا تھا۔

پہلے اس کو اپنے گریڈ کی فکر نہیں کرنی پڑتی تھی، مگر زرنش کے بچوں کو پٹر پٹر انگلش بولتے دیکھ کر وہ انگلش کی کتابیں لے کر بیٹھ جاتی۔

اس کا وکالت کا آخری سال تھا، مگر اپنی عزت بچانے کے لیے اس کو نہ صرف گریڈز پر دھیان دینا پڑ رہا تھا، بلکہ پر اعتماد ہونے کے لیے اس نے سیمینار بھی اٹینڈ کرنے شروع کر دیے تھے۔

اور اگر اس کو لگتا تھا کہ آپ کے پاس پیسہ ہو تو آپ کو کام نہیں کرنا پڑتا تو یہ اس کی سب سے بڑی غلط فہمی تھی۔

شادی سے پہلے وہ کچن کا کوئی کام نہیں کرتی تھی مگر اب نہ صرف ملازماؤں کے سر پر ان سے کام کروانا، اپنے کمرے کا خیال کرنا، آئے دن کی دعوتوں کے لیے نت نئے کھانے بنانا، اس کو سب آ گیا تھا۔

اٹھنے، بیٹھنے کے آداب سے لے کر، بات کیسے کرنی ہے، کیا بات کرنی ہے کیا بات نہیں کرنی، یہ سب اس کو زرنش نے اس ایک سال میں سکھا دیا تھا۔

اس ایک سال نے اس کو یہ سکھایا تھا کہ صرف پر قائم رہنے کے لیے بھی محنت کرنی پڑتی ہے۔

اس ایک سال میں اس نے زندگی کو اتنا برت لیا تھا جتنا اس نے پوری زندگی نہیں برتا تھا۔

اور جیسے جیسے وہ زندگی کو برت رہی تھی ویسے ویسے اس کے اندر کا خالی پن اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

اس خالی پن میں راحیل کی خاموشی مزید سناٹے بکھیر دیتی۔

حالانکہ راحیل اور کومل کے مقابلے میں اس نے اس تبدیلی کو قبول کر لیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ندامت اور دل میں بے چینی ضرور تھی مگر اس کی ذات سے وحشتیں نہیں ٹپکتی تھیں۔

اس نے اپنی بے چینی اور راحیل کی وحشتوں کو دور کرنے کے لیے اپنی شادی کو ایک موقع بھی دے کر دیکھ لیا تھا۔

شروع میں تو وہ راحیل کی سرد مہری کی وجہ سے خود بھی اس سے دور رہتی تھی۔

پھر اس نے کوشش کر کے راحیل کے قریب آنے کی بھی پوری کوشش کی تھی۔

مگر اس کا اور راحیل کا رشتہ اس پودے کی طرح تھا، جو توجہ کا پانی نہ ملنے کی وجہ سے سوکھ گیا تھا۔

اب یہ رشتہ صرف اس کے لیے بوجھ تھا، تھکاوٹ تھی۔

اسی لیے وہ اس وقت کومل سے وہ سب کچھ کہہ گئی جو اس کو کہنا نہیں چاہیے تھا۔

وہاں سے گھر آتے ہی راحیل پھر سے غائب ہو گیا تھا۔

اس کی عادت تھی کہ وہ کبھی بھی اپنا غصہ اس پر نہ اتارتا تھا۔

اگر اس کو لائبہ پر غصہ آتا بھی تو وہ منظر سے غائب ہو جاتا اور اس وقت واپس آتا، جب اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا ہو۔

pklibrary.com

کرتی تا کہ کچھ تو اس کا نقاب کھینچے۔
وہ اس کو کوسے، ڈانٹے، اس کو الزام دے۔
کچھ تو ہو کہ یہ سرد مہری کی دیوار اس کے اور راحیل کے درمیان سے گر جائے۔
کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ کاش راحیل اس ان چاہے رشتے کو ان دونوں کے درمیان سے ختم کر دے۔
اس پر الزام بھی نہ آئے اور وہ ان دیکھی زنجیروں سے آزاد بھی ہو جائے۔
راحیل نے اس وقت تو نہیں، اگلے دن اس کو گھیر لیا۔
"کل کیا تماشا لگایا تھا تم نے؟"
"کون سا تماشا؟" وہ ایک پل کے لیے الجھی۔
فائل سے سر اٹھا کر اس نے اپنے شوہر کو دیکھا۔ "اوہ! اچھا وہ یادیں تازہ کرنے کی بات۔"
راحیل ہاتھ باندھے وہیں کھڑا اس کی اداکاری ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔
"میں نے کیا غلط کہا؟ میں نے تو صرف یادیں تازہ کرنے کو کہا تھا۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔
راحیل اب کی بار اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھ سے فائل لے کر ایک طرف رکھ دی۔
"لائبہ! میں سمجھ گیا تھا کہ تم کیا کرنا چاہ رہی تھیں۔"
"اگر سمجھ گئے تھے تو سوال کیوں کر رہے ہو؟"
اب کی بار راحیل نے اس کو بے بسی سے دیکھا۔ ایسے جیسے وہ کچھ کرنا چاہتا ہو مگر نہیں کر سکتا ہو۔
اس نے اس انسان کی طرف دیکھا، جس سے اس نے ایک وقت میں بے حد محبت کی تھی۔
ہاں، محبت... سب سے چھپ کر۔ کومل سے
پھر ایک وقت آیا تھا، جب اس کو اس سے بے حد نفرت بھی رہی تھی۔
اور اب...؟
اب کچھ بھی تو نہیں تھا۔
اب راحیل کی طرف دیکھنا آئینہ دیکھنے کے مترادف تھا۔
وہ ایک بے بس انسان تھا، جو حالات کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔
جو نہ آگے بڑھ سکتا تھا اور نہ پیچھے جا سکتا تھا۔
بلکہ نہیں اس کی جگہ اگر کومل ہوتی تو کہتی؛
"آگے بڑھنے کا راستہ تو ہمیشہ ہی نکل آتا ہے۔"
وہ ایک خیال کے تحت مسکرائی۔
راحیل کو لگا کہ اس کی مسکراہٹ جیسے اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔
غصے سے راحیل نے فائل دیوار پر دے ماری اور اٹھنے لگا تو اس نے اس کا بازو پکڑ لیا۔
"اگر میرا ساتھ اتنی تکلیف دیتا ہے تو مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟" اس کی آواز سرگوشی سے بلند نہ تھی۔
مگر راحیل نے پھر بھی سن لی تھی۔
"کیا میرے پاس یہ چوائس ہے؟" اس کا لہجہ بے بسی لیے ہوئے تھا۔
اس نے نرمی سے اپنا بازو چھڑایا اور وہاں سے چلا گیا۔
"مگر میرے پاس تو ہے۔" اس بار اس نے صرف یہ سوچا ہی نہیں تھا بلکہ کچھ سوچ کر فیصلے پر بھی پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

شاعر کہتا ہے......
مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ!
یہ سچ تھا، محبت کبھی بھی پہلی سی نہیں رہتی۔
اس کائنات میں تبدیلی کا اصول ہر شے پر لاگو

ہے، محبت پڑی ہے۔
یہ بڑھتی بھی ہے، گھٹتی بھی ہے اور کبھی کبھار ختم بھی ہو جاتی ہے۔
اگر ایک جگہ کھڑی ہو جائے تو یہ کائی لگی ندی کی طرح بدبودار ہو جاتی ہے۔
اور آہستہ آہستہ گھن کی طرح انسان کو اندر سے کھانے لگتی ہے۔
راحیل کی محبت ایک جگہ کھڑی اس کو اندر سے کھوکھلا کر رہی تھی، مگر لائبہ کی محبت راحیل سے شادی کے بعد سے زوال پذیر تھی۔
راحیل سے شادی کا کافی عرصہ اس نے جیسے اپنے جسم سے لاتعلق ہو کر گزارا تھا۔
لائبہ نے جب نکاح نامے پر دستخط کیے تھے، تب اس کو ایسا لگا جیسے اس کی روح اس کے جسم کے اندر نہیں تھی۔ بلکہ کہیں دور پرواز کر گئی تھی۔
اب اس کا جسم جیسے کسی نے ڈور سے باندھ دیا تھا اور وہ بذات خود ایک کٹھ پتلی تھی، جسے لوگ چلائے جا رہے تھے۔
اور اس کی روح کہیں دور کھڑی یہ سب تماشا دیکھے جا رہی تھی۔
وہ دیکھ رہی تھی کہ کیسے اس کا برسوں پرانا خواب کسی نے ڈراؤنے خواب میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔
ایسا خواب جو کبھی اس کی خواہش تھا مگر اب ایک تماشے سے بڑھ کر کچھ نہ تھا۔
اس نے بچپن سے ہی شہزادے کا خواب دیکھا تھا۔
کومل کی طرح ڈرتے ڈرتے نہیں بلکہ بے دھڑک ہو کر دیکھا تھا۔
کومل ذہین تھی، بہادر تھی،
وہ کیا تھی؟
وہ خوب صورت تھی۔ اگر آپ کے پاس خوب صورتی ہو اور کچھ نہ بھی ہو تب بھی آپ کے اندر پوری نہیں تو آدھی دنیا فتح کرنے کی طاقت ہوتی ہے۔

یہ اس نے چھوٹی عمر میں ہی سیکھ لیا تھا۔ جب کومل اتنے مہنگے کپڑے پہن کر بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز نہ بن پاتی تھی اور وہ اپنی بلی جیسی آنکھوں سے سب کا من موہ لیتی تھی۔
مگر شادی کے بعد اس کی خوب صورتی اس کا ساتھ نہیں دے سکی۔ تقدیر نے اس کو بتا دیا تھا کہ وہ انسان سے بہتر چالیں چلتی ہے۔ اس بات کا ادراک اس کو شادی کی پہلی رات ہی ہو گیا تھا۔
جب اس نے حجلۂ عروسی میں پہلا قدم رکھا تو اس کا استقبال ٹوٹے ہوئے کانچ کے ٹکڑوں نے کیا تھا۔
انسان جو ڈیزرو کرتا ہے، اس کو وہی ملتا ہے اس نے اس رات یہ جان لیا تھا۔
باہر کی شدید گرمی کے مقابلے میں وہاں خنکی تھی۔
شاید اے سی چل رہا تھا۔
وہ کانچ کے ٹکڑوں سے بچتی بچاتی اپنے پلنگ پر پہنچی۔
پورا کمرہ پھولوں سے مہک رہا تھا۔
اس کا بستر آرام دہ تھا۔
اس کو کبھی ایسا آرام دہ بستر نصیب نہیں ہوا تھا۔
زرنش نے اس کے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے ملازمہ سے اس کا کمرہ صاف کروا دیا تھا اور خود راحیل کو لینے چلی گئی تھی۔
اس نے تنفر سے اپنے آس پاس سجے ہوئے کمرے کو دیکھا۔
"یہی سب کچھ چاہتی تھیں نا تم؟ مبارک ہو۔ تمہاری تقدیر نے جو تم سے وعدہ کیا تھا، وہ تمہیں مل ہی گیا۔ اب اٹھو، جشن مناؤ، رقص کرو۔ یہ اداسی کی مورت کیوں بن کے بیٹھی ہو تم؟"
سامنے لگے دیوار گیر آئینے میں اس کا عکس اس کو دیکھ کر ہنسا تھا۔
اب اس کی سمجھ میں آیا کہ راحیل نے اتنے

pklibrary.com

کانچ کیوں ٹوٹے ہوتے تھے۔

راحیل کانچ توڑ سکتا تھا، مگر اس کی اتنی اوقات نہ تھی کہ وہ ایسا کر سکے۔

''مگر اب تو تمہاری اتنی اوقات ہو گئی ہے کہ تم بھی ایسا کر سکو۔'' ٹوٹے ہوئے کانچ میں اس کا عکس ٹوٹ کر ہنسا۔

اس کو وہ سب کچھ مل چکا تھا جو وہ چاہتی تھی تو کیوں اس کے آس پاس، اس کے اندر ایسی وحشت ٹپکتی تھی؟

وہ جیسے منزل پر پہنچ کر راستہ بھول گئی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کرے؟

لائبہ، راحیل کو دیکھتی۔

وہ شہزادوں جیسا لڑکا اس کا ہو کر بھی اس کا نہ تھا۔

اس کے پاس اب وہ کمرہ تھا، جو وہ چاہتی تھی۔

اے سی کی ٹھنڈک تھی۔ لائٹ جانے پر جنریٹر تھا۔

اب زمانے کی گرم ہوا اس کو چھو نہیں سکتی تھی۔

وہ اس برانڈ کے کپڑے پہنتی تھی جس کو صرف تصویر میں دیکھ سکتی تھی، مگر خواب میں بھی آرڈر کرنے کا سوچ نہیں سکتی تھی۔

اس کے گھر میں دنیا جہاں کی نعمتیں تھیں۔

مگر وہ خالی ہاتھ کیوں تھی؟

''مطلب یہ کہ اگر یہ ریپ تھا تو تم نے گارڈز کو چلا کر متوجہ کیوں نہیں کیا؟ تم اتنی آسانی سے راحیل سے شادی کرنے پر راضی کیوں ہو گئیں؟''

ایشا کی باتیں اس کے دماغ میں گردش کرنے لگیں تو اس کو احساس ہوا کہ ایسا کیوں تھا؟

گارڈز نے اس کی چیخ کی آواز نہیں سنی تھی کیونکہ جو کچھ ہوا تھا، اس کی مرضی سے ہوا تھا۔

☆☆☆

لائبہ پانچ بہنوں میں تیسری بہن تھی۔

بچپن سے اس نے کچھ چیزیں چھوٹی عمر میں ہی مسلسل دیکھی تھیں اور ان سے سبق حاصل کر کے اس نے جیسے جینے کا گر سیکھ لیا تھا۔

سے بڑھ کر ایک خوب صورت تھیں۔ اس لیے اس کی امی نے ان سب کے لیے بڑے اونچے خواب دیکھے تھے۔

ایسے گھر کے خواب جہاں ان کو ان کی طرح گھٹ گھٹ کر جینا نہ پڑے۔

اس نے بچپن سے ہی اپنی ماں کے خواب اپنی آنکھوں میں بسا لیے تھے۔ محبت کرنے والا شہزادہ اور محل نما گھر۔

پھر اس کی ماں کی دعائیں اس کی دعاؤں میں ڈھلنے لگیں۔

پھر وہ شدت سے اس شہزادے کا انتظار کرنے لگی۔

کچھ بڑی ہوئی تو اندازہ ہوا کہ یہ شہزادہ اس کے غریب خانے میں نہیں آنے والا۔

مگر جب وہ آئینہ دیکھتی تو سوچتی ـــ کہ بھلے وہ محل جیسے گھر میں نہیں رہتی تھی، مگر وہ خود کسی شہزادی یا پری سے کم نہ تھی۔

پھر جب یونیورسٹی کے پہلے دن اس نے راحیل کو دیکھا تو اس کو لگا کہ یہ وہی شہزادہ ہے جس کا اس کو انتظار تھا۔

مگر کومل نے سارا معاملہ خراب کر دیا۔ وہ کب بیچ میں آئی، اس کو علم ہی نہیں ہوا۔

شروع میں اس کو لگا کہ کومل پر راحیل کی اتنی مہربانیاں اس کی اپنی وجہ سے تھیں۔

آخر کو وہ شہزادی تھی اور شہزادہ تو اس کا ہی ہونا چاہیے تھا ناں؟

وہ دن رات اپنے آپ کو تسلی دیتی کہ وہ محض کومل سے دل لگی کر رہا ہے۔

مگر جب اس شہزادے کی شادی کا پیغام لائبہ کے بجائے کومل کے گھر آیا تو اس کو اندازہ ہوا کہ شہزادی صرف خوبصورتی کی دھنی نہیں ہوتی، شہزادی کے پاس کچھ اور بھی ہوتا ہے جو کومل کے پاس تھا مگر اس کے پاس نہیں تھا۔

pklibrary.com

راحیل کا کچ تو توڑ سکتا تھا، مگر اس کی اتنی اوقات نہ تھی کہ وہ ایسا کر سکے۔

''مگر اب تو تمہاری اتنی اوقات ہوگئی ہے کہ تم بھی ایسا کر سکو۔'' ٹوٹے ہوئے کانچ میں اس کا عکس ٹوٹ کر ہنسا۔

اس کو وہ سب کچھ مل چکا تھا جو وہ چاہتی تھی تو کیوں اس کے آس پاس، اس کے اندر ایسی وحشت ٹپکتی تھی؟

وہ جیسے منزل پر پہنچ کر راستہ بھول گئی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کرے؟

لائبہ، راحیل کو دیکھتی۔

وہ شہزادوں جیسا لڑکا اس کا ہو کر بھی اس کا نہ تھا۔

اس کے پاس اب وہ کمرہ تھا، جو وہ چاہتی تھی۔

اے سی کی ٹھنڈک تھی۔ لائٹ جانے پر جنریٹر تھا۔

اب زمانے کی گرم ہوا اس کو چھو نہیں سکتی تھی۔

وہ اس برانڈ کے کپڑے پہنتی تھی جس کو صرف تصویر میں دیکھ سکتی تھی، مگر خواب میں بھی آرڈر کرنے کا سوچ نہیں سکتی تھی۔

اس کے گھر میں دنیا جہاں کی نعمتیں تھیں۔

مگر وہ خالی ہاتھ کیوں تھی؟

''مطلب یہ کہ اگر یہ ریپ تھا تو تم نے گارڈز کو چلا کر متوجہ کیوں نہیں کیا؟ تم اتنی آسانی سے راحیل سے شادی کرنے پر راضی کیوں ہوگئیں؟''

ایشا کی باتیں اس کے دماغ میں گردش کرنے لگیں تو اس کو احساس ہوا کہ ایسا کیوں تھا؟

گارڈز نے اس کی چیخ کی آواز نہیں سنی تھی کیونکہ جو کچھ ہوا تھا، اس کی مرضی سے ہوا تھا۔

☆☆☆

لائبہ پانچ بہنوں میں تیسری بہن تھی۔

بچپن سے اس نے کچھ چیزیں چھوٹی عمر میں ہی مسلسل دیکھی تھیں اور ان سے سبق حاصل کر کے اس نے جیسے جینے کا گر سیکھ لیا تھا۔

سے بڑھ کر ایک خوب صورت تھیں۔ اس لیے اس کی امی نے ان سب کے لیے بڑے اونچے خواب دیکھے تھے۔

ایسے گھر کے خواب جہاں ان کو ان کی طرح گھٹ گھٹ کر جینا نہ پڑے۔

اس نے بچپن سے ہی اپنی ماں کے خواب اپنی آنکھوں میں بسا لیے تھے۔ محبت کرنے والا شہزادہ اور محل نما گھر۔

پھر اس کی ماں کی دعائیں اس کی دعاؤں میں ڈھلنے لگیں۔

پھر وہ شدت سے اس شہزادے کا انتظار کرنے لگی۔

کچھ بڑی ہوئی تو اندازہ ہوا کہ یہ شہزادہ اس کے غریب خانے میں نہیں آنے والا۔

مگر جب وہ آئینہ دیکھتی تو سوچتی — کہ بھلے وہ محل جیسے گھر میں نہیں رہتی تھی، مگر وہ خود کسی شہزادی یا پری سے کم نہ تھی۔

پھر جب یونیورسٹی کے پہلے دن اس نے راحیل کو دیکھا تو اس کو لگا کہ یہ وہی شہزادہ ہے جس کا اس کو انتظار تھا۔

مگر کومل نے سارا معاملہ خراب کر دیا۔ وہ کب بیچ میں آئی، اس کو علم ہی نہیں ہوا۔

شروع میں اس کو لگا کہ کومل پر راحیل کی اتنی مہربانیاں اس کی اپنی وجہ سے تھیں۔

آخر کو وہ شہزادی تھی اور شہزادہ تو اس کا ہی ہونا چاہیے تھا ناں؟

وہ دن رات اپنے آپ کو تسلی دیتی کہ وہ محض کومل سے دل لگی کر رہا ہے۔

مگر جب اس شہزادے کی شادی کا پیغام لائبہ کے بجائے کومل کے گھر آیا تو اس کو اندازہ ہوا کہ شہزادی صرف خوبصورتی کی دھنی نہیں ہوتی، شہزادی کے پاس کچھ اور بھی ہوتا ہے جو کومل کے پاس تھا مگر اس کے پاس نہیں تھا۔

pklibrary.com

جب ملا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

ہر گزرتا دن اس کے دل میں راحیل کے لیے تڑپ بڑھاتا تھا اور وہ اللہ سے لاکھوں شکوے کرتی تھی کہ اس کو بھلے کچھ نہ دے، بس راحیل دے دے۔

آخر اس کے خزانے میں کوئی کمی تو نہ تھی۔

اس نے پوری زندگی کومل کی خیرات پر گزارا کیا تھا۔

مگر اب کچھ تو ایسا ہو جائے کہ اس کی اس خیراتی زندگی سے جان چھوٹ جائے۔

اس کا دل کرلاتا، وہ جواب مانگتی مگر کوئی جواب حاصل نہ ہوتا۔

کومل کو تو راحیل کی پرواہ بھی نہ تھی جب اس کے سر میں درد ہوا تو سب سے پہلے اس نے ہی دیکھا تھا۔

راحیل کی تکلیف اس کو محسوس ہوتی تھی۔

فیئر ویل والے دن بھی وہ چاہتی تھی کہ راحیل اس پر نگاہِ کرم کرے۔

وہ راحیل کے پیچھے ہی ساتھ والے کمرے میں بہانا بنا کر گئی تھی۔ اس نے ابھی دروازہ ذرا سا کھولا ہی تھا کہ وہ جھلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور پسینے کے قطرے اس کے چہرے پر چمک رہے تھے۔

''کوئی شخص آپ کو اتنا بھی پیارا ہو سکتا ہے کیا؟'' اس نے اس کو دیکھ کر نگاہیں جھکاتے ہوئے سوچا۔

''یار! بندے کو اتنے مینرز ہونے چاہئیں کہ دروازہ کھٹکھٹا ہی دے۔'' اس کا لہجہ بے زاری لیے ہوئے تھا۔

''سوری۔ میں سمجھی اندر کوئی نہیں ہے۔ ایشا نے مجھے کہا تھا کہ ساتھ والے کمرے میں جا کر آرام کرلو۔'' اس نے وہی بات کی جو ایشا نے اس سے کہی تھی۔ وہ اپنے اوپر کوئی الزام نہیں چاہتی تھی۔

''جاؤ..... کرو آرام.....'' اس نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔

وہ جھلا کر اپنی شرٹ کے اوپر کے بٹن بند کرتے ہوئے باہر چلا گیا اور وہ افسوس سے ہاتھ ملتی رہ گئی۔

وہ اندر گئی تو فضا میں راحیل کے پرفیوم کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔

راحیل مردوں کی اس قوم میں سے تھا جو پرفیوم کی پوری بوتل اپنے اوپر انڈیلنا فرض سمجھتے ہیں۔

اب بہانا تو بنا ہی دیا تھا تو کیا برا تھا کہ تھوڑی دیر اے سی والے کمرے میں نرم سے بیڈ پر آرام کرلے۔

اس کے دل میں خواہش مچلی۔

اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر دیکھا تو راحیل کا فون پڑا ہوا تھا۔ اس نے کلک کیا تو اسکرین پر راحیل کی اپنی تصویر ہی وال پیپر پر لگی ہوئی تھی۔

وہ فون لے کر وہیں جا کر بیٹھ گئی جہاں پر راحیل لیٹا ہوا تھا۔

نرم گداز، اے سی کی ٹھنڈک اور نیم اندھیرا وہ کب نیند کی وادی میں چلی گئی، اس کو اندازہ ہی نہیں ہوا۔

کومل نے جب اس کو اٹھایا تو وہ جاگی ضرور تھی مگر آنکھیں کھولنے پر آمادہ نہ تھی۔

کچھ بھی تھا، راحیل اس کا ہونا چاہیے، کومل کا نہیں۔

اس نے ڈھیٹ بن کر آنکھیں بند ہی رکھیں۔

کومل اور ایشا کے وہاں سے جانے کے بعد اس نے سکون کا سانس بھرا، مگر وہ سانس وہیں اٹک کر رہ گیا جب اس نے پہلے فون بجنے کی آواز سنی، پھر تھوڑی دیر بعد اس کو دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

اس کے ساتھ ہی مانوس سی مردانہ پرفیوم کی خوشبو بھی اندر آئی تو وہ جلدی سے سوتی بن گئی۔

''بھلا ان کو اسے چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت تھی؟'' اس کا کوفت بھرا جملہ اس کو اچھا تو نہیں لگا مگر دل خوش ہوا کہ اگر وہ سب راحیل کے بغیر چلے گئے

pklibrary.com

ہیں تو ضرور اس وقت وہ دونوں وہاں پر اکیلے ہوں گے۔

تھوڑی دیر وہ اسی کشمکش میں رہی کہ اس کو اٹھ جانا چاہیے یا نہیں۔

مگر وہ اس وقت چونکی، جب راحیل نے اس کا ہاتھ پکڑا اور پکڑے ہی رکھا۔

اس نے کمال اداکاری سے کسمسا کر آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی۔

راحیل کی گرفت مضبوط تھی اور اس کا ارادہ کمزور.....

راحیل کا دوسرا ہاتھ اس کی گردن سے ہوتا ہوا اس کے چہرے پر گیا تو ایک عجیب سا احساس اس کے رگ وپے میں اتر گیا۔

یہ سامنے بیٹھا ہوا شخص اس کا ہو سکتا تھا۔

وہ تو تھی ہی اس کی.....

ایسے تو اس نے رومان کے رشتے کے لیے انکار پھپھو تک نہیں پہنچایا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ بہن کی محبت میں ابا نے نہ نہیں کرنی تھی اور پھپھو کو پتا چل جاتا تو وہ خود ہی انکار کر دیتیں۔

اور ایسا ہی ہوا۔

کچھ بھی تھا، رومان اچھا تھا۔ مگر وہ راحیل نہ تھا..... وہ اس کا عشق تھا..... اس کی پہلی محبت تھی۔

اس نے مسکرا کر راحیل کو دیکھا اور ہاتھ چھڑانے کی ایک بار پھر سے ناکام کوشش کی۔

''میں چلتی ہوں۔'' اب کی بار راحیل کی گرفت ایک پل کے لیے کمزور ہوئی۔

اس نے سر جھکایا پھر سر اٹھا کر اپنی پلکیں اس کی طرف اٹھائیں تو وہ مسحور ہو گئی۔

ان سبز آنکھوں کو سرخ جھیل نے گھیرا ہوا تھا۔

وہ اس پل ان میں ڈوب جانا چاہتی تھی۔

وہ وہیں سن ہو گئی اور راحیل کی گرفت دوبارہ مضبوط ہوئی تھی۔

اس کے وجود پر بھی اور اس کے دل پر بھی...

پھر جب راحیل اس کو چھوڑ کر چلا گیا تو کچھ غلط ہونے کا پچھتاوا اس کے پیچھے کیوں چھوڑ گیا تھا؟

وہ کیوں اس کے جانے کے بعد خود کو سنبھال نہیں پائی تھی؟

کیوں وہیں بیٹھی روتی رہی تھی؟

اس نے خود کو لٹا ہوا کیوں دکھایا تھا؟

اس وقت کومل کو دیکھ کر اس کو ایسا کیوں لگا تھا کہ جیسے اس نے کوئی چوری کر لی ہو؟

ان سب سوالوں کے جواب اس کو وقت نے دے دیے تھے۔

☆☆☆

''لڑکے والوں نے منع کر دیا ہے۔'' کومل کے کانوں میں مانوس سا جملہ پڑا تو اس نے بیزاری سے اپنی ماں کو رشتے والی خالہ سے سر جوڑے دیکھا۔

''کومل! تم اندر جاؤ۔'' اس کی موجودگی محسوس کر کے ثنا بیگم نے جلدی سے اپنی بیٹی کو اندر جانے کو کہا۔

وہ ابھی ابھی کورٹ سے واپس آئی تھی۔

وہ ان دونوں کی باتیں سن کر اپنا موڈ مزید خراب نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لیے ان پر ایک نظر ڈال کر اندر چلی گئی۔

کومل کے اندر جانے کے بعد رشتے والی خالہ فیروزہ نے جلدی سے اپنے بیگ سے ایک تصویر نکال کر ثنا بیگم کو دکھائی۔

''لڑکا دکھنے میں تو اچھا ہے۔'' ثنا بیگم نے تصویر دیکھ کر تبصرہ کیا۔

''پڑھا لکھا ہے۔ فیملی بھی چھوٹی ہے۔ دو بھائی ہیں اور یہ بڑا بھائی ہے مگر.....''

اس مگر کے ساتھ ہی ثنا بیگم کا سانس اٹکا۔

یہ مگر ہمیشہ ہی بری خبر ہوتا ہے۔

''نوکری نہیں ہے اس کی۔ کوشش تو بہت کرتا ہے مگر مل نہیں رہی۔ لڑکے والے چاہتے ہیں کہ ایسی

pklibrary.com

گرتی ہو بس کے گھر والے اس کو کاروبار سیٹ کروا دیں اور اس کو گھر بھی دلا دیں۔"

ثناء بیگم نے گہرا سانس خارج کیا۔

وہ سمجھ تو گئی تھیں کہ اس مگر کے آگے کچھ ایسا ہوگا جو ان کے راستے مسدود کر دے گا۔

انہوں نے ایک نظر لڑکے کی تصویر کو دیکھا، لڑکا خوش شکل تھا۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔

پچھلے دنوں چند ایک ایسے رشتے بھی فیروزہ نے بتائے تھے جن کی طرف ان کا دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔

"کومل کے بابا تو ایسے رشتے پر بالکل بھی راضی نہیں ہوں گے۔ وہ فوراً ہی ان کو لالچی قرار دے کر انکار کر دیں گے۔ وہ اپنی بیٹی کو پوری زندگی گھر پر بٹھا دیں گے مگر یہاں رشتہ نہیں کریں گے۔" ثنا بیگم نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"بھئی لالچی نہیں ہیں۔ بے چارے مجبور ہیں۔ تم بھی تو مجبور ہو ناں؟ ایک دو سال اور گزرے تو اس طرح کا رشتہ بھی نہیں آئے گا۔" فیروزہ خالہ نے بھیانک سا نقشہ کھینچا۔

"اچھا پھر ایک کام کرو، ان لوگوں سے صرف کاروبار کی بات کر کے دیکھو۔ میرے پاس کچھ زیور اور بچت ہے جس سے میں کاروبار جتنے پیسے تو کر لوں گی۔ مگر گھر میرے بس میں نہیں ہے۔"

"چلو، میں بات کر کے تمہیں بتاتی ہوں۔ اگر وہ راضی ہو گئے تو اس ہفتے تک میں ان کو لے آؤں گی۔ مگر تم ذرا کومل کو کہہ کر اس کو پارلر کا ایک چکر لگوا دینا۔"

فیروزہ خالہ کے ساتھ ثنا بیگم بھی کھڑی ہو گئیں۔

☆☆☆

اس رات راحیل گھر پر آیا تو بابا کو اپنا منتظر پایا۔

"بیٹھو راحیل! تم سے بات کرنی ہے۔" وہ جو نظر بچا کر جانے لگا تھا۔ فوراً واپس پلٹ آیا۔

راحیل سمٹ کر ان کے سامنے رکھے سنگل صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میں کھینچ تان کر تمہید نہیں باندھوں گا راحیل۔ مگر کب تک ایسا چلتا رہے گا؟"

"وکالت کا تم نے امتحان نہیں دیا۔ کاروبار میں تمہاری دلچسپی نہیں ہے۔ کیا چاہتے ہو تم؟"

راحیل نے ایک نظر اپنے بابا کو دیکھا اور پھر نظریں چرا لیں۔

اس کے پورے وجود پر ایک نظر ڈالی جائے تو ہر انسان بتا سکتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ پھر اس کا باپ کیوں نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟

اس نے ایک گلہ آمیز نظر اپنے باپ پر ڈالی۔

باپ نے جواب میں اس کو ایسی نظروں سے دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں۔ "تمہیں گلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

راحیل نے ان کی نظروں کا مفہوم پڑھ کر نظریں چرا لیں۔

"شیزان اور زرنش کراچی شفٹ ہونا چاہتے ہیں۔ اب جبکہ ایشا کی بھی کچھ عرصے میں شادی ہونے والی ہے اور وہ دونوں تم دونوں کے فرض سے فارغ ہو گئے ہیں تو شیزان اس بنجاروں والی زندگی سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔"

یہ سچ تھا کہ شیزان اور زرنش نے ان دونوں کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔

راحیل نے ہمیشہ ہی ان دونوں کی قربانیاں اپنا حق سمجھ کر وصول کی تھیں۔

"تو آپ مجھ سے اب کیا چاہتے ہیں؟" وہ جزبز ہو کر بولا۔

"شیزان تمہارے لیے فکر مند ہے، جب تک تم ایسی حالت میں رہو گے، وہ آگے کیسے بڑھ پائے گا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ جو وحشتوں کے حصار میں تم نے اپنے آپ کو ایک سال سے قید کیا ہوا ہے، تو اس قید کو عمر قید مت بناؤ۔"

جب سے راحیل کی زندگی میں وہ حادثہ ہوا تھا، شیزان کی راحیل سے بات چیت بند تھی۔

pklibrary.com

راحیل جانتا تھا کہ یہ جائیداد کی ایک بڑے بھائی کی نہیں تھی، بلکہ ایک باپ کی تھی، جس کی اولاد نے اس کا مان توڑ دیا تھا۔

جہانگیر صاحب نے ایک نظر خاموش بیٹھے راحیل پر ڈالی اور گہرا سانس بھرا۔

''کیا چاہتے ہو تم راحیل؟''

''میں چاہتا ہوں کہ آپ سب مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔'' راحیل سوچ کر رہ گیا۔

''اگر تمہارے ساتھ اس لڑکی کا نام نہیں جڑا ہوتا تو بے شک تم کسی جنگل میں جا کر جوگ لگا لیتے۔ مگر میری ایک بیٹی ہے، دو پوتیاں ہیں راحیل! مجھے ڈر لگتا ہے کہ کسی دن ہمیں ایسا کچھ اپنی بچیوں کے ساتھ نہیں دیکھنا پڑ جائے۔''

''ایسا تو نہیں ہیں.....'' وہ ایک دم تڑپا۔

''ایشا کی شادی کے بعد شیزان نے یہاں سے شفٹ ہو جانا ہے۔ تب تک میں امید کرتا ہوں کہ تم اس خود ساختہ قید تنہائی سے نکل آؤ گے۔'' بات کے آخر میں جہانگیر صاحب نے اس کو ایسے دیکھا جیسے بچپن میں وہ کسی غلط کام سے روکنے کے لیے ان بڑے بھائیوں کو دیکھا کرتے تھے۔

''وعدہ نہیں کرتا مگر میں کوشش کروں گا۔'' یہ کہہ کر راحیل اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

جب سیڑھیوں کی طرف گیا تو پہلی سیڑھی پر اسے شیزان بیٹھا ہوا مل گیا۔

بچپن میں وہ جب بھی ناراض ہوتا تو سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ جاتا تھا، تب شیزان اس کے پاس وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر اس کو سمجھاتا اور مناتا تھا۔

کسی یاد کے تحت ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔

''آپ یہ سب مجھے خود بھی تو کہہ سکتے تھے؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی گلہ اس کے ہونٹوں تک آ ہی گیا۔

شیزان اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سامنے آ گیا۔

راحیل کے اندر جیسے چھن سے کچھ ٹوٹ گیا۔

''ہمارے رشتے میں خود غرض صرف میں ہوں بھائی! آپ کبھی بھی خود غرض نہیں ہو سکتے۔'' بے اختیار آگے بڑھ کر اس نے شیزان کو گلے لگا لیا۔

سارے گلے شکوے بغیر کہے ہی جیسے دھل سے گئے تھے۔

☆☆☆

اس رات جب راحیل اپنے کمرے میں گیا تو لائبہ حسب معمول پہلے سے سو گئی تھی یا اس کو دیکھ کر سوئی بن گئی تھی۔

وہ وہیں بالکنی میں جا کر تا حد نگاہ پھیلے ہوئے اندھیرے کو دیکھنے لگا۔

پریشانی کس بلا کا نام ہے، غم کس چڑیا کو کہتے ہیں؟ وہ اپنے نفس سے ہار ماننے سے پہلے زندگی کی اس حقیقت بے خبر تھا۔

اچھی صورت، ذہانت، دولت، محبت، غرض اللہ کا عطا کردہ سب کچھ اس کے پاس تھا۔

مگر چھوٹے چھوٹے گناہوں سے شروع ہوتا یہ سلسلہ، چند لمحوں کی بے خودی پر ختم ہوا تو ساتھ میں اس کا سب کچھ لے گیا۔

اب زندگی اس کی بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے ایسے موڑ پر آ گئی تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ زندگی کے ساتھ کیا کرے۔

اس نے پیچھے مڑ کر سوئی ہوئی (یا سونے کی اداکاری کرتی ہوئی) لائبہ کو دیکھا۔

وہ لائبہ کو دیکھتا تو سوائے افسوس سے ہونٹ بھینچنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ اس نے خود کو تراشنا ہے۔ حالات کے دھارے پر خود کو چھوڑ دینا بڑا ہی آسان ہوتا ہے۔ مگر اٹھ کر کھڑے ہونا اور اپنے آپ سے جنگ کرنا بے حد مشکل...

زندگی میں پہلی بار راحیل جہانگیر نے مشکل راستہ چنا تھا۔

pklibrary.com

امی آج کل بہت خوش تھیں۔
اور اس خوشی کی وجہ کومل کے لیے آئے ہوئے رشتہ کا لڑکے والوں کی طرف سے ہاں ہونا تھی۔
کومل کو اس رشتے اور اس سے جڑے رشتے داروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
اس کو تو وہ لوگ کافی لالچی سے لگے تھے، جن کو اس چیز میں زیادہ دلچسپی تھی کہ کومل مہینے کے کتنے پیسے کماتی تھی۔
حالانکہ اس سے کسی نے پوچھا نہیں تھا، مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔
مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟
اس کے پاس کون سے انتخابات تھے، جو اس کو انکار یا اقرار کرنے کا حق ہوتا۔
اور اگر انتخابات ہوتے بھی تو وہ کون سا اقرار کر لیتی۔
اس نے یہ سوچ کر سر جھٹکا اور ایک بار پھر سے اپنی کیس کی فائل پہ جھک گئی۔
جب الفاظ اس کے سر کے اوپر سے گزرنے لگے تو اس نے تنگ آ کر فائل بند کی اور لیپ ٹاپ کھول کر جرمنی کی مختلف یونیورسٹیز کی ویب سائٹ کھول کر بیٹھ گئی۔
آج کل یہ اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔
کومل کی ایک فیس بک فرینڈ تھی، پلوشہ... جو اس کی بہت اچھی دوست بن گئی تھی۔ اس نے کومل کو بتایا تھا کہ جرمنی میں ہائر اسٹڈیز کے لیے اسکالرشپ آسانی سے مل جاتی ہے۔
اسکالرشپ مل بھی جاتا تو ویزا، ٹکٹ اور وہاں رہائش کے لیے پیسے چاہیے تھے، جو کہ کومل کے پاس نہیں تھے۔
وہ جانتی تھی کہ بیٹیوں پہ کوئی بھی اتنے پیسے نہیں لگاتا، کم از کم ان کے کیریئر کے لیے تو نہیں۔
اس کی منزل یہ چھوٹا سا کمرہ نہیں تھا۔
مگر اب اس رشتے نے جیسے اس کے پاؤں پکڑ

وہ اپنے خیالوں میں اتنی زیادہ گم تھی کہ اس کو اندازہ نہیں ہوا کہ کب کوئی اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔
''آپ کومل عماد ہیں؟'' اس سوال پر اس نے چونک کر آنے والے کی طرف دیکھا۔
''جی، کہیے، میں کیا مدد کر سکتی ہوں آپ کی؟'' اس نے پروفیشنل انداز میں جواب دیا۔
''آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں ہے۔ میں سہیل ہوں۔ ہم دونوں کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔'' اس کی بات پر کومل فوراً سنبھل کر بیٹھ گئی۔
اس نے اس لڑکے کی تصویر دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس لیے اس کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کا ہونے والا منگیتر کیسا دکھتا تھا۔
وہ تقریباً پچیس چھبیس سال کا خوش شکل نوجوان تھا۔
راحیل سے بھی زیادہ خوش شکل، مگر وہ راحیل نہیں تھا۔
کومل نے زور سے آنکھیں میچیں، جیسے ایسا کر کے وہ راحیل کے خیال کو ذہن کے کسی کونے میں دھکیل دے گی۔
''ٹھیک ہے۔ آپ کو کیا کام ہے مجھ سے۔'' تھوڑی دیر پہلے کا پیشہ ورانہ لہجہ اب سرد مہری میں بدل گیا تھا۔
''دیکھیں، میں گھما پھرا کر بات نہیں کروں گا مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ اس رشتے سے انکار کر دیں۔''
''میرے بس میں ہوتا تو پھر ناں۔'' وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔
وہ سامنے بیٹھے نوجوان کو اپنے ارزاں ہونے کی داستان نہیں سنا سکتی تھی۔
''اور ایسا کیوں ہے؟ آپ بھی تو انکار کر سکتے ہیں نا؟''
''میرے گھر والے اس رشتے سے ہرگز انکار

معلوم ہی ہوگا کہ آپ کے گھر والے مجھے آپ سے شادی کے بدلے میں کاروبار کی رقم دے رہے ہیں۔ یہ میرے لیے ناقابل قبول ہے۔"

"ایک منٹ۔" کومل اب کی بار پوری طرح الرٹ ہو کر سیدھی ہوئی۔ "میرے گھر والے آپ کو رقم دے رہے ہیں؟" جیسے ہی اس کے دماغ میں اس دن کا سین آیا، جب اس کے گھر سہیل کے گھر والے رشتہ لے کر آئے تھے تو جیسے ہر چیز آئینے کی طرح شفاف ہوتی گئی۔

"جی..... اسی شرط پر رشتہ ہوا تھا کہ مجھے کاروبار کے لیے آپ کے گھر والے پیسے دیں گے۔ مگر میرا خیال ہے آپ اس بات سے لاعلم ہیں۔" سہیل نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"اوہ میرے خدا!" اس نے ایک پل کے لیے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

"آپ کی امی نے بتایا کہ میری امی آپ کو پیسے کیسے دیں گی؟"

"مجھے زیادہ تو نہیں معلوم مگر میری امی ذکر کر رہی تھیں کہ ان کے پاس شاید کوئی جیولری ہے جسے بیچ کر وہ مجھے پیسے دیں گی۔"

"مجھے دینے کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں ہیں، اس غیر انسان کو دینے کے لیے ہیں۔" اس نے دل میں سوچا۔

اس کو اتنا غصہ آیا کہ اس کا دل چاہا کہ وہ گھر جا کر اتنا بڑا تماشا کرے کہ پوری دنیا دیکھے۔

پھر اس نے گھور کر سہیل کو دیکھا۔

"آپ بھی غیرت مند بننے کی اداکاری کسی اور کے سامنے کیجیے گا۔ اصل وجہ بتائیں کہ کیا ہے؟ میں پسند نہیں آئی آپ کو؟ آپ کو ایسی لڑکی اپنے ہم سفر کے طور پر چاہیے جو آپ کے ساتھ چلتی ہوئی اچھی لگے؟"

کومل کے ساتھ ایسا واقعہ پہلے بھی پیش آچکا تھا۔ تب بات پیسے کی نہیں تھی۔ مگر وہ سامنے بیٹھے تھا؟

وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے، دراصل آپ وکیل ہیں اور مجھے ایک گھریلو لڑکی اپنے ہمسفر کے طور پر چاہیے۔" کومل کے اندر کے وکیل نے کہا تھا کہ یہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہے۔ مگر اس نے مزید کریدا نہیں۔

"بہرحال جو بھی ہے، میں انکار کر کے بری کیوں بنوں؟ آپ نے انکار کرنا ہے تو خود کریں۔"

وہ اب اس کو کیا بتاتی کہ اس کا انکار کسی نے سننا ہی نہیں تھا۔

"اچھا پھر میں چلتا ہوں۔" وہ مایوس ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے اس کی پشت کی طرف دیکھا۔

اگر وہ کسی طریقے سے اس رشتے سے انکار کر بھی دے گی تو کل کو اس جیسا کوئی اور آجائے گا۔

وہ جو کوئی بھی ہوگا، اس کی آنکھیں سبز تو نہیں ہوں گی۔ وہ ہنستا ہوگا تو اس کے چہرے پر سورج تو نہیں روشن ہوتا ہوگا۔ وہ دوستوں کا دوست تو نہیں ہوگا۔ اس کو قدرت کی طرف سے رہنمائی تو عطا نہیں کی گئی ہوگی۔

وہ جو کوئی بھی ہوگا راحیل تو نہیں ہوگا نا؟

تو فائدہ پوری زندگی ایک انسان کے اندر کسی اور کا عکس ڈھونڈنے کا؟

ہمارے معاشرے میں بہت ساری لڑکیاں ایسا کرتی ہیں۔

کرتی رہیں گی۔

مگر اس کا انجام صرف پل پل کی موت ہوتا ہے۔

ایسی موت جو کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔

مگر کومل سلو پوائزن پر یقین نہیں رکھتی تھی۔

اس کا دماغ اس پل میں روشنی کی رفتار کے ساتھ چلا۔

Khawateen Digest December 2021

pklibrary.com

نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔
اس نے اپنی پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ سامنے کھڑے نوجوان کی طرف دیکھا اور اپنے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
"آیئے، بیٹھیے۔ بات کرتے ہیں۔"

☆☆☆

یہ پژمردہ سے دن تھے۔
بالکل اس کے دل کی طرح.....
ایک تو اس کا دل، اوپر سے باہر کا موسم... ایسی وحشت طاری تھی۔
ڈیرے پر اے سی بھی نہیں تھا اور کچھ اس نے خود اذیتی کی وجہ سے لگوایا بھی نہیں تھا۔
زندگی سے جیسے دل ہی اٹھ گیا تھا۔
لائبہ اس کا گناہ تھی۔ اس کا وجود اس کو شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں لے جاتا تھا۔
نہ جانے کیوں دنیا والوں کو لگتا تھا کہ جو ہوا اس کے بعد یہ صحیح فیصلہ تھا۔
وہ تو بس اس تماشے میں کٹھ پتلی سا تھا۔ پھر اس نے زندگی کی ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کا پہلا فیصلہ کیا۔
اور اپنے خواب تیاگ دیے۔
ویسے بھی جو انسان اتنا کمزور ہو کہ اپنے نفس پر قابو نہ پا سکے، اس کو کسی کا رہنما بننے کا حق نہیں ہے۔
بھابھی اس پر خوب چلائی تھیں۔ البتہ بابا اور بھائی خاموش تھے۔
اس کے بعد اس کے پاس دو راستے تھے، ایک بزنس اور دوسرا زمینیں۔
اس نے زمینوں کو ترجیح دی۔
وہ خود کو کھو دینا چاہتا تھا۔
وہاں جا کر نہ جانے کیوں اس کو ایک عجیب سا سکون ملتا تھا۔
وہ عموماً اپنے ڈیرے پر ہی ہوتا تھا۔
گھر.....؟ گھر سے جیسے سکون غائب ہی ہو گیا تھا۔

مگر جب وحشت حد سے سوا ہوئی تو وہ سگریٹ پھونکنے باہر آ گیا۔
سگریٹ کے پہلے کش پر کہیں قریب سے موسیقی کی آواز نے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔
سگریٹ سلگاتا اس کا ہاتھ ایک پل کے لیے تھما تھا۔
باغبانوں کا ٹولہ درختوں کے پاس آگ کا چھوٹا سا الاؤ جلائے بیٹھا ہوا تھا۔
وہ خیر دین بابا تھے، جو رات کے اس وقت تمبورہ لے کر بیٹھ گئے تھے۔
ان میں سے چند ایک نے اس کو دیکھا تو فوراً اپنی جگہ سے اٹھنے لگے مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ ایک فوراً اٹھ کر اس کے لیے موڑھا لے آیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں پر بیٹھ گیا۔
تمبورے کی تال پر شاہ لطیف کے الفاظ گونج رہے تھے۔
"ماروعمر سے کہہ رہی ہے کہ یہ ہماری رسم نہیں ہے۔ ہمیں اپنے اجداد سے ایسا سبق نہیں ملا کہ تمہارے عیش و عشرت، زیورات، سونا اور محل دیکھ کر اپنی عزتوں کا سودا کر لیں۔ میں عمر کوٹ میں آ کر یہ کام نہیں کروں گی۔ مجھے اپنے آباؤ اجداد کی کچی جھونپڑیاں تمہارے محلوں سے زیادہ عزیز ہیں۔
عمر کے محل میں ماروی بالکل اداس ہے، ماروی نے بجنا سنورنا چھوڑ دیا ہے۔ جب سے عمر نے قید کیا ہے، چہرہ بے رونق سا ہو گیا ہے۔ جب تک ماروی اپنے وطن ..... اپنے عزیزوں کے پاس نہیں جائے گی، اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آئے گی۔"
اس کو لگا کہ جیسے سارے جگنو ان کے گرد جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔
اس کی سگریٹ اس کی انگلیوں کے درمیان ہی دبی رہ گئی۔
اس کو ہوش اس وقت آیا جب خیر دین بابا نے تمبورہ بجانا بند کیا۔

pklibrary.com

کو پتا ہی نہیں چلا۔

ان دنوں اس نے اپنے آپ کو اتنا جلایا تھا کہ اب سگریٹ کی جلن کچھ نہیں کہتی تھی۔

''سائیں، کیوں روتے ہو؟'' خیر دین نے اپنا کلام ختم کر کے اس کو مخاطب کر کے پوچھا تو وہ ایک دم ہڑبڑا گیا۔

اس نے اپنے گال چھوئے تو وہاں پر آنسوؤں کے قطرے کہتے تھے کہ وہ سچ میں رو رہا تھا۔

کلام ختم ہو گیا تھا۔ بھیڑ آہستہ آہستہ چھٹنے لگی تھی۔

سب اپنے اپنے گھر کی طرف ہو لیے تھے۔

جن کا گھر نہیں تھا، وہ وہیں آس پاس سونے کی جگہ بنانے لگے۔

راحیل کا گھر تو تھا، مگر اس کو نہ اس گھر سے دلچسپی تھی اور نہ ہی نیند سے۔

''سائیں، جوگ لینا ٹھیک نہیں ہے۔ جوگ کا دوسرا نام ہی ناشکری ہے۔ دیکھو اپنے آس پاس کی ساری نعمتیں، یہ سب تمہاری ہیں۔ تمہیں جوگ لینا نہیں جچتا۔'' جب وہ اور راحیل اکیلے رہ گئے تو خیر دین بابا نے اس کو مخاطب کر کے کہا۔

اس نے اس بزرگ آدمی کے باریش چہرے کی طرف دیکھا، وہ چہرہ اس کو کہتا تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں دکھ کی ہزار داستانیں دیکھی تھیں۔

مگر پھر بھی کتنا اطمینان تھا، اس چہرے پر۔

''خیر دین بابا! میرا دل کرتا ہے کہ درویش بن جاؤں۔''

''درویش بننے کے ہزار طریقے ہیں۔ درویشی یہاں سے نکلتی ہے۔ یہاں سے.....'' انہوں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''میں نے گناہ کیا ہے۔'' نہ جانے رات کا فسوں تھا یا شاہ لطیف کے الفاظ ابھی بھی اس کے دل کی دیواروں میں گردش کر رہے تھے کہ اس نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

ہے۔''

''وہ کیا؟'' وہ بے چین ہوا۔

''توبہ!'' بابا کی بات پر اس نے ایک گہری سانس بھری۔

کبھی کبھار کچھ باتیں آئینے کی طرح شفاف ہوتی ہیں۔ مگر ہم اپنی ذات کے حصار میں اتنا گم ہوتے ہیں کہ ہمیں وہ آئینہ دکھتا ہی نہیں ہے۔

''توبہ کیسے ہوتی ہے بابا؟''

''توبہ کیا ہوتی ہے سائیں؟'' خیر دین بابا نے الٹا اسی سے پوچھا۔

''معافی.....'' وہ اٹکا۔ کبھی ان چیزوں پر اتنا غور ہی نہیں کیا تھا۔

''توبہ ہوتی ہے گناہ کا دوبارہ نہ دوہرانا۔ پوچھنا تو نہیں چاہیے مگر کیا گناہ کیا تھا آپ نے؟''

''اپنے نفس سے ہارا تھا۔'' وہ اپنے آپ سے بھی ہارا ہوا لگ رہا تھا۔

''تو پھر اب اپنے نفس کو ہراؤ!''

''تو نفس کا گلا گھونٹ کر توبہ قبول ہو جاتی ہے؟'' راحیل کی آواز ایسے دور دراز کے باسی کی طرح ہو گئی تھی جو غلط جگہ پر آ کر راستہ بھول بیٹھا ہو۔

''یہ توبہ کرنے والے پر ہے، ہر کسی کی توبہ قبول ہونے کا الگ مرحلہ ہوتا ہے۔''

''پتا کیسے چلتا ہے کہ توبہ قبول ہو گئی ہے؟''

''پتا چل جاتا ہے۔ تیرا دل تجھے بتا دے گا۔ توبہ قبول ہو جاتی ہے تو گناہ کی یاد بھی بھول جاتی ہے۔''

☆☆☆

راحیل نے ایک اچٹتی سی نظر اپنے بیوی پر ڈالی۔

بیوی..... کتنا اجنبی سا لگتا تھا یہ لفظ؟

جس نفس نے اس کو اس کے پاس جانے کے لیے بہکایا تھا اب وہ حلال ہوئی تھی تو وہ نفس نہ جانے کہاں جا سویا تھا؟

وہ اگر یہ نہیں بھی جانتا تھا تو لائبہ کے ساتھ کی گئی زیادتی کے بعد اس کو پتا چل گیا تھا۔

اس کی زندگی سہل تھی۔ اس لیے وہ قدرتی طور پر سہل پسند تھا۔

اس نے اپنی زندگی جی تھی اور بھرپور جی تھی۔

اس کے گھر والوں نے اس کو پوری زندگی دیا ہی دیا تھا، اب وہ اس سے کچھ مانگ رہے تھے تو کیسے انکار کرسکتا تھا؟

اس نے یہ رشتہ نبھانا تھا۔

کیسے نبھانا تھا، یہ نہیں بتایا گیا تھا اور نہ اس کو معلوم تھا۔

چوڑیوں کی کھنک پر اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

اس نے ایک بار اپنے نفس کے آگے ہار مان لی تھی۔ اب نہیں مانی تھی۔

اگر وہ سزا پائے گا تو کیا اس کو معافی مل جائے گی، اس کا گناہ دھل جائے گا؟

یہ پہلا خیال تھا جو لائبہ کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس کے ذہن میں آیا تھا۔

لائبہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ شادی کے بعد پہلی بار یہ عنایت اس نے اس پر کی تھی۔

''میں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کردوں گا۔'' جب یہ بات اس نے لائبہ کے سامنے کی تو وہ زور سے ہنس دی۔

ایسی ہنسی جس میں کوئی جھنکار نہ تھی، بس کھوکھلا پن تھا۔

''اب تلافی کے لیے بہت دیر ہوگئی ہے راحیل جہانگیر۔''

''مگر توبہ کے لیے تو دیر نہیں ہوئی۔'' یہ ان کی شادی کے بعد تقریباً پہلی باضابطہ گفتگو تھی۔

اگر کہا جائے کہ یہ ان کی زندگی میں پہلی باضابطہ گفتگو تھی تو شاید غلط نہ ہوگا۔

لائبہ اس کی کہانی کا تیسرا کردار تھی، جو اس کی کبھی بھی اس کو اہمیت نہیں دی تھی۔

''اگر ہم جرم قبول کرتے ہیں تو اسلامی قانون کے مطابق شادی شدہ کے لیے سنگسار۔ اور کنوارے مرد و عورت کے لیے سو سو کوڑے۔ لہٰذا، جرم قبول کرنے کی صورت میں سو کوڑے آپ کے لیے..... سو کوڑے میرے لیے۔ برداشت کر پاؤ گے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

کہاں گئی وہ شرمانی لجانی، ڈرتی گھبراتی ہوئی لڑکی جو کسی سے بات کرتے ہوئے بھی دس بار اپنے ہاتھ مسلا کرتی تھی۔

اس واقعے نے اس کو تبدیل کیا تھا یا اس کا ملمع اتار دیا تھا۔

''تمہارے خیال میں ہم دونوں کے لیے سو، سو کوڑے.....'' وہ جو کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنے لگا تھا کسی ادراک نے اس کو چپ کروادیا۔

سو کوڑے ان دونوں کے لیے...

''ہم دونوں کے لیے کیا مطلب؟'' اس کے دماغ میں جیسے اس رات کا سارا قصہ تازہ ہوگیا۔

اس نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔

لائبہ اب اپنے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔

''آپ نے اپنا آپ مجھ پر مسلط نہیں کیا تھا۔'' اس نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اور یہ جملہ بھی ایسے ادا کیا تھا جیسے کوئی عام سی بات سرگوشی کی صورت کردی ہو۔

راحیل نے ایک دم سے اس کے کندھے پکڑے۔

''مجھے سب کچھ سچ سچ بتاؤ۔''

''جو کچھ تھا دونوں طرف سے تھا۔ آپ کی اتنی ہی غلطی تھی جتنی میری تھی۔ یا میری شاید آپ سے زیادہ ہی تھی۔ میں آپ سے محبت کرتی تھی یا کم از کم سمجھتی تھی کہ مجھے آپ سے محبت ہے اور.....'' لائبہ بولتی چلی گئی۔

''یہ میری غلطی تھی کہ میں نے آپ کو نہیں

رہے تھے۔ میں تو اپنی غلطی پر رو رہی تھی۔''

راحیل کو لگا اس پر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔

شادی کے بعد پہلی بار راحیل کو اس لڑکی پر ترس آیا۔

اس نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا۔

اس کا پہلا ردعمل غصہ تھا۔ مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ شادی کے بعد وہ اکیلا نہ تھا جو اذیت سے گزر رہا تھا۔ وہ بھی اذیت سے گزر رہی تھی۔

اس وقت وہ کچھ ایسا نہیں کہنا چاہتا تھا، جس سے اس کی اذیت دوچند ہو جائے۔

اس لیے وہ فوراً اپنے کمرے سے طیش کے عالم میں نکل گیا۔

''تم صحیح کہتی ہو کہ میں بزدل ہوں۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ دنیا کے سامنے رسوا ہو سکوں۔'' اس نے لائبہ کو اگلی صبح آہستہ سے بتایا۔

کل کا غصہ جیسے کہیں دور جا سویا تھا۔

اس نے ایک نظر اس کی کلائیوں میں پہنی چوڑیوں پر ڈالی۔

وہ چوڑیاں جو اس نے کسی اور کے لیے بنوائی تھیں۔

مگر اب خواہشوں کا کیا کرنا تھا؟

نفس پر قابو پانے والے خواہشیں پالتے اچھے لگتے ہیں۔

ان کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے نہیں؟

اگر پرانا راحیل ہوتا تو اس کو باتیں سناتا، اس پر غصہ کرتا۔ مگر چیزیں وقت کی دھول سے پرانی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھار وقت کی دھول انسانوں کو نیا کر دیتی ہے۔

لائبہ نے جب کوئی جواب نہیں دیا تو وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''اب ہم کیا کریں لائبہ؟''

لائبہ کی پلکیں اس کے رات بھر تکیہ بھگونے کی چغلی کھا رہی تھیں۔

''انسان بہت بڑا سروائیور ہوتا ہے اور آپ کو پتا ہے جب میں اپنے فیوچر کا سوچتی ہوں تو اس میں آپ کہیں نہیں ہوتے۔'' یہ آج لائبہ کیسی باتیں کر رہی تھی۔

''کیا مطلب؟''

''آگے بڑھ جاؤ راحیل اور مجھے بھی بڑھنے دو۔''

''آگے بڑھ جاؤں؟'' اس نے ایسے جیسے اپنے آپ سے یہ پوچھا تھا۔

اس کے پاس تو جیسے یہ آپشن تھا ہی نہیں۔

مگر آج ایسا لگا جیسے لائبہ نے اس کے لیے پنجرے کے دروازے کھول دیے ہوں۔

لائبہ نے بھیگی پلکوں سے تسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

اس نے ایک بار پڑھا تھا کہ بہترین وقت وہ ہوتا ہے جس میں کام کیا جائے۔ اور تھکانے والی مصروفیت سب سے بہترین مصروفیت ہوتی ہے۔

☆☆☆

لائبہ نے کہا تھا کہ آگے بڑھ جاؤ۔ وہ کیسے آگے بڑھ سکتا تھا جب اس کے سارے راستے پیچھے کی طرف جاتے تھے۔

وہاں، جہاں وہ کسی کو چھوڑ آیا تھا۔

آج پیچھے پلٹنے کے لیے ہی وہ کورٹ گیا تھا۔

کبھی یہ جگہ اس کے خوابوں کا حصہ تھی، مگر آج اس کو اجنبی لگی۔

اس کو وہ اپنے چھوٹے سے آفس میں فائلوں کے پلندے میں چھپی مل گئی۔

وہ ابھی دروازے پر ہی تھا، جب کسی احساس کے تحت کومل نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں جیسے پتھر کی ہو گئیں۔

pklibrary.com

پیغام پہنچایا ہی نہیں تھا کہ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔
کومل کو بوسیدہ سا دروازہ دکھا، باہر سے جھانکتی راہداری دکھی، اس راہداری میں دہائیوں پرانا نیم کا درخت دکھا، مگر سامنے کھڑا راحیل کہیں نہیں دکھا تھا۔
وہ چند ثانیے بعد دوبارہ اپنی فائلوں میں گم ہوگئی۔
وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔
اس کی پتھر جیسی آنکھیں ابھی بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔
''کومل۔'' اس نے دھیرے سے پکارا۔
کومل نے اب کی بار ایسے سر اٹھا کر دیکھا، جیسے وہ اندھی ہوگئی تھی۔
''کیسی ہو؟'' یہ کیسا سوال تھا بھلا؟ راحیل کو اس کا اندھا پن دکھائی نہیں دے رہا تھا؟
ان سونی آنکھوں میں وحشتیں ٹپکتی نہیں دکھ رہی تھیں۔
اس کے قلم پکڑے کانپتے ہاتھ نہیں دکھ رہے تھے؟
کیا راحیل بھی کومل کی طرح اندھا ہوگیا تھا کہ اس کو دکھ نہیں رہا تھا کہ کومل کیسی تھی؟
وہ اسی کی طرح تھی۔ زندگی سے ناراض...
یا زندگی ان دونوں سے ناراض تھی۔
وہ نہیں جانتا تھا۔ مگر یہ ضرور جانتا تھا کہ وہ یہاں اپنی زندگی کو راضی کرنے ہی تو آیا تھا۔
''میں.....'' راحیل نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، پھر بند کرلیا۔
ایسے جادوئی الفاظ وہ کہاں سے لے آئے جو سب کچھ ٹھیک کردیں۔
''میری زندگی میں واپس آجاؤ۔'' کوئی اس کے اندر سے کرلایا تھا، مگر اس کے اندر اتنی بڑی ڈیمانڈ کی ہمت نہیں تھی۔
''مجھے معاف کردو کومل!''
کومل کی آنکھیں اب کی بار پتھر سے برف ہوئی

''اگر تمہاری ماروی میری جگہ ہوتی تو کیا کرتی؟'' اس کے الفاظ بھی برف کے بنے ہوئے تھے۔
''تو وہ مجھے گولی ماردیتی۔'' راحیل نے سچائی سے جواب دیا۔
''پھر؟'' جواب ادھورا تھا، وہ پورے جواب کی منتظر تھی۔
''پھر وہ اس کے بعد اپنے آپ کو بھی گولی مار لیتی۔'' راحیل نے جواب پورا کیا۔
''بس سمجھ لو کہ تمہاری ماروی نے پہلے تمہیں اور پھر خود کو بھی گولی مار لی ہے۔'' اس کے الفاظ قبرستان کی ویرانی لیے ہوئے تھے۔
راحیل نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری، ہاتھوں کو مسلا اور سامنے بیٹھی اس اکھڑ سی لڑکی کی طرف دیکھا۔
اگر وہ اتنی اکھڑ، اتنی ضدی نہ ہوتی تو وہ اس کی ماروی نہ ہوتی۔
یہ اچھی بات تھی یا بری، راحیل کی سمجھ میں نہیں آیا۔
''یہ..... یہ صرف میری غلطی نہیں تھی۔ لائبہ نے خود اقرار کیا ہے۔''
''ہمیں اندازہ ہوگیا تھا۔''
''ہمیں؟''
''مجھے اور ایشا کو۔ صرف تم ہی تھے جو اپنی ذات کے حصار میں اتنا گم تھے کہ اندازہ ہی نہیں کرسکے۔''
''ایشا نے اس کو کیوں نہیں بتایا؟''
وہ گلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس واقعے کے بعد صرف اس کے گھر والے نہیں تھے، جو اس سے بیگانے ہوئے تھے، یہ فاصلہ دو طرفہ تھا۔
''تو معافی کی کوئی گنجائش نہیں؟'' اس نے بہت مشکلوں سے اپنے آپ کو گڑگڑانے سے روکا۔
''نہیں، راحیل تمہارا گناہ کم ہوا ہے، مٹا نہیں

انداز ایسا تھا، جیسے وہ اپنے اندر سے لڑ رہی ہو۔

''صحیح.....'' اس کے گلے میں کچھ اٹکا۔

اب کی بار کومل نے اس کو ایسے دیکھا، جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ اس کا ایکسرے کر رہی ہو۔

ایک پل کے لیے راحیل کو اس میں پرانی کومل کی جھلک دکھائی دی۔

مگر دوسرے ہی پل وہاں پر ایک وکیل بیٹھی تھی۔

ایک لڑکی تھی، جس کا دل ٹوٹا تھا، جس کا اعتماد اس نے چکنا چور کیا تھا۔

اس لڑکی نے اس کو دیکھا، اپنا آپ سمیٹا اور اس کی آنکھوں میں وہ ان کہے سوال پڑھے، جو زبان پر آتے ہی منجمد ہو جاتے تھے۔

''تمہارا اور میرا ملنا ناممکن ہے۔ چاہے میرا دل کتنا بھی روئے۔ مگر اب اگر میں نے تمہیں معاف کر دیا تو زمانے کا یہ اصول قائم رہے گا کہ مرد کی ہر غلطی، ہر گناہ معاف ہوتا ہے۔

معاشرہ عورت سے اعلا ظرفی کی امید رکھتا ہے مگر میں کم ظرف بنتی ہوں اور معاشرے کو یاد دلاتی ہوں کہ مرد کا ہر گناہ معاف نہیں ہوتا۔ آج سے مرد بھی ہر غلطی، ہر گناہ سے مبرا نہیں ہے۔

اب تم توبہ کرو، اس بارگاہ میں جہاں تم نے گناہ کیا ہے۔ میرے پاس تمہارے لیے چاہ کر بھی کوئی معافی نہیں ہے۔''

اور وہ چپ چاپ اٹھ کر اس قبرستان جیسے سناٹے سے باہر آ گیا۔

بھلا قبروں سے بھی کسی کی منتیں پوری ہوتی ہیں؟

''راحیل.....'' شاید کسی قبر سے آواز آئی تھی۔

وہ رکا ضرور تھا، مگر پلٹا نہیں تھا۔

اب اگر وہ ایک اور بار اس کی طرف دیکھ لیتا تو زبان پر رکھے وہ سارے سوال شاید پگھل جاتے۔

آخری دن، وہاں ہاسم نہیں تھا وہ ہوتا تو بات الگ تھی۔ اس دن جب تم ڈر کر بھاگے تھے تو تمہیں سراہنے والے انسانوں میں سے کوئی بھی آگے بڑھ کر تمہاری مدد کرنے نہیں آیا تھا۔

سب وہیں کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اسی طرح اب جس موڑ پر تم کھڑے ہو، اس موڑ پر تم نے اپنے سارے محبت کرنے والوں کو دور کر دیا ہے۔

اب اگر کوئی تم پر بھونکے گا تو تمہارا کوئی محبت کرنے والا اس کو پتھر مارنے نہیں آئے گا۔ اور دنیا کھڑی ہو کر صرف تمہارا تماشا دیکھے گی۔''

لائبہ صحیح کہتی تھی کہ اس کو آگے بڑھ جانا چاہیے۔

اس لیے وہ پیچھے نہیں پلٹا تھا۔ مگر اس کے باوجود صرف اس کی زبان پر رکے الفاظ نہیں بلکہ اس کے دل کے گرد جمی ہوئی برف کی دیواریں کومل کے الفاظ نے پگھلا دی تھیں۔

وہ اس سے محبت کرتی تھی، اس کے لیے یہی کافی تھا۔

وہ ناک کی سیدھ میں وہاں چلتا گیا جہاں اس کی منزل تھی۔

ایک محبت کرنے والے انسان کو وہ منا نہیں سکا تھا۔

شاید باقیوں کو منا لے۔

☆☆☆

''میں راحیل سے محبت کرتی ہوں امی۔'' وہ اس دن گھر — جلدی آ کر چپ چاپ آئینے کے سامنے بیٹھ گئی۔

جب بچپن میں کوئی اس سے ایسی بات کر دیتا تھا، جس سے اس کو اپنی کم صورتی کا احساس ہوتا تو وہ اس آئینے کے سامنے بیٹھ کر خود میں عیب تلاشتی — رہتی۔

تب سے یہ آئینہ اس کا دوست بن گیا تھا۔

وہ اپنے عکس کو ایسے ہی دیکھ رہی تھی، جب امی

pklibrary.com

کو ایسی حالت میں بیٹھا پایا۔

نجانے کس خیال کے تحت اس نے اپنی ماں کے سامنے اپنی زبان پر لگے تالے کھول دیے۔

''میں نے اتنے عرصے سے اپنے جذبات جیسے منجمد کر لیے تھے۔

ایسے ہی منجمد جیسے ہر بار کوئی میری کم صورتی کا مذاق اڑاتا تھا تو کر لیتی تھی، یا پھر کوئی کہتا تھا کومل تم پر یہ رنگ سوٹ نہیں کرتا، نہ پہنا کرو۔ یا پھر کوئی مجھے اپنے اسٹینڈرڈ کی نہیں سمجھتا تھا یا پھر میرے سانولے رنگ کو کالا کہتا تھا۔''

بات محبت سے شروع ہو کر صورت پر آ گئی تھی۔

محبت میں بھی تو یہی غم تھا کہ اس سے محبت کا دعوا کرنے والا انسان کسی اور کی خوب صورتی سے بہک گیا تھا۔

''مگر کیا وہ خوب صورت ہوتی تو اس کو باندھ لیتی؟'' کوئی اس کے اندر سے بولا تھا۔

خوب صورتی نے اسے بہکایا تھا۔ باندھ تو نہیں سکی تھی۔

''نہیں، تم ہماری نظر سے دیکھو کہ تم کتنی پیاری ہو۔'' امی اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولیں۔

''یہ نظر کسی اور کے پاس کیوں نہیں ہے؟ یا شاید تھی کسی کے پاس، وہ مجھے انگی ڈکلنگ بولتا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں کے سامنے بھی اصل خوب صورتی آئی تو میرا نام و نشان مٹ گیا۔''

کسی یاد نے ذہن کے پردے پر دستک دی۔

وہ ان کی پریزنٹیشن کے دن تھے۔

اس دن راحیل کی پریزنٹیشن تھی اور وہ ضرورت سے زیادہ تیاری سے آیا تھا۔

وہ لوگ کلاس میں بیٹھے ہوئے تھے، ابھی پروفیسر نہیں آئے تھے۔

اس کی نظریں کتنی بار راحیل کے وجود پر بھٹکیں۔

فوراً اس کے سامنے آ کر ڈیسک پر بیٹھ گیا۔

''بہت ہینڈسم لگ رہا ہوں میں جو بار بار دیکھے جا رہی ہو۔'' اس کی باچھیں ہمیشہ کی طرح اس کو دیکھ کر کھلی جا رہی تھی۔

پہلے تو ایک دم وہ اپنی چوری پکڑے جانے پر جز بز ہوئی۔ پھر کندھے اچکا دے۔

''تو کیا ہوا؟ یہ تم لوگ اتنے جینڈر بائیسڈ کیوں ہو؟ ہم لڑکیاں تیار ہو کر تم لوگوں کو دکھانے آتی ہیں؟ تو ہمارا بھی حق ہے کہ جب تم لڑکے اتنا تیار ہو کر آؤ تو تمہیں دیکھیں۔ آخر تم سب اتنا تیار ہو کر ہمیں ہی تو دکھانے آتے ہو؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تو وہ گھبرا کر پیچھے ہوا اور ڈیسک سے گر گیا۔

وہ اس کو دیکھ کر ایک دم ہنس دی۔

راحیل کا گرنا اور کومل کی ہنسی کئی چہروں کو ان کی طرف متوجہ کر گئی۔

ان میں سے کئی چہروں پر ناگواری واضح تھی۔

خاص طور پر لڑکیوں کے چہروں پر۔

کل تک جو ان کے آگے پیچھے پھرتا تھا آج ایک کا ہو کر رہ گیا تھا۔

بے راہ رو کی راست روی کسی کسی کو ہی اچھی لگتی ہے۔

راحیل نے غور نہیں کیا مگر کومل کو لڑکیوں کی نظریں اپنے اندر تک جاتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

''کومل اگر تم ہنستے ہوئے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ لو تو پوری زندگی ہنسنا بھول جاؤ۔'' کلاس میں نجانے کس نے یہ تبصرہ کیا تھا، مگر کومل ہنسنا بھول گئی تھی۔

''اور اگر تم یہ کہتے ہوئے آئینہ دیکھ لو تو اپنی بدصورت شکل دیکھ کر خود ہی ڈر جاؤ۔'' راحیل نے کس کو یہ جواب دیا تھا، کومل نے نہیں دیکھا تھا۔

وہ بس اپنی ڈیسک پر چپ چاپ ایسے بیٹھ گئی تھی، جیسے وہ کسی کو دکھائی نہیں دینا چاہتی ہو۔

پروفیسر کے آنے کی وجہ سے بات آئی گئی ہو

pklibrary.com

''غصہ ہو؟''

''نہیں، عادی ہوں ان باتوں کی۔ تم بھی ہو جاؤ اگر مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہو۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

وہ جو اس سے بچ کر جانے لگی تھی، وہ بھی اس کے پیچھے ہولیا۔

''تم تو میری اگلی ڈکلنگ (بدصورت بطخ) ہو۔''

اس کی بات پر اس نے اسے پلٹ کر غصے سے دیکھا۔

راحیل نے مدافعانہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔

''تمہیں اگلی ڈکلنگ کی کہانی تو یاد ہوگی ناں؟ وہ بطخوں کے جھنڈ میں چھپا ہنس تھی۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو تم کہہ رہے ہو کہ میں ایک ہنس ہوں؟''

اس کا انداز اپنا ہی مذاق اڑاتا ہوا تھا۔

''میں کہہ رہا ہوں کہ تم وہ ہنس ہو، جس کو اپنی خوب صورتی کا اندازہ نہیں ہے۔''

''مذاق اڑا رہے ہو؟'' کومل بے یقین تھی۔

راحیل کے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ آ ٹھہری۔

''میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگلی ڈکلنگ صرف اپنے آپ کو اپنے آس پاس کی بطخوں سے کمپیئر کر کے اپنے آپ کو بدصورت گردانتی رہی تھی، مگر جب اس کو اپنے پر کھولنے کا موقع ملا تو اس کی خوب صورتی کو ان ندی تک محدود بطخوں نے بڑی حسرت سے دیکھا ہوگا۔'' وہ اب کی بار اس کے قریب آیا۔

''ایک دن تم بھی جب اپنی ذات کے گرد بندھے حصار کو کھول کر پر پھیلاؤ گی تو تمہیں دنیا کے کسی انسان کے اپروول کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

امی نے اس کو گلے لگایا تو وہ اس یاد کے حصار سے نکل آئی۔

''میں نے ابو سے کہا تھا کہ میں اس کو پسند کرتی ہوں مگر وہ نہ ملا تو مر نہیں جاؤں گی، مگر اب میں جی بھی نہیں پا رہی امی۔'' وہ نہ جانے کس احساس کے تحت بولتی جا رہی تھی۔

میری جیسی عامیانہ سوچ کی مالک، سنکی سی عورت۔ تم تو بہت خاص، بہت بہادر ہو کومل۔ جس کو اس معاشرے میں رہنے کے لیے کوئی گھٹیا ہتھیار اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' امی کا تسلی دینے کا انداز بھی انوکھا ہی تھا۔

اس نے سامنے لگے آئینے میں دیکھا۔

''اب میں آئینہ دیکھتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ اب تو میں اپنے جیسی بھی نہیں رہی۔'' اس نے ہچکیوں کے درمیان ان کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے اگلے کچھ دن اپنے آپ کو سنبھالنے میں گزرے تھے۔

اور امی کے اس کے رشتے کی بات چلانے میں۔

ان کو لگا تھا کہ شادی ہو جائے گی تو کومل سب کچھ بھول جائے گی۔

اس نے امی کو نہیں روکا تھا، وہ جانتی تھی کہ روکنے کا فائدہ نہیں تھا۔

امی کو جو صحیح لگتا تھا، وہ وہی کرتی تھیں۔

اور اس دن کومل کو ٹوٹا ہوا دیکھنے کے بعد تو امی اور زیادہ اپنے ارادے میں مضبوط ہو گئی تھیں۔

جس دن سہیل کے گھر والے اس کا رشتہ پکا کر گئے تھے وہ اگلے دن رومان کے ساتھ کراچی چلی گئی تھی۔

رومان کی پوسٹنگ وہیں تھی اور وہ اپنی شادی کے بعد باقاعدہ وہیں شفٹ ہو گیا تھا۔

کومل اپنے کیس کا کہہ کر آج کل زیادہ تر وہیں پائی جاتی تھی۔

امی شروع میں تو کچھ نہیں کہہ رہی تھیں کہ شاید ہوا پانی بدلنے سے اس پر کچھ خوش گوار اثرات مرتب ہوں۔ مگر جب آئے دن کا یہ سلسلہ بن گیا تو امی جھنجھلا گئیں۔

''آخر یہ کون سا کیس ہے جس کے سلسلے میں تم بار بار کراچی کا چکر لگا رہی ہو؟''

''بس ہے امی ایک..... اس کے بعد سمجھیں کہ میری قسمت بدل جائے گی۔'' وہ خواب ناک انداز میں مسکرا کر بولی۔

شادی کر کے اپنے گھر کی بنو۔"

"امی! ضرورت تو ہے۔ آپ بھول گئی ہیں کہ سہیل کی جاب نہیں ہے۔ وہ لوگ مجھ سے شادی میری جاب کی وجہ سے کر رہے ہیں۔ اب میری شکل تو ایسی ہے نہیں کہ میں ان کو پیاری لگوں۔ تو پھر کماؤں گی تو پیاری لگوں گی ناں؟" وہ معصوم سا چہرہ بنا کر آنکھیں پٹپٹا کر بولی تو امی کھسیا کر اپنے کام میں لگ گئیں۔

اس کے بعد امی نے اس کو دوبارہ کراچی جانے پر کچھ نہیں کہا تھا۔

وہ چپ چاپ اپنا کام کرتی رہی۔

اس دوران امی نے سہیل کے گھر والوں سے کیا بات کی کیا نہیں، اس کو نہیں معلوم۔

دل میں ایک بے چینی بھی تھی کہ کہیں سہیل اپنی زبان سے مکر نہ جائے۔

مگر یہ ساری بے چینی اس دن ختم ہو گئی جب اس کو اپنے بینک کی طرف سے کیش ڈیبازٹ کا میسج آیا تھا۔

اس دن کتنے عرصے بعد کومل کھل کر مسکرائی تھی۔

راحیل صحیح کہتا تھا۔ اس نے اپنے پر پھیلانے تھے۔ اس نے ندی تک محدود بطخ نہیں بننا تھا، اس نے ہنس بن کر اڑ جانا تھا۔

☆☆☆

"شیزان بھائی! میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔"

شیزان آج کل ایشا کی شادی کے سلسلے میں خیر پور ہی ہوتے تھے۔ سو اس نے موقع دیکھ کر بات کرنے کا سوچا۔

گو کہ وہ یہ بات جہانگیر صاحب سے بھی کر سکتی تھی مگر شرم آڑے تھی۔ لہٰذا اس نے شیزان سے ہی بات کی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اپنی پڑھائی کو آپ کو ضرور پریکٹس میں لے کر آنا چاہیے۔" وہ جو اس وقت نجانے کون سے حساب کتاب میں لگے ہوئے تھے، جرنل اور پین ایک طرف رکھ کر پوری طرح لائبہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

فیلڈ ہے آپ کے ذہن میں؟" انہوں نے کچھ دیر کے توقف کے بعد پوچھا۔

"بس کوئی بھی اچھی سی جاب ہو، جس میں پیسے اچھے مل جائیں۔" لائبہ نے اپنے ہاتھ مسلتے ہوئے جواب دیا۔ آج نجانے کہاں سے پرانی والی لائبہ لوٹ آئی تھی۔

اس کی بات پر شیزان نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ کو پیسوں کی کیا ضرورت ہے؟ اس گھر میں کسی چیز کی کمی ہے کیا؟"

"جب اس گھر میں رہوں گی ہی نہیں تو پھر کمی کیسی؟" اس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"میں راحیل سے طلاق لے رہی ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" نہ سمجھنے کے لیے وہاں کچھ تھا تو نہیں، مگر شیزان نے پھر بھی تصدیق چاہی۔

"میں راحیل سے طلاق لے رہی ہوں۔" اس نے اب کی بار سر اٹھا کر پورے اعتماد سے جواب دیا۔

"مگر کیوں؟" ابھی کچھ دن پہلے ہی تو ان کی راحیل سے اس جوگ سے پیچھا چھڑانے کی بات ہوئی تھی۔

کیا یہ اس کا نتیجہ تھا؟

"آپ جانتے ہیں کہ کیوں۔"

ایک پل کے لیے شیزان لاجواب ہو گئے۔

"کیا راحیل نے یہ بات کی ہے؟ اس نے کچھ کہا ہے آپ کو؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا گیا۔

لائبہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "جب لڑکا، لڑکی شادی جیسے رشتے میں بندھتے ہیں اور لڑکا اس رشتے کو نبھانا نہیں چاہتا تو پوری دنیا اس چیز کی توقع لڑکی سے کرتی ہے کہ لڑکی اپنی محبت سے اس کا دل جیت لے گی۔ اس رشتے کو کامیاب بنا لے گی۔ اپنے شوہر کے سارے زخم بھر دے گی۔

مگر کوئی بھی لڑکی سے یہ نہیں پوچھتا کہ اس کو خود بھی اس رشتے کو نبھانے میں دلچسپی ہے یا نہیں؟ کہیں وہ خود تو زخمی نہیں۔ ڈاکٹر بھی اگر بیمار ہوتا ہے تو

pklibrary.com

بولتے گلا رندھ گیا۔

مگر اس نے ایک بھی آنسو باہر نہ نکلنے دیا تھا۔

اس پل شیزان کو احساس ہوا کہ یہ لڑکی سچ میں بڑی ہوگئی ہے۔

وہ مسکرا دیے۔

بڑی شفیق سی مسکراہٹ تھی ان کے چہرے پر، جو لائبہ نے کبھی اپنے ابو کے چہرے پر بھی نہ دیکھی تھی۔

''میں اپنے کولیگ سے بات کرتا ہوں، اس کو اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔ بس اب حوصلہ نہیں ہارنا اور یہ نہیں سمجھنا کہ راحیل کے ساتھ ساتھ ہم سے بھی تمہارا رشتہ ختم ہوگیا ہے۔''

لائبہ نے آنسو صاف کر کے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ایک اور بات۔'' لائبہ کے کہنے پر شیزان پھر سے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''میرے گھر میں خرچے کے پیسے بھیجنا چھوڑ دیں۔ میں ان کا خرچا اب خود اٹھاؤں گی۔''

''مگر وہ تو.....''

''پلیز نہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میری قیمت چکائی جارہی ہے۔ اور ایسا ہے بھی تو میرے خیال سے جتنی میری اوقات ہے، میری قیمت چک گئی ہے، اس سے زیادہ مجھے مت گرائیں۔'' وہ شرمندگی سے بولی۔

''آپ ایسا کیوں بول رہی ہیں؟ اس سب میں راحیل کا۔ قصور تھا۔ یہ قیمت نہیں ہے قصاص ہے۔'' ان کی بات پر لائبہ نے نظریں چرالیں۔

''کیا کوئی ایسی بات ہے جو آپ مجھے بتانا چاہتی ہو؟'' شیزان نے بہت جانچتی ہوئی نظروں سے اس کو دیکھا۔

لائبہ جانتی تھی کہ وہ جتنی بھی ایمان دار ہوجائے مگر وہ کسی کو بھی اپنے اندر کا سچ نہیں بتا سکتی تھی۔ اگر تھوڑی سی عزت اور بھرم دنیا کے سامنے باقی تھا تو وہ اس کو باقی رکھنا چاہتی تھی۔

وہ ابھی اتنی بہادر نہیں ہوئی تھی۔

اس لیے وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

نازک ہوتے ہیں وہ خواب جو آنکھوں میں بستے ہیں اور آنکھ کھلتے ہی کرچی کرچی ہوجاتے ہیں۔

نازک ہوتے ہیں وہ غلط راستے..... جن کی سڑکیں انڈے کے چھلکوں کی طرح ہوتی ہیں ذرا سا غلط قدم آپ کو پاتال کی گہرائیوں میں لے کر چلا جاتا ہے۔

اور سب سے بڑھ کر نازک ہوتا ہے وہ خوب صورتی کا سحر جو نشہ اترتے ہی ٹوٹ جاتا ہے۔

پیچھے رہ جاتا ہے تو صرف پچھتاوا...

اور پچھتاوا کبھی بھی نازک نہیں ہوتا۔

اس کی جڑیں کسی پرانے درخت کی طرح بڑی مضبوط ہوتی ہیں۔

اور انسان جتنا بھی اس دل کو بہلا لے، وہ بچہ اس صدیوں کی روایت سے بغاوت نہیں کرسکتا۔

میں نے بچپن سے خواب دیکھا تھا کہ مجھے اس دنیا کی نظر میں اپنا آپ ثابت کرنا ہے۔

اس دنیا کو مجھے بھی اہمیت دینی پڑے گی۔

میرا خواب صحیح تھا۔ میرا راستہ غلط تھا۔

راحیل میرا سفید گھوڑے پر سوار کوئی شہزادہ نہ تھا۔

اس کے سارے راستے کومل کی طرف مڑنے چاہیے تھے۔

مگر میں شہزادی تو تھی ناں؟

کومل کہاں سے بیچ میں آگئی؟

میں نے اس کو احساس دلایا کہ اس کہانی کی سنڈریلا تو میں ہوں۔

پھر وہ آ بھی گیا۔ پھر وہ مجھے مل بھی گیا۔ مگر میں تہی دامن رہ گئی۔

جب میرے سارے خواب ٹوٹے تو میں نے خود کو سنبھال لیا۔

دنیا میں رہنا سیکھ لیا۔

میں نے اب بھی دنیا پر اپنا آپ ثابت کرنا ہے۔

اس دنیا کی نظر میں، جس میں میں اب ایک دھبے سے زیادہ کچھ نہیں ہوں۔

pklibrary.com

لے لی ہے۔

اور شوہر بھی ایسا جس کے ساتھ پر دنیا آپ کی قسمت پر رشک کرے۔

مگر یہ دنیا نہیں ہے جو پچھتاوے کے سانپوں کے ساتھ سوتی ہے۔

نہ ہی یہ دنیا ہے جو اپنے خوب صورت سے شوہر کو بیزاری کی نظر سے دیکھتی ہے، اور اس کی آنکھوں میں اپنے لیے بیزاری کے پیغام پڑھتی ہے۔

اور نہ ہی یہ دنیا ہے جو آدھی رات کو برے خوابوں سے اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اور اپنے ضمیر کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر اپنا حساب کتاب کرنے لگ جاتی ہے۔

یہ میں ہوں جو اس جہنم سے گزر کر واپس آتی ہوں۔

جب تک آپ میرے حصے کے جہنم میں نہیں جلو گے، تب تک آپ کو میرے اوپر انگلی اٹھانے کا کوئی حق نہیں ہے۔

اب میں مطمئن ہوں۔ ضمیر پر بوجھ تو اب بھی ہے مگر وہ مجھے ستاتا کم کم ہے۔

شاید سچی توبہ سے یہ خلش بھی جاتی رہے اور اور میں اپنے ضمیر کی عدالت سے پاک صاف ہو کر نکل آؤں۔

شاید اس دن مجھے بھی کوئی خوشی نصیب ہو جائے۔

یہ دوسری بات کہ اب میں نے خوشیوں پر تکیہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔

کیونکہ خوابوں سے بھی زیادہ نازک ہوتی ہیں خوشیاں...

اور ان خوشیوں کی امید کا پودا...

جو ذرا سے غموں کی آنچ سے مرجھا جاتا ہے۔

اور دوبارہ سانس لینے کے لیے صدیاں لگاتا ہے۔

☆☆☆

پرواز کے لیے پر کسی کسی کو ملتے ہیں۔ اور جن کو یہ نعمت عطا ہوتی ہے، ان کو یہ خدا کا عطیہ سمجھ کر قبول کر لینی چاہیے۔

جرم ہوا ناں؟

یہ فلسفہ کومل کو بچپن میں ہی سمجھ میں آ گیا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات تھی جب سہیل کے گھر والے باقاعدہ منگنی کرنے والے تھے۔ امی کا تو نکاح کا ارادہ تھا مگر ابو نے منع کر دیا تھا۔

وہ اب ابو کو کیا بتاتیں کہ ان کو یہ ڈیل سیکیور بھی تو کرنی تھی۔

پھر ہوا کچھ یوں کہ منگنی سے کچھ دن پہلے ان لوگوں کا انکار کا فون آ گیا۔ کیوں کہ ڈیل کے مطابق ان کو پیسے نہیں ملے تھے۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' امی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بین کرنے لگ جائیں۔ ان کی ساری جمع پونجی۔

''یہ ایسے ممکن ہے بیگم! کہ سہیل نے وہ سارے پیسے کومل کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیے ہیں۔'' وہ ان کے پاس بیٹھ کر بولے۔

''آپ کو معلوم تھا؟'' انھوں نے حیرت سے اپنے زندگی کے ساتھی کو دیکھا۔

''جی، مجھے علم تھا اور باقی سب کو بھی معلوم ہے۔ کومل نے ہمیں سب بتا دیا تھا۔''

''کومل..... کومل کہاں ہے؟'' ان کو ایک دم اپنی بیٹی کا خیال آیا جو ابھی تک کراچی سے واپس نہیں آئی تھی۔

وہ ایشا کا ولیمہ اٹینڈ کرنے کراچی گئی تھی۔ مگر کہا تھا کہ منگنی سے ایک دن پہلے آ جائے گی۔

مگر دو دن سے اس کا کوئی فون یا اطلاع نہیں آئی تھی۔

خود ثنا بیگم اتنی پرجوش تھیں کہ انہوں نے اس بات کو محسوس ہی نہیں کیا۔

ان کو ایک دم یاد آیا کہ کومل ان سے جاتے ہوئے کیسے ملی تھی۔

''امی! مجھ سے اچھی طرح مل لیں، پھر نہ جانے کب ملاقات ہو۔'' ان کے پیچھے آ کر ان کے گلے لگ کر بولی۔

انہوں نے حیرت سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ کومل

کے قریب ہوتی ہیں۔

وہ بہت زیادہ والہانہ محبت کا اظہار جرم سمجھتی تھی۔ اس طرح کا التفات کومل کی طبیعت کے خلاف تھا۔

''آج حیرت ہے اتنی محبت؟'' انہوں نے منہ موڑ کر گلے لگی ہوئی بیٹی کی طرف دیکھا۔

''بس امی! نہ جانے کیوں دل اداس ہو رہا ہے۔''

''ایشا کا ولیمہ اٹینڈ کرنا ضروری تو نہیں ہے۔ مت جاؤ۔'' ان کو اچھا نہیں لگا تھا وہاں پر لائبہ اور راحیل نے بھی ہونا تھا۔

مگر اس کے ابو نے کہا تھا کہ اس کو جانے دو کیونکہ لڑکیوں کے لیے یہی تو چند دن آزادی کے ہوتے ہیں۔

کومل جب جا رہی تھی تو نہ جانے ان کو کیوں لگا تھا جیسے کومل نے اپنے آنسو صاف کیے ہیں۔ مگر انہوں نے اس بات کو اپنا وہم سمجھ کر سر جھٹک دیا۔

کومل جذبات کا اظہار کرنے والے لوگوں میں سے نہیں تھی۔

''کومل کہاں ہے؟'' انہوں نے پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

''جرمنی۔''

''جرمنی..... اتنا بڑا فیصلہ..... اور بتایا بھی نہیں؟''

''ہمیں سب معلوم تھا مگر اس نے آپ کو بتانے سے منع کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کو معلوم تھا آپ اس کو جانے نہیں دیں گی۔''

''مگر کیوں؟'' ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔

''لوگ کہتے ہیں ثنا بیگم کہ مائیں اپنی بیٹیوں کی شکل دیکھ کر پہچان لیتی ہیں کہ ان کو کیا غم ہے۔ مگر آپ کیوں نہیں پہچان رہی تھیں کہ اس نے کون سا روگ لگایا ہوا ہے۔''

''مجھے لگا اس کی شادی ہو جاتی تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔''

''ایسے لوگوں میں شادی جو پیسوں کے لالچ میں آ کر اس کو قبول کر رہے تھے۔ جن کے دل میں ٹوٹ جاتی۔''

''اور لوگ؟ ان کی زبانیں کون بند کروائے گا؟''

''لوگوں کی زبانیں تو ہم اس وقت بھی بند نہیں کروا پائے تھے جب وہ ہماری بیٹی کی عام شکل و صورت پر اعتراض کرتے تھے۔'' عماد صاحب کے یہ کہنے پر ثنا بیگم نے کرب سے آنکھیں بھینچ لیں۔

دکھ تو ان کو ہمیشہ رہا تھا مگر وہ اپنی بنائی ہوئی جنت میں رہ رہی تھیں۔ ایسی جنت، جس میں رہ کر ان کو لگتا تھا کہ اگر ایک بار کومل کی شادی ہو گئی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

''آپ کی اس سے بات ہوئی ہے؟'' تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد ثنا بیگم نے پوچھا۔

عماد صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''جی، کل ہی وہ پہنچی ہے۔ آپ فکر مت کریں، وہ خوش ہے۔ آپ ذرا اپنے آپ کو سنبھال لیں تو میں آپ کی ویڈیو کال پر بات کرواتا ہوں۔''

انہوں نے بھی اپنے آنسو پونچھ لیے۔

وہ جو اپنی جگہ سے اٹھ کر جانے لگی تھیں، ایک دم اپنے شریک حیات کی طرف پلٹیں۔

''اور وہ جو میں نے پورے خاندان میں کومل کے رشتے کی منادی کر دی تھی تو اس کا کیا؟'' اب ذرا دماغ ٹھکانے پر آیا تو لوگوں کی باتوں کا بھی ڈر ستانے لگا۔

دل تو کیا کہ کومل کی بچی سامنے آئے تو اس کو دو جوتے لگا دیں۔

مگر اب پردیس میں بیٹھی ہوئی بچی کو کیا بولتیں؟

وہ اکیلی تھیں اور کومل کے ساتھ پورا خاندان!

''اب بیگم! آپ نے غلطی کی ہے تو اس کو آپ خود ہی دیکھ لیں کہ کس طرح سدھارنا ہے۔'' جب عماد صاحب ایسی معصوم شکل بنا کر کندھے اچکا کر کچھ کہتے تھے تو ان کو اندازہ ہوتا تھا کہ آخر ان کی اکلوتی بیٹی کس پر چلی گئی ہے۔

☆☆☆

نازک ہوتی ہیں وہ امیدیں، جو سر اٹھاتی ہیں

نازک ہوتے ہیں وہ رشتے جو بے بنیاد ہوتے ہیں، جن پر ہم اپنی امیدوں کا بوجھ ڈال دیتے ہیں۔

اور سب سے بڑھ کر نازک ہوتا ہے یہ دل.....

جو ذرا سی سخت بات سے ٹوٹ جاتا ہے۔

مگر آپ کو ایک بات بتاؤں؟

نازک ہونے کے باوجود ہمارے دل سے بڑھ کر کچھ مضبوط نہیں ہوتا۔

یہ ہمیں چلائے جاتا ہے۔ یہ دوبارہ جینے کی امید ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔

یہ جتنا ٹوٹتا ہے، اتنا ہی مضبوط ہو جاتا ہے۔

میں بھی اپنے ایسے ہی دل کو لے کر اپنے دیس سے جدا ہوئی ہوں۔

ہاں میں بھاگ رہی ہوں۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ میرا دل جتنا بھی مضبوط ہو جائے۔ یہ ایک دن ایسے ٹوٹے گا کہ اس کے ٹکڑے بھی مل نہیں پائیں گے۔

اس دل کی سلامتی کے لیے کبھی کبھار انسان کو صرف مذاق اڑاتے ہوئے چہروں سے ہی نہیں، بے بنیاد رشتوں سے بھی دور چلے جانا چاہیے۔

یہاں پر کسی کو پروا نہیں ہے کہ میرا رنگ کیسا ہے یا میں کم صورت ہوں۔ یا پھر میرا رشتہ آرہا ہے یا نہیں آرہا۔

بلکہ آپ کو مزے کی بات بتاتی چلوں، میرے ایک کلاس فیلو نے تو مجھے اپنی محبوبہ بننے کی آفر کر دی تھی کیونکہ میں اس کو پرکشش لگی تھی۔

اس کے بعد نہ جانے کیوں میں بہت دیر تک ہنستی رہی۔

خیر، میں نے اس کو منع کر دیا تھا کیونکہ اب میری زندگی میں محبت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

سو میں اب دماغ سے کام لیتی ہوں۔ اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں نے میری قدر کرنی شروع کر دی ہے۔ کیونکہ یہاں سب دماغ کی قدر کرتے ہیں۔

آگے وقت کہاں لے جاتا ہے۔ یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔

☆☆☆

بعد وہ پہلی بار زمینوں پر جا رہا تھا۔

ان کی ڈیل کے مطابق لائبہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔

طلاق کے کاغذات پر ان دونوں نے باہمی رضامندی سے دستخط کر دیے تھے۔

گو کہ شروع میں بابا ان سے ناراض تھے، مگر آج کل وہ پھر سے اس سے بات کرنے لگ گئے تھے۔

کچھ بھی تھا، ان کے رشتے کا انجام سب کو دکھائی دے رہا تھا۔

مگر کوئی بھی اس بات کو زبان پر لانے سے ڈرتا تھا۔

اور اب یہ مرحلہ پار ہو گیا تھا تو ایسا لگتا تھا جیسے ایک بہت بڑا بوجھ کندھوں پر سے ہٹ گیا ہو۔

گناہوں کا بوجھ تو اب بھی تھا مگر پھر بھی راحیل نے اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

زمینوں پر جانے کے لیے وہ باہر آ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

مگر پھر کچھ خیال آنے پر پیچھے ہٹ گیا۔

اگر وہ پبلک ٹرانسپورٹ سے وہاں چلا جائے تو؟

اس کا چابی والا ہاتھ ہوا میں ہی رہ گیا۔

اگر جوگ لینا تھا تو پوری طرح جوگ لینا بنتا تھا۔

وہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا تو کسی یاد نے اس کے ذہن کے پردے پر دستک دی۔

سال کے آخری دن تھے اور ان کا سیلیبس مکمل ہو چکا تھا۔ اکثر ہی کلاس میں کسی نہ کسی بات پر بحث مباحثہ ہو جاتا تھا۔

اس دن بھی بات آئین سے شروع ہو کر شاہ لطیف کی شاعری پر جا پہنچی تھی اور روحانیت اور جوگ پر اٹک گئی تھی۔

''ویسے یہ بات تو ان فیئر ہے۔ دنیا داری سے الگ ہو کر درویش بننا تو بہت آسان ہے۔'' یہ ہاشم تھا۔

''میں ایگری کرتی ہوں۔ دنیا داری چھوڑنے کا حکم تو اسلام میں بھی نہیں ہے۔ ہم ان درویشوں سے اتنا متاثر ہوتے ہیں جنہوں نے دنیا سے رابطہ ختم

یہ کومل تھی، وہ بحث کم ہی کرتی تھی مگر جب کرتی تھی تو تفن پھاڑ کر بولتی تھی۔

''بھئی جب دنیا سے دور رہو گے تو دنیا کی خواہش سے دور ہو گے ناں؟'' ان کی کلاس فیلو سارہ نے بھی نکتہ اٹھایا۔

''مگر یہ تو ان لوگوں کے ساتھ ناانصافی ہوئی جو معاشرے کی زنجیروں میں بندھے ہوتے ہیں۔ جب نفسانی خواہشوں کی ترغیب کے اشتہار آپ کے سامنے ہی نہ ہوں اور آپ دنیا کے کونے میں پناہ لے لو جہاں پر آپ کو دنیا اٹریکٹ نہ کرے تو پھر آپ بولو کہ آپ نے اپنے نفس پر قابو پالیا ہے تو ایسی جیت تو جیت نہیں ہوئی۔ مزہ تو جب ہے جب آپ اس دنیا میں رہ کر اس دنیا سے بے نیاز ہو جاؤ، دریا میں اترو اور دامن تر نہ ہو۔'' کومل کے الفاظ کے ساتھ ہی اس کو خیر دین بابا کی بات یاد آ گئی۔

بہت کم لوگ ہوتے ہیں جن کو دنیاوی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اور ان سے بھی کم وہ لوگ ہوتے ہیں جو ان دنیاوی نعمتوں کے ہونے کے باوجود فلاح کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

وہ واپس گاڑی کی طرف مڑ گیا اور اس میں بیٹھ کر زمینوں کا رخ کیا۔

دنیاداری چھوڑنے سے بہتر یہ نہیں تھا کہ دنیا میں رہ کر دنیا کی بھلائی کے لیے کچھ کرے۔

اس نے زمین پر جھک کر ہی مٹی میں رہنے والے لوگوں میں گھلنا ملنا تھا۔

ایک مٹی سے گندھی ہوئی لڑکی نے اس کو یہ سبق سکھایا تھا۔

جب ہم کچھ خراب کرتے ہیں تو یہ ہمارے اپنے ہاتھ ہونے چاہئیں جو سب کچھ ٹھیک کریں۔

اور جب انسان یہ کرنے پر آ جائے تو اس پر یہ ادراک ہوتا ہے کہ زندگی اپنی ساری خامیوں کے باوجود خوب صورت ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

کھلکھلاہٹیں..... جسے زمانے کی تلخیاں ختم کریں یا نہ کریں مگر انسان کے اندر کا شیطان ضرور ختم کر دیتا ہے۔

اور سب سے بڑھ کر نازک ہوتا ہے وہ حوصلہ..... جب اندھیری رات میں راستہ نہ مل پائے تو تاش کے پتوں کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

سب سے بڑھ کر نازک ہوتا ہے انسان۔ جو ذرا سی ٹھوکر کھانے پر گر پڑتا ہے۔

اپنی کمزوری کے آگے ہار مان لیتا ہے۔

لیکن کچھ اپنے حوصلہ کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔ ایسی پری کی طرح جو پر ٹوٹنے پر بھی اڑنا سیکھ جاتی ہے۔

آئی تھی ایسی پری میری زندگی میں بھی جسے میں نے کسی جادوگری کے فریب میں آ کر گنوا دیا۔

میرے نفس نے مجھ سے صحیح غلط کا شعور چھن لیا تھا۔

اور میں کسی اور کو اس چیز کا قصوروار ٹھہراتا رہا۔

میں فریب میں پھنسا ہوا تھا مگر یہ فریب میرا اپنا بنایا ہوا تھا۔

اور جس دن میں اس فریب سے نکلا تو میرے شعور نے میری آنکھیں کھول دیں۔

جب شعور سے ملاقات ہوئی تو زندگی نے مجھے سکھایا کہ نازک ہوتی ہے یہ زندگی، اس سے جڑے خواب، اس سے جڑی امیدیں اور اس سے وابستہ ہم.....

یہ ہم ہی ہیں جو ان چیزوں کے ٹوٹنے کو قبول نہیں کر پاتے۔

میں نے بھی نہیں کیا تھا۔

مگر جب زندگی نے تو یہ کی امید دکھائی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس زندگی کو اس کی ساری تلخیوں، اس کی ساری نزاکتوں کے ساتھ اپنانا پڑتا ہے۔

جب ہم کچھ خراب کرتے ہیں تو یہ ہمارے اپنے ہاتھ ہونے چاہئیں، جو سب کچھ ٹھیک کریں۔

اور جب انسان یہ کرنے پر آ جائے تو اس پر یہ خوب صورت سا ادراک ہوتا ہے کہ زندگی اپنی ساری خامیوں کے باوجود خوب صورت ہو سکتی ہے۔

☆

pklibrary.com

ماہرہ آج کل فارغ تھی کیونکہ طاہر بیرون ملک بزنس ٹور پر گئے ہوئے تھے، اس نے سوچا کیوں نہ اسٹور کی صفائی کرلی جائے، یہی سوچ کر آج وہ اسٹور میں تھی اور حیران پریشان تھی کہ کس قدر فالتو سامان اس نے اکٹھا کر رکھا تھا۔ صرف یہ سوچ کر کہ شاید کام آجائے۔ وہ ایک ایک کر کے سب فالتو سامان ایک طرف کرتی جارہی تھی کہ اس کے ہاتھ اپنی پرانی ڈائری آگئی۔

"ارے یہ یہاں کہاں سے آگئی۔" اس نے

مریم شہزاد

کُھلتا کسی پہ کیوں

اپنے آپ سے کہا، جلدی سے اس کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا اور کھول کر دیکھا تو کتنی ہی یادوں کے دریچے کھل گئے۔ بس اس کے بعد تو کسی کام میں دھیان ہی نہ لگا۔ جلدی جلدی اسٹور کو جیسے تیسے نبٹایا اور نہا دھو کر ڈائری لے کر بیٹھ گئی۔

پہلے ہی صفحہ پر خوب صورت اشعار اور پھر اس کی سہیلیوں کا ذکر، وہ کھو سی گئی۔ مائرہ، مدیحہ، ملائکہ، منتہیٰ، ماہم، مہوش، ماہ نور، اور ماہ جبیں۔ کتنا پیارا گروپ تھا ان کا کالج لائف کا، سب کے نام "م" سے شروع ہوتے سب شعر و شاعری کی دلدادہ۔

کالج لائف کو یاد کرتے کرتے اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ اچانک اس کو ایک خیال آیا، اس نے جلدی جلدی ڈائری کے صفحات پلٹے۔

"یہ رہا۔" اس نے ایک نظر اس صفحہ پر ڈالی سب کے فون نمبر اس پر درج تھے۔

"نجانے کس کس کا نمبر تبدیل ہو گیا ہو گا، اب تو ویسے بھی موبائل کا دور ہے، چلو کوشش کرتی ہوں۔" اس نے سوچا اور فون اٹھا کر نمبر ڈائل کیا، یہ مہوش کی امی کا نمبر تھا ان سے اس کا موجودہ نمبر لیا اور ایک سے دوسرا اور پھر کسی نہ کسی طرح سب سے رابطہ ہوتا ہی گیا۔

مائرہ نے سوچا کہ لگن سچی ہونی چاہیے، منزل مل ہی جاتی ہے۔ سب ہی اس کا فون سن کر بہت خوش ہوئیں۔ اس نے سب کو اپنے گھر دعوت دی اور جمعرات کو ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اتنے عرصے بعد مل کر سب وہی کالج کی الہڑ دوشیزائیں بن گئی ہیں۔ وہی بے تکان باتیں، وہی ہنسی مذاق۔ ٹائم گویا پر لگا کر اڑ گیا۔ مگر باتیں ختم ہی نہیں ہو رہی تھیں اچانک ماہم بولی۔

"ایک منٹ — گرلز!"

"اوووو گرلز۔" سب نے ہی دل کھول کر قہقہہ لگایا۔

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

"ہاں بھئی! کیوں نہ کچھ شعر و شاعری بھی ہو جائے۔" ماہم نے کہا تو سب نے ہی اس کی تائید کی۔

"مگر کیسے شعر؟" ماہ جبیں نے پوچھا۔

"میں بتاؤں؟" مدیحہ بولی۔ "ہم سب اپنے اپنے شوہر حضرات کو شعروں میں بیان کرتے ہیں۔"

"گویا شیروں کو شعروں میں۔" منتہیٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چلیں بھئی میزبان صاحبہ! آپ ابتدا کریں۔" ماہ نور نے مائرہ کو فرضی مائیک پیش کیا

مائرہ نے چند لمحے سوچا اور پھر گلا کھنکار کر بولی۔

"عرض کیا ہے۔"

"ارشاد، ارشاد۔" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

عزیز اتنا ہی رکھو کہ جی سنبھل جائے
اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے

"بس اس شعر کی چلتی پھرتی تفسیر ہیں، کہیں آنا جانا ہو، میں چھوڑ دیتا ہوں، شاپنگ کرنی ہو۔ بندہ حاضر ہے، دن میں کتنی ہی مرتبہ میری خیریت کے لیے فون کریں گے، بس ان کے سامنے رہو، ذرا سی چھینک بھی آ جائے تو پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ ڈاکٹر کے پاس چلو۔" مائرہ نے جھرجھری لی۔

"ہائے! سو رومانٹک۔ ایک میرے میاں ہیں صبح کے گئے رات کو آتے ہیں ذرا غلطی سے پوچھ لو، کہیں آنے جانے کا تو فرماتے ہیں نظر نہیں آتا کہ میں تھکا ہوا ہوں، خود چلی جایا کرو جہاں جانا ہو، اب یہ خدمت بھی میں ہی کروں، یا مجھے اور کوئی کام نہیں ہے کیا جو تم کو ادھر ادھر لے کر پھرتا رہوں۔ بس جناب وہ تو ہمارے آگے پیچھے نہ پھریں مگر میں ضرور جی حضوری میں لگی رہوں۔ اوہ ہاں ان کے لیے شعر......

کر کر کے منتیں تری عادت بگاڑ دی
دانستہ ہم نے تجھے ستم گر بنا دیا

مدیحہ کہتی چلی گئی۔

اب سب کی نظریں منتہیٰ کی طرف اٹھ گئیں، جو سدا کی خاموش طبیعت تھی۔ سب کے اس طرح دیکھنے سے وہ گڑبڑا گئی مگر پھر سنبھل کر بولی۔

"ابا جان نے میرے لیے اپنے جیسا بندہ ہی

pklibrary.com

پسند کیا، یہاں کیوں بیٹھی ہو، شام کو کیا کیا، کس سے فون پر باتیں کر رہی تھیں، اب اداس کیوں ہو، ہنسی کیوں آرہی ہے گویا......

ہنس ہنس کے سہے جائیں گے ترے جوروستم
شکووں سے مگر تم کو پشیمان نہ کریں گے

سب اس کی باتیں سن کر اداس ہو گئے تو ماہ جبین نے ماحول کی اداسی دور کرتے ہوئے کہا۔

”یاد ہے میری شادی تم سب سے پہلے ہوئی تھی اور تم سب کہتے تھے، چاند سورج کی جوڑی ہے۔تو جناب اس چاند کو تو سورج صاحب نے فل عبایا و نقاب کر دیا اور خود جب ـــ ساتھ چلتے ہیں اور لڑکیاں پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی ہیں تو دل چاہتا ہے کہ اس شعر کا ٹیگ لگا دوں۔

خدا کی قسم میں تمہارا نہیں ہوں
میں اک لہر ہوں، کنارا نہیں ہوں
کیوں تکتے ہو مجھے مسکرا کر
میں شادی شدہ ہوں، کنوارا نہیں ہوں

ماہ جبیں کا شعر سن کر سب کی ہی ہنسی نکل گئی۔

”کیا بات ہے ماہ جبیں! اب بھی تمہاری شاعری زبردست ہی ہے۔“ ملائکہ نے کہا۔

اب ماہم نے اپنے چہرے پر آئے بال ایک ادا سے ہٹائے اور بولی۔

”میں تو بس اتنا ہی کہوں گی۔“

نہ میں حسین نہ وہ خوبرو، مگر اک ساتھ
دیکھنے والے دیکھیں تو دیکھتے رہ جائیں

”ایک منٹ، ایک منٹ۔کیا بات ہے جناب کی، کیا زبردست واہ واہ واہ۔“ ملائکہ نے کہا۔گویا......

وہ تو وہ ہیں تم کو ہو جائے گی الفت ’ان‘ سے
تم اک نظر میرا محبوب نظر تو دیکھو

”واہ ملائکہ بی بی! فیض کے شعر کو ہی تبدیل کر دیا لیکن شعر پر صرف کمنٹ سے کام نہیں چلنے والا اپنے ”ان“ کو متعارف کراؤ۔“ مائرہ بولی۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں، عرض کیا ہے۔“

محبتوں کا مجھ سے نصاب مانگتا تھا
چاہتوں کا اپنی حساب مانگتا تھا
عجیب شخص تھا سب کچھ جاننے کے باوجود
اکثر وہ اپنی باتوں کا جواب مانگتا تھا

ملائکہ نے شعر سنایا تو ماہ جبیں بولی۔

”سمجھ میں نہیں آیا۔سمجھانا بھی پڑے گا۔“

”یعنی تشریح۔“ ماہم نے ہنس کر کہا تو ملائکہ نے کہا۔

”ارے بھئی،، اکاؤنٹنٹ ہیں میرے میاں صاحب، تو ہر چیز کا حساب چاہیے، پیسوں کا ہی نہیں وقت کا بھی اور سب چیزوں کا بھی، کہاں گئیں کب گئیں، امی ابو کو کتنا ٹائم دیا، دیر سے کیوں سوئیں، وغیرہ وغیرہ۔“

”بس اب مہوش! تم رہ گئیں۔جلدی سے سنا دو تم بھی تاکہ ہم اپنے اپنے گھر کی راہ لیں بہت ٹائم ہو گیا۔“ منتہیٰ نے گھبرا کر ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں تو بس اتنا ہی کہوں گی۔“

تمہیں پیار کرنا نہیں آتا
مجھے پیار کے سوا کچھ نہیں آتا
دنیا میں دو ہی کام ہیں کرنے کے
ایک تمہیں نہیں آتا، ایک مجھے نہیں آتا

مہوش نے شعر سنایا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

”بس یار! اب خود ہی سمجھ جاؤ، بس زندگی ایک بہت ہی نارمل راستے پر گامزن ہے اس میں پیار پتا نہیں کہاں ہے۔بس کام ہی کام ہیں۔مجھ جیسی رومانٹک بندی چولہے ہانڈی کی نذر ہو گئی۔“ مہوش نے ٹھنڈی آہ بھری۔اور سب نے جلدی جلدی اپنے عبایا اور چادریں سنبھالیں اور جلد ہی دوبارہ ملنے کے وعدے کے ساتھ اپنے گھروں کو روانہ ہو گئیں، سب کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔آج کی دعوت نے یقین دلا دیا تھا کہ دوست واقعی آکسیجن کا کام کرتے ہیں۔

pklibrary.com

"لاہور"

باب اول:

"بس ایک کار کریش ...
کسی مرض کی تشخیص...
ایک غیر متوقع فون کال...
کوئی نیا دریافت شدہ عشق...
یا ایک ٹوٹا ہوا دل...
بس اتنی سی دیر لگتی ہے ہمیں
ایک بالکل مختلف انسان بننے میں...
کتنی خوب صورتی سے نزاکت بھری ہے
ہمارے اندر
کہ یہ سب چیزیں بس ایک پل میں
کہ ہم کون ہیں۔"

(سیموئیل ڈیکر تھامپسن)

تاریخ تھی پانچ اپریل۔ شہر تھا اسلام آباد کا۔ اور وقت تھا صبح آٹھ بجے کا۔

ہماری کہانی ایک غیر متوقع فون کال سے شروع ہوتی ہے جو اس صبح کیف جمال کو موصول ہوئی تھی. کیف ان دنوں ہر بے روزگار اور ناکام انٹرپرونیور کی طرح دن چڑھے تک سویا کرتا تھا۔ اور دوپہر سے فجر تک کام کی تلاش میں لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ گہری نیند میں تھا جب گھنٹی بجی۔ اس نے سوئے ہوئے دماغ کے ساتھ فون کان سے لگایا۔

نمرہ احمد

مالا

pklibrary.com

مرد تھا جو اسے بتا رہا تھا کہ اس کا باس جو حال ہی میں برطانیہ سے آیا ہے اس سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کے پاس کیف کے لیے ایک جاب آفر ہے۔

"کون ہیں آپ کے باس؟" وہ جمائی روکتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں مسلیں۔ وقت دیکھا۔

"ماہر فرید۔"

"مگر میں کسی ماہر فرید کو نہیں جانتا۔"

"جان جاؤ گے۔"

ادھیڑ عمر آدمی نے کال کاٹ دی۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد کیف اوبر میں سوار اس لوکیشن کی طرف جا رہا تھا جو اس نامعلوم شخص نے بھیجی تھی۔

راستے میں اس نے گوگل کا سہارا لے کر ماہر فرید کو کھوجنا چاہا۔ ویسے تو بہت سے لوگ تھے اس نام کے لیکن انگلینڈ سے تعلق رکھنے والا ماہر فرید اسے ایک ہی ملا۔ اس کا کوئی سوشل میڈیا اکاؤنٹ نہیں تھا۔ بس ایک فیس بک گروپ پہ اس کا تذکرہ نظر آیا جو کہ اس کی کاؤنٹی کے چند رہائشیوں کے کمنٹس کی شکل میں تھا۔ کیف دلچسپی سے پڑھے گیا۔

معلوم ہوتا تھا کہ ماہر فرید کسی معروف کاروباری شخصیت کا بیٹا تھا اور اس کو کوئی ذہنی عارضہ لاحق تھا۔ چند برس قبل اس کے اپنے ماں باپ نے اسے ذہنی امراض کے ایک انسٹی ٹیوشن میں داخل کروادیا تھا۔ وہ ایک مدت وہاں زیر علاج رہا تھا۔

یہاں تک پڑھ کے کیف کا دل عجیب سا ہونے لگا۔ لیکن اگلی معلومات زیادہ چونکا دینے والی تھیں۔

کسی نے یوں ہی گپ شپ کے انداز میں لکھا تھا کہ جن دنوں ماہر زیر علاج تھا اس کے باپ نے ماہر کو اپنی جائیداد سے بے دخل کرنے کا اعلان کر دیا تھا اور وہ سب کچھ اپنی بیٹی کے نام چھوڑنا چاہتے تھے۔ ابھی وصیت کو قانونی شکل نہیں دی گئی تھی جب ایک کار کریش میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔

ان کی وفات کے بعد ماہر کی ماں اور بہن ملک ڈاکٹرز نے اسے کلیئر قرار دے کر ڈسچارج کر دیا۔ یوں وہ واپس اپنے گھر آ گیا۔ اور یقیناً اب وہ اپنے ماں باپ کے تمام اثاثوں کا مالک تھا۔

یہ خبر دو برس پرانی تھی۔

کیف نے مزید سرچ کرنا چاہا لیکن اس کے علاوہ انٹرنیٹ پہ اس شخص کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔

ہوٹل آ چکا تھا۔ یہیں ملاقات طے کی گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے کیف جمال کا دل چاہا کہ وہ واپس پلٹ جائے۔ لیکن کیا معلوم یہ کوئی اور ماہر فرید ہو؟ ایک دفعہ ملنے میں کیا حرج ہے؟

چند منٹ بعد وہ لفٹ میں سوار تھا جو اسے چوتھے فلور کی طرف لے کر جا رہی تھی۔

(شاید مجھے بہتر حلیے میں آنا چاہیے تھا۔) لفٹ کے قد آور آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

کیف ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ البتہ اس کا حلیہ لاپروا سا تھا۔ ماتھے پہ بکھرے بال۔ بڑھی ہوئی شیو۔ جینز کے نیچے سفید جوگرز جو مٹیالے ہو چکے تھے۔ پوری آستین کی چیک والی شرٹ جس کے بٹن کھلے تھے اور نیچے پہنی سفید ٹی شرٹ جھلک رہی تھی۔ اس نے بالوں میں ہاتھ پھیر کے انہیں درست کرنا چاہا لیکن کوئی فائدہ نہ تھا۔

چوتھے فلور پہ وہ لفٹ سے نکلا تو سامنے مرمریں راہداری تھی۔ فاصلے فاصلے پہ کمروں کے دروازے تھے۔

کیف نے گردن اٹھا کے ہوٹل کی شان و شوکت کو دیکھا۔ یہاں رہائش پذیر انسان کو اس سے کیا کام ہو سکتا تھا؟

کیف جمال ایک ناکام انٹرپرونیور ہونے کے علاوہ ایک ایونٹ فوٹوگرافر بھی تھا جس کو لوگ عموماً انسٹاگرام یا فیس بک کے ذریعے ہائر کیا کرتے تھے۔ اس جیسے اس شہر میں سینکڑوں دوسرے فوٹوگرافرز بھی تھے۔ پھر ماہر فرید نے اسے ہی کیوں

کمرے کا دروازہ ایک ادھیڑ عمر شخص نے کھولا۔ وہ بادامی رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کے بال اتنے سفید تھے کہ سلور لگتے تھے۔ اس نے سپاٹ تاثرات کے ساتھ سر سے پیر تک کیف کا جائزہ لیا۔ پھر خوش آمدید کہنے کے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ آواز سے پہچان گیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے اسے کال کی تھی۔ ماہر فرید کا مینیجر۔

کیف تیز ہوتی دھڑکن کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ سوئیٹ کافی وسیع اور شان دار تھا۔ سارے میں لیونڈر اور موتیے کی خوشبو پھیلی تھی۔ دیوار گیر کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور باہر پھیلی روشن صبح دکھائی دیتی تھی۔

کھڑکی کے آگے رکھے بڑے صوفے پہ ایک آدمی ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے کیف کو اندر آتے دیکھ رہا تھا۔ گرے پینٹ اور سفید شرٹ پہ چارکول ویسٹ پہنے وہ ایک بازو صوفے کی پشت پہ پھیلائے ہوئے تھا۔ پیچھے سے آتی روشنی میں اس کے کف لنکس چمک رہے تھے۔

وہ اس کی توقع سے زیادہ جوان اور وجیہہ تھا۔ کلین شیو چہرہ، جیل سے سیٹ بال اور پرکشش آنکھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کیف کا دل مرعوبیت سے بھر گیا۔ اس نے جس طرح کے شخص کا خاکہ ذہن میں بنایا تھا، یہ آدمی اس سے کہیں مختلف اور شان دار تھا۔

''آؤ کیف۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

بے تکلفی سے مسکرا کے ماہر فرید نے خالی صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جما کے بیٹھنے سے ماہر کا ایک بوٹ فضا میں تھا۔ اس بوٹ کی سیاہ چمکیلی سطح پہ کیف کا عکس نظر آ رہا تھا۔

''آپ یقیناً ماہر فرید ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے بیٹھا۔

دونوں کے درمیان شیشے کی میز تھی جس پہ لیدر کور والی بھوری ڈائری رکھی تھی۔ کچھ تھا اس کمرے کی فضا میں جو اعصاب پہ سوار ہوتا تھا۔ لیونڈر اور موتیے کی خوشبو اب محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ خاموش کمرے میں واحد آواز ماہر فرید کے ناخنوں سے آ رہی تھی جنہیں وہ صوفے کے ہتھے سے عادتاً رگڑ رہا تھا۔

کیف نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس شخص کی امارت اور وجاہت کے رعب میں نہیں آئے گا۔ کھنکھار کے پوچھا۔

''آپ مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے تھے؟''

''تمہیں کیا لگتا ہے، میں تم سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کے پوچھنے لگا۔

''میں ایک فوٹوگرافر ہوں اور لوگ مجھے فوٹوگرافی کے لیے ہی بلاتے ہیں۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

ماہر نے صوفے کی پشت سے بازو ہٹایا اور دونوں ہاتھ باہم پھنسا لیے۔ نظریں ہنوز اس کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔

''صرف فوٹوگرافر؟ اونہوں۔'' اس نے دائیں سے بائیں گردن ہلائی۔ ''تم ایک انٹرپرونیور بھی ہو۔ ناکام انٹرپرونیور۔ تم نے اپنا بزنس شروع کیا تھا۔ بلکہ ایک نہیں، تم نے بہت سے کام شروع کر کے چھوڑے ہیں۔ بہت سی نوکریاں بھی کی ہیں۔''

کیف نے چونک کے اسے دیکھا۔ پھر مینیجر کو۔ یہ بات غیر متوقع تھی۔ اس کے ابرو اکٹھے ہوئے۔

''آپ میرے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتے ہیں؟''

''زیادہ نہیں جانتا۔'' ماہر پیچھے کو ہوا اور کندھے لاپروائی سے اچکائے۔ ناخن پھر سے صوفے کے ہتھے سے رگڑنے لگا۔ ''بس اتنا معلوم ہے کہ تمہارا آخری کاروبار نہ صرف ناکام ہوا ہے بلکہ اس نے تمہیں بہت سے قرضوں میں ڈبو دیا ہے۔ اب حال یہ ہے تمہارا کیف کہ جن لوگوں کے پیسے تم نے ڈبوئے تھے، وہ تمہاری جان کو آئے ہوئے ہیں۔ ان

فیملی لائف اس بات سے کتنی متاثر ہو رہی ہو گی' میں سمجھ سکتا ہوں۔"

کیف کے ماتھے پہ شکن پڑی۔ اعصاب تن سے گئے۔ "آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

اس نے باری باری ان دونوں کو دیکھا۔

"میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔" ماہر فرید اس کی آنکھوں میں جھانک کے مسکرایا۔ اسے انٹرنیٹ پہ پڑھی باتیں یاد آئیں۔ کیا یہ کسی سائیکو پیتھ کی آنکھیں تھیں؟

"کیسے؟" (وہ پوچھنا چاہتا تھا "کیوں" لیکن منہ سے "کیسے" پھسل گیا۔ کیا وہ مدد کے لیے اتنا بے تاب تھا؟)

"میرے پاس تمہارے لیے ایک جاب ہے۔"

کیف کے اندر کسی نے سرگوشی کی۔ ابھی بھی وقت ہے' یہاں سے بھاگ جاؤ کیف! ورنہ تم کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ لیکن وہ نہیں بھاگ سکا۔ مجبوریوں نے اس کے قدم زنجیر کر رکھے تھے۔ اسے اس پراسرار شخص کی آفر سننی تھی۔

"اگر تم چند ماہ تک میرے لیے کام کرو تو میں تمہارے سارے قرضے بھی اتروا دوں گا' اور اگر تم دوبارہ کاروبار کرنا چاہو تو اس کو سیٹ کرنے میں تمہاری مدد بھی کروں گا۔ یہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ اتنا تو تم میرے بارے میں جان چکے ہو گے۔"

اس کے لہجے کی ہمدردی بھی کیف کو مصنوعی لگی۔ کچھ ناقابلِ اعتبار سا تھا اس شخص کے بارے میں۔

"مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

ماہر فرید کے چہرے پہ بھرپور مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے ایک گہری سانس باہر کو خارج کی۔ (بالآخر۔) اس نے میز پہ رکھی بھورے لیدر کور کی ڈائری اٹھائی۔ دو انگلیوں سے ڈائری کے اندر سے

جھکا کے دیکھا۔

وہ ایک لڑکی کی تصویر تھی۔ چہرے کا کلوز اپ۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سبز تھیں اور بھورے بال ڈھیلے جوڑے میں بندھے تھے۔ وہ ایک بے داغ' شفاف سا چہرہ تھا۔ ایسے چہرے انسان ہر روز نہیں دیکھتا۔

"تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟"

کیف نے نفی میں گردن ہلائی۔

"یہ تمہاری کزن صفورا کی دوست ہے۔"

"او کے۔" کیف نے الجھ کے اسے دیکھا۔ صفورا اس کی امیر سیکنڈ کزن تھی۔ مہینوں بعد اس سے ملاقات ہوا کرتی' اور اس میں بھی صفورا اس کو اسٹیبلش ہونے کے لیکچرز دیتی تھی۔ تنگ آ کے اس نے صفورا کی فیملی سے ملنا ہی چھوڑ رکھا تھا۔

"صفورا نے اپنی اس دوست (تصویر اٹھا کے دکھائی) کو دو تین دفعہ سیکیورٹی گارڈز رکھوا کے دیے ہیں لیکن اس لڑکی کے پاس زیادہ دن تک کوئی گارڈ نہیں ٹکتا۔ پچھلے ہفتے اس نے پھر سے صفورا سے کوئی قابلِ بھروسا گارڈ ڈھونڈنے کے لیے کہا ہے۔"

سفید بالوں والا منیجر اس دوران باری باری ان دونوں کو دیکھ رہا تھا جیسے ٹینس کے میچ میں گیند کا نظروں سے تعاقب کر رہا ہو۔

"او کے؟" کیف ابھی تک سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"تم' کیف...... تم اپنی کزن صفورا سے کہو گے کہ وہ اس لڑکی سے تمہاری سفارش کرے اور تمہیں اس کے پاس گارڈ کی جاب دلوا دے۔ ویسے بھی تم نے چند برس پہلے ایک سیکیورٹی کمپنی میں دو ماہ کے لیے کام کیا تھا۔ تمہارے پاس تجربہ بھی ہے اور تمہیں ضرورت بھی ہے۔ مجھے امید ہے صفورا! تمہیں انکار نہیں کرے گی۔"

تصویر رکھی اور مسکرا کے کندھے اچکائے۔

"بس اتنا سا کام ہے۔"

بالآخر معاملہ کیف کی سمجھ میں آنے لگا۔

دوست کا گارڈ بن جاؤں۔ اس کا اعتماد حاصل کروں۔ مگر کیوں؟"

ماہر فرید کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ چہرے پہ سختی در آئی۔

"ایسے کاموں میں کیوں نہیں پوچھتے۔ کام کی قیمت پوچھتے ہیں۔" ابرو اٹھا کے سرد لہجے میں تنبیہ کی۔

چند لمحے کے لیے سٹنگ روم میں سناٹا چھا گیا۔ ساری خوشبوئیں مر گئیں۔ اب صرف ایک احساسِ پریشانی تھا۔

"دیکھیں....." وہ قدرے دھیمے لہجے میں بولا۔ "مجھے اتنا تو بتائیں کہ مجھے اس کے پاس جاب کر کے کیا کرنا ہے؟ میرا مقصد کیا ہوگا؟ میں کوئی برا انسان نہیں ہوں۔ ٹھیک ہے، میرے مسئلے ہیں لیکن میں کچھ غلط نہیں کرنا چاہتا۔"

ماہر فرید نے بدمزہ ہو کے مینیجر کو دیکھا۔ "بہت بولتا ہے یہ۔"

مینیجر نے ہلکے سے شانے اچکا دیے۔ پھر کوٹ کی جیب سے ایک پرچی نکال کے کیف کے سامنے رکھی۔ اس پہ ایک رقم درج تھی۔

کیف نے رقم کے ہندسے پڑھے۔ پھر صفر گنے۔ ایک بار۔ دو بار۔ اس کی آنکھیں تعجب سے پھیلیں۔ نظریں اٹھا کے تذبذب سے ماہر کو دیکھا۔

"بدلے میں آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"اتنے پیسے کوئی نیک کام کے لیے نہیں دیا کرتا، کیف۔" وہ سپاٹ سے انداز میں بولا۔

کیف نے پرچی پہ درج رقم دوبارہ پڑھی۔ پھر سر جھکا دیا۔ اتنا کہ ٹھوڑی سینے سے لگنے لگی۔

"کسی لڑکی کا گارڈ بننے کا مطلب ہے، سائے کی طرح اس کے ساتھ رہنا۔ اس پہ نظر رکھنا۔ اس کو نقصان پہنچانا۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

سر ہنوز جھکا ہوا تھا۔

ماہر فرید کچھ دیر اس کے جھکے سر کو گھورتا رہا۔ پھر کے اسے دیکھا۔

وہ صوفے کے پیچھے چلا گیا اور کھڑکی کے سامنے چکر کاٹنے لگا۔ دائیں سے بائیں۔ پنڈولم کی طرح۔ وہ جیسے کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر قدم روک کے دور بیٹھے کیف کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ نہ مانو میری بات۔ پھر کیا کرو گے؟" اس کی آواز میں نرمی تھی جیسے سمجھا رہا ہو۔ "کاروبار میں نقصان اور قرضوں نے تمہاری سوشل لائف ختم کر کے رکھ دی ہے۔ مرد کا معاشی طور پہ اسٹیبلشڈ نہ ہونا اس کی عزت آدھی کر دیتا ہے۔ وہ لوگوں سے ملنا چھوڑ دیتا ہے۔ لاؤنج لزرڈ بن جاتا ہے۔ گھر سے نہیں نکلتا اور نکلتا ہے تو ایسے جوتے پہن کے۔"

کیف نے چونک کے اپنے جوتوں کو دیکھا۔ سفید جوگرز اب مٹیالے ہو چکے تھے۔ اس نے پیر قدرے پیچھے کیے لیکن وہ ان کو چھپا نہیں سکتا تھا۔

"دوسری طرف میری آفر ہے۔" ماہر فرید واپس اس کے سامنے آ کے بیٹھا۔ "میرے لیے صرف دو ماہ کام کرو۔ صرف دو ماہ۔ اور ساتھ اپنی فوٹوگرافی جاری رکھو اور اپنا نیا بزنس پلان بناؤ۔ دو ماہ ختم ہوتے ہی میں تمہارا بزنس خود سیٹ کروا دوں گا۔ مارکیٹنگ، نیٹ ورکنگ، میری ٹیم سب کر لے گی۔ صرف دو ماہ۔" وکٹری کی دو انگلیاں بنا کے دکھائیں۔

"آپ اپنا کام کسی سے بھی کروا سکتے ہیں۔ پھر میں ہی کیوں؟"

ماہر فرید پیچھے کو ہوا اور ٹانگ پہ ٹانگ جمائی۔ اب کے وہ بولا تو آواز میں برہمی تھی۔ "تم میرا کام کرو گے یا نہیں؟"

کیف جمال کا چہرہ ہلکا سا سرخ ہوا۔ "اوہ۔ آپ جلدی میں ہیں؟ اگر میں جا کے صفورا کو بتا دوں کہ کوئی اس کی دوست کو اسٹالک کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو؟"

ہنس پڑا۔ اور نفی میں سر ہلایا۔
''تم یہ نہیں کرو گے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے تصویر اٹھائی۔ کیف کو تصویر کی پشت نظر آئی۔ وہاں کچھ لکھا تھا۔ پانچ الفاظ۔
''آپ کو کیسے معلوم کہ میں یہ نہیں کروں گا؟'' وہ متعجب ہوا۔
ماہر فرید نے جواب نہیں دیا۔ اس نے لیدر ڈائری کھولی۔ کیف کی نظریں نیچے جھکیں۔ وہ جسے ڈائری سمجھ رہا تھا' وہ دراصل فوٹو البم تھی۔ اگلے ہی لمحے اس کا سانس رک گیا۔
پہلے صفحے پہ اوپر نیچے دو تصاویر تھیں۔ اوپری تصویر ایک سیاہ بالوں والی لڑکی کی تھی۔ وہ اس میں مسکرا رہی تھی۔
نچلی تصویر اسی لڑکی کی تھی لیکن اس کی آنکھیں نیلوں نیل تھیں۔ پیشانی زخمی تھی اور..... پلکیں بند تھیں۔ وہ شاید کسی لاش کی تصویر تھی۔
وہ آہستہ آہستہ صفحے پلٹانے لگا۔ ہر صفحے پہ اوپر ایک لڑکی کی زندگی سے بھرپور تصویر ہوتی اور نیچے زخمی یا لاش جیسے تصویر۔ تصویریں مختلف لڑکیوں کی تھیں۔
اس نے چھٹا صفحہ پلٹایا تو وہ خالی تھا۔ اس نے اوپری خانے میں سبز آنکھوں والی لڑکی کی تصویر ڈال دی۔
نیچے جگہ ابھی خالی تھی۔
کیف اپنی جگہ سے ہل نہیں سکا۔ اطراف میں ساری خوشبوئیں دم توڑ گئی تھیں۔ اب صرف کافور کی بو تھی جو اندر باہر پھیلی تھی۔
ماہر فرید نے کھلی ہوئی البم پرے دھکیلی اور نظریں اٹھا کے کیف کو دیکھا۔ پھر اس نے دو فقرے بولے۔ وہ دو فقرے اس کی ساری گفتگو پہ بھاری تھے۔ کیف جمال نے رکی ہوئی سانس خارج کی۔ پرچی پہ لکھے صفر گنے۔ یہ اس کے قرضے اتارنے کے لیے کافی تھے۔ اور ان دو فقروں کے بعد اس کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ صرف دو ماہ کے لیے وہ
''نہیں تیار ہوں۔''
ماہر فرید مسکرایا۔ ''گڈ بوائے۔'' پھر مینیجر کو اشارہ کیا۔ اس نے جیب سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کے کیف کے سامنے رکھا۔
''یہ کام کے علاوہ ہیں۔ صرف اس لیے کہ تم نئے جوتے خرید سکو۔ آئندہ کسی ورک میٹنگ پہ ایسے جوتے پہن کے مت آنا۔'' نرمی سے تنبیہہ کی۔ ''اب تم جاؤ۔ مالک تم سے خود رابطہ کر لے گا۔'' سفید بالوں والے کی طرف اشارہ کیا۔
کیف نے ایک ملامتی نظر اس پہ ڈالی' پیکٹ اٹھایا اور وہاں سے اٹھ گیا۔
''مجھے اس لڑکے پہ اعتبار نہیں ہے' ماہر۔'' اس کے جاتے ہی مالک ناخوشی سے بولا۔
''اعتبار تو مجھے تم پہ بھی نہیں ہے۔ لیکن ہم ساتھ کام کر رہے ہیں نا۔'' وہ عام سے لہجے میں کہتے ہوئے اٹھا اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ دوپہر کی سنہری روشنی سیدھی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی۔ ماہر نے آنکھیں بند کر لیں۔
''ماہر.....'' مینیجر نے پکارا۔ ''انتقام کے سفر پہ نکلنے والے کو چاہیے کہ وہ دو قبریں کھود لے۔ ایک دشمن کی اور ایک خود اپنی۔''
''یہ کنفیوشس نے کہا تھا۔ اور جانتے ہو اسے کیا چیز قبر تک لے گئی تھی؟ اپنے بیٹوں کی موت کا غم۔'' وہ آنکھیں بند کیے کہہ رہا تھا۔ سرد سی سرگوشی میں۔ ''موت سے بڑا کوئی غم نہیں ہے' مالک۔''
میز پہ البم یونہی کھلا رکھا تھا۔ مالک نے تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔ پھر ہاتھ بڑھا کے چھٹا صفحہ پلٹا تو سبز آنکھوں والی لڑکی کی تصویر کی پشت دکھائی دینے لگی۔
وہاں اردو میں لکھا تھا۔
''حور جہاں کی بیٹی کشمالہ۔''
☆☆☆
تاریخ تھی گیارہ اپریل اور شہر تھا اسلام آباد کا۔

pklibrary.com

بدلنے جارہی تھی۔ لیکن اپنی صبح کا آغاز کرتے ہوئے اسے اس بات کا علم نہیں تھا۔

کسی کو بھی نہیں ہوتا۔

وہ بیڈروم میں آئینے کے سامنے کھڑی کانوں میں ٹاپس پہن رہی تھی جب موبائل کی مخصوص ٹون بجی۔ وہ مسکرادی۔ یقیناً ماں کا فیملی گروپ پہ میسج آیا ہوگا۔ وہ بھی گڈ مارننگ کا۔ ماں ایک ہی میسج اپنے تینوں بچوں کو فیملی گروپ اور پرسنل چیٹ پہ الگ الگ بھیجتی تھیں۔ اس نے ٹاپس پہن کے موبائل اٹھایا اور میسج کھولا۔

ماں نے گڈ مارننگ کے ساتھ پوچھا تھا کہ کیا وہ ویک اینڈ پہ عزہ کی شادی کے لیے لاہور آئے گی؟

"کل بتاؤں گی ماں۔" اس نے مبہم سا جواب بھیج دیا۔ یہاں ریستوران میں اتنے کام پڑے تھے۔ وہ کیسے جائے گی لاہور، وہ کل معذرت کرلے گی۔

اپنی تیاری مکمل کرکے اس نے سر سے پیر تک آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ اس نے نیوی بلیو جینز کے ساتھ ہم رنگ دوپٹہ کندھے پہ ڈال رکھا تھا۔ بند گلے سے گردن میں پہنا نفیس سا ڈائمنڈ لاکٹ جھلک رہا تھا۔ پیروں میں زرد ہائی ہیلز تھیں۔ لمبے بھورے بال فرنچ جوڑے میں بندھے تھے۔ بیضوی چہرہ گلابی سفید سا تھا جیسے عموماً پٹھان لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ اور آنکھیں سبز تھیں جن کے گرد لائنر لگا تھا۔ جیسے سیاہ پیالے میں سبز پانی ہو۔

اس نے چہرہ دائیں بائیں گھما کے دیکھا۔ اسکن بے داغ تھی۔ کوئی ایک پمپل بھی نہ تھا۔ اس نے جوڑے سے دو لٹیں نکالیں اور انگلی سے رول کر کے چھوڑ دیں۔ وہ چہرے کے دونوں اطراف میں ٹھہر گئیں۔ اپنے عکس کو دیکھ کے مسکرائی۔ وہ کام پہ جانے کے لیے تیار تھی۔

ماں ہوتیں سامنے تو کہتیں کہ ان کی کوئی بیٹی حسن میں ان پہ نہیں گئی۔ کہاں اپنے زمانے کی حسین

ایک تو ماں کی جج میٹل آواز ہمیشہ ذہن کے پس منظر میں گونجتی تھی۔ چاہے سارا زمانہ کہے کہ ماہی (ماہ بینہ) اور مالا (کشمالہ) جیسا حسین کوئی نہ تھا' ماں نے نہیں ماننا تھا۔ وہ ماں کو یاد کرکے زیرِ لب مسکراتی ہوئی کھڑکی تک آئی۔

کھڑکی میں تین ننھے گملے رکھے تھے۔ ان میں سٹیپیلیا' بیگونیا اور ہیورتھیا اُگے تھے۔ کشمالہ نے چہرہ ان کی سطح تک جھکا کے دیکھا۔ باقی دونوں کی نئی گروتھ نظر آرہی تھی۔ مگر ہیورتھیا کے پتے بھورے ہورہے تھے۔ شاید روشنی اس کے لیے تیز تھی۔ اس نے پودے کو ذرا پیچھے کردیا۔

وہ باہر جانے کے لیے لاؤنج میں آئی۔ کونے میں رکھی ورک ٹیبل سے زرد ہینڈ بیگ اور لیپ ٹاپ اٹھایا۔ پھر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ تب ہی نگاہ میں کچھ کھٹکا۔ کشمالہ کے قدم زنجیر ہوئے۔ گردن دھیرے سے دائیں جانب موڑی۔

دیوار گیر بک شیلف میں ایک موٹی سی کتاب کی جگہ خالی تھی۔

کشمالہ کی نگاہوں نے نیچے میز تک کا سفر کیا۔ وہاں ایک دبیز کتاب دھری تھی۔

یہ شیلف سے نیچے کیسے آئی؟

اس نے چونک کے ٹیرس کے دروازے کو دیکھا۔ وہ بند تھا۔ کھڑکیاں بھی اندر سے مقفل تھیں۔

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ رات کو جب میں گھر آئی تھی' تب یہ کتاب اپنی جگہ پہ تھی یا نہیں؟ مگر کچھ یاد نہ آیا۔

اس نے سر جھٹکا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ صفورا نے کہا تھا کہ وہ نئے گارڈ کے لیے کسی کو آج بھیج رہی ہے۔ گارڈ آجائے گا تو یہ مسئلہ نہیں ہوگا۔ اسے ابھی اس معاملے کی فکر نہیں کرنی تھی۔ اسے اپنے نئے بزنس پلان پہ فوکس کرنا تھا۔

اور اس بارے میں سوچتے ہی مالا کے لبوں پہ ایک پرجوش مسکراہٹ بکھر گئی۔

ماموں کے گھر کی بالائی منزل پہ بطور پے انگ گیسٹ رہتی تھی۔ ماموں ممانی اور ان کی فیملی نیچے رہتے تھے۔ دونوں کی ملاقات ہفتوں بعد ہوا کرتی تھی۔

باہر ہوا ٹھنڈی تھی اور آسمان پہ سیاہ بادل تھے۔ آج خوب بارش برسنی تھی۔ کچن کے جالی دار دروازے سے ناشتے کی مہک پورچ تک آرہی تھی۔ وہ دروازے پہ رکی اور جالی سے اندر جھانکا۔ نسرین کام کرتی دکھائی دے رہی تھی۔

"نسرین..... کل میرے پورشن میں کوئی آیا تھا؟"

"نہیں باجی۔ کوثر تو چھٹی پہ ہے دو دن سے۔" اس نے صفائی والی لڑکی کا نام لیا۔

کشمالہ پورچ کی طرف بڑھ گئی۔ البتہ اس کی سوچتی نظروں نے گیٹ اور لان کا جائزہ ضرور لیا تھا۔ کون تھا جو اس کی غیر موجودگی میں اس کے پورشن میں آتا تھا؟ بلکہ نہیں۔ اسے ابھی اس بارے میں نہیں سوچنا تھا۔ اسے آج ظہیر کو اپنے نئے بزنس پلان کی پریزنٹیشن دینی تھی۔ اسے اپنی توانائی برقرار رکھنی تھی۔

ظہیر اس کا کلاس فیلو تھا۔ دونوں نے لاہور میں ایک ساتھ گریجویٹ کیا تھا۔ پھر ظہیر اسلام آباد واپس آگیا۔ کشمالہ کے پاس آئیڈیاز تھے اور ہمیشہ ہی ہوتے تھے۔ اور ظہیر کے پاس سرمایہ تھا جو کشمالہ کے پاس نہیں تھا۔ ابا بچپن میں ہی اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ سعودیہ میں جاب کرتے تھے۔ بچوں سے تعلق نہ ہونے کے برابر تھا۔ چار سدہ میں ان کی زمینیں اور باغ تھے۔ ابا کی وفات کے بعد بھی ماں نے کبھی نوکری نہیں کی۔ صرف حساب کتاب کیے۔ زمینوں اور ٹھیکوں کے رجسٹر سنبھالے۔ لیکن اپنے تینوں بچوں کو ایک اچھی زندگی اور اعلا تعلیم فراہم کر دی۔

ماہی آرکیٹیکٹ تھی۔ معید ڈاکٹر بن چکا تھا۔ اور کشمالہ کو ہمیشہ سے "اپنا کام" کرنے کا شوق تھا۔

شروع کرنے کا سوچا تو اس کے پاس سرمایا نہیں تھا۔ ان دنوں ماں کو بھی ماہ بینہ (ماہی) کی شادی کرنی تھی۔ گو کہ ماہی اس سے چھوٹی تھی لیکن اس کی عباد سے منگنی برسوں سے طے تھی۔ عباد ان کی سگی خالہ کا بیٹا تھا۔ کشمالہ ان حالات میں ماں پہ بوجھ نہیں ڈال سکتی تھی۔ سو اس کو ظہیر کی انویسٹمنٹ کی ضرورت تھی۔

یوں پانچ برس پہلے ظہیر اور اس نے مل کے ایک بزنس کی بنیاد رکھی۔ ظہیر کی انویسٹمنٹ اور مالا کے آئیڈیاز اور محنت۔ اس وقت جو ناممکن لگتا تھا' وہ پانچ برس بعد شہر کے معروف اور ایلیٹ ریسٹورانٹس میں شمار ہونے لگا تھا۔

اوشن۔ Ocean

اور اوشن (ریستوران) کے لیے اس نے پانچ برس پہلے لاہور چھوڑ دیا تھا۔ ماں اس فیصلے سے خوش نہیں تھیں لیکن انہوں نے کبھی منع نہیں کیا۔ ہمیشہ ساتھ دیا۔ معید میڈیکل پڑھ رہا تھا اور ماں کے ساتھ ہوتا تھا۔ پھر ماہی اور عباد بھی اسی کالونی میں رہتے تھے۔ یوں ماں کو اس کی ضرورت نہ تھی۔

ایک سال پہلے عباد کی کینیڈا میں جاب لگ گئی تھی۔ پہلے وہ گیا اور پھر چھ ماہ پہلے ماہی بھی کینیڈا چلی گئی۔ ماں کے پاس صرف معید تھا جو سرجری میں ٹریننگ کر رہا تھا۔ ایک احساس ہوتا تھا کہ ماں قدرے اکیلی ہوگئی ہوں گی۔ وہ سوچتی بھی تھی کہ ہر دوسرے ویک اینڈ پہ لاہور جایا کرے گی۔ لیکن لاہور جاتے جاتے اسے ایک ڈیڑھ ماہ گزر جایا کرتا تھا۔ اور اب..... اب وہ اوشن کے لیے ایک نئے بزنس پلان پہ کام کرنے جا رہی تھی۔ اب تو شاید وہ چھ ماہ بعد لاہور جا سکے گی۔

یہ نیا آئیڈیا اسے چند ہفتے قبل آیا تھا۔ اوشن کے پیچھے کچھ جگہ خالی تھی جو ظہیر کی ملکیت تھی۔ پلان یہ تھا کہ وہ دونوں مل کے وہاں ایک بیکری بنائیں۔ لیکن وہ ایک منفرد طرز کی بیکری ہوگی۔ اور اس دفعہ کشمالہ خود بھی انویسٹ کرے گی۔ اس نے

pklibrary.com

دفعہ پوری تیاری کے ساتھ اسے پریزنٹیشن کے ذریعے بتانا چاہتی تھی تاکہ وہ انکار نہ کر سکے۔

ڈرائیو کرتے ہوئے وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔ دفعتاً موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ جانتی تھی اس وقت کس کی ویڈیو کال آسکتی تھی۔ اس نے ہولڈر میں لگے فون کا بٹن دبایا۔ اسکرین پہ ویڈیو کال روشن ہوگئی۔

"کیسی ہو ماہی؟"

"ہمیشہ کی طرح خوب صورت۔" ماہی کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ مالا نے اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے مسکرا کے موبائل اسکرین کو دیکھا۔ وہاں ماہی نظر آرہی تھی۔ کینیڈا میں اس وقت رات تھی۔ ماہی کچن کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی جوسر کے جگ سے جوس گلاس میں انڈیل رہی تھی۔ گوری رنگت' گلابی گال' اور بھوری آنکھوں والی ماہی ایک کیوٹ سی پٹھان لڑکی تھی۔ بال چھوٹے اور باب اسٹائل میں کٹے تھے۔ ایک طرف سے کان کے پیچھے اڑسے ہوئے۔ اور دوسری طرف گال پہ آگے کو گرتے ہوئے۔ یہ ماہی کا سگنیچر ہیئر کٹ تھا جس کو وہ کبھی نہیں بدلتی تھی۔

"تم نے ظہیر کو اپنا بزنس پلان دکھانا ہے نا آج۔ سوچا تمہیں وش کر دوں۔" ماہی جگ سے گلاس میں جوس انڈیلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تھینک یو ماہی۔ اور تم ٹھیک ہو؟ اپنا خیال رکھتی ہو نا؟"

"مجھے چھوڑو۔ ظہیر کا بتاؤ۔ وہ مان جائے گا نا؟" ماہی کچن اسٹول پہ بیٹھی۔ کہنیاں کاؤنٹر پہ رکھیں اور جوس کا گلاس کہنیوں کے درمیان رکھا۔ پھر اسٹرا ہونٹوں کے بیچ ڈال کے گھونٹ بھرا۔

"وہ بزنس مین ہے۔ اتنے اچھے آئیڈیا کو نہ نہیں کہے گا۔"

"تم نہ ظہیر پہ زیادہ ہی ٹرسٹ کرتی ہو۔" اسٹرا ہٹا کے اس نے خفگی سے کہا۔ آنکھیں شکی انداز میں چھوٹی ہوئیں۔ "وہ دل کا شیخ ہے۔ میں بتا رہی ہوں

کشمالہ ڈرائیو کرتے ہوئے مسکرا دی۔

"کیوں اتنا شک کرتی ہو لوگوں پہ؟"

"تم جو بھی کہو..... لیکن ماہی کی جج منٹ کبھی غلط نہیں ہوتی۔" فخر سے کالر جھٹکا۔

کشمالہ مسکرا دی۔ ماہی ایسی ہی تھی۔ ماں کے مطابق ان کی سب سے زیادہ سمجھ دار اولاد۔ اور مالا کے مطابق سب سے زیادہ شک کرنے والی۔ وہ خود اس کے برعکس تھی۔ سب پہ بھروسا کرنے والی۔ لوگوں کو چانس دینے والی۔ اسی لیے اسے امید تھی ظہیر مان جائے گا۔

"مالا....." ماہی کہتے کہتے رکی۔ کشمالہ اپنی بہن کو اتنے اچھے سے جانتی تھی کہ اسے معلوم تھا وہ اب کیا بات کرنے جا رہی ہے۔

"کچھ تو کچھ نہیں ہوا نا۔"

"نہیں۔ اب میں چلتی ہوں۔ اوشن آ گیا ہے۔" اس نے کتاب کے اپنی جگہ پہ نہ ہونے والی بات گول کر دی۔ کم از کم اس وقت وہ ماہی کا لیکچر نہیں سن سکتی تھی۔

اوشن نامی ریستوران نیلے اور سفید رنگوں میں استوار کیا گیا تھا۔ برآمدے کی میزیں لوگوں سے پُر تھیں۔ گفتگو' قہقہے' ناشتہ اور کافی کی مہک۔ اندر کا ہال بھی تقریباً بھرا ہوا تھا۔ ہر روز کی طرح۔ اس کے آتے ہی ادھر ادھر جاتے عملے نے اسے جہاں دیکھا' وہیں رک کے سلام کیا۔

"بارش آنے والی ہے۔ مزید مہمانوں کو لان میں مت بٹھاؤ۔" گزرتے ہوئے اس نے کسی کو روکا۔ "اور پندرہ بیس منٹ تک جو بھی لان میں بیٹھا ہو اس کو بہت ادب کے ساتھ برآمدے میں موو ہونے کے لیے کہہ دو۔" پھر ایک ویٹر کو روکا۔ دو انگلیوں سے قریب آنے کی ہدایت دی۔ وہ مؤدب سا چلا آیا۔

"اس کٹلری کو یہاں سے اٹھاؤ۔" تحکم سے

pklibrary.com

ایک میز کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور فاروق سے کہو، اس کو واش کر کے بف ڈرائی کر کے بھیجے۔ مجھے اتنی دور سے اس پہ پانی کے داغ نظر آرہے ہیں۔'' لہجہ دو ٹوک مگر نرم تھا۔ کہہ کے وہ رکی نہیں۔ ہائی ہیلز سے چلتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

اوپر آ کے پہلے ظہیر کے آفس میں جھانکا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ دیر سے آتا تھا اور جلدی چلا جاتا تھا۔ خیر ہے۔ وہ اس کا انتظار کر لے گی۔ پھر وہ اپنے آفس میں آئی جہاں صاعقہ پانی کی ٹھنڈی بوتل اور اس کی کافی رکھ رہی تھی۔

''تھینکس صاعقہ۔'' وہ مسکرا کے اپنی سیٹ کی طرف آئی۔ اس کا آفس چھوٹا سا تھا۔ آفس ٹیبل پہ کھڑکی سے سیدھی دھوپ پڑتی تھی۔ وہاں کیکٹس کا ننھا سا سفید گملا رکھا تھا۔

''ہیلو شیلڈن۔'' اس نے مسکرا کے گملے کی مٹی تک چہرہ جھکا کے اسے دیکھا۔ سیدھا لمبا سا کیکٹس جس کا نام اس نے شیلڈن رکھا تھا۔ وہ اسے گزشتہ روز کے مقابلے میں بڑا لگا تھا۔

''میم.....'' صاعقہ نے جاتے جاتے کہا۔ ''کوئی کیف جمال آپ سے ملنے آیا ہے۔ بھیجوں؟''

''ہاں اسے بھیجو۔'' وہ اپنی پاور سیٹ پہ بیٹھی اور کمر پیچھے ٹکائی۔ ایک سکون سا وجود میں بھر گیا۔ اس کا یہ آرام دہ آفس۔ (گردن موڑ کے کھڑکی کو دیکھا جو ٹیبل کے ساتھ بائیں طرف تھی) کھڑکی سے نیچے نظر آتا ریستوران کا لان۔ پھول۔ پودے۔ کونے میں لگے گھنے درخت۔ اوشن اس کی وہ جنت تھا جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ اور اب وہ اس کو مزید پھیلانے جا رہی تھی۔

لیکن پہلے اسے سیکیورٹی گارڈ کا انٹرویو کرنا تھا۔

اس نے موبائل پہ صفورا کی چیٹ کھولی۔ اور کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس کا میسج دوبارہ پڑھا۔ وہ اپنے کزن کیف جمال کی سفارش کر رہی تھی۔ وہ ضرورت مند بھی تھا اور قابلِ بھروسا بھی۔

صفورا نے تقریباً درخواست کے لہجے میں لکھا تھا کہ مالا اس کو جاب دے دے۔ وہ پچھلے گارڈز کی طرح جاب چھوڑ کے نہیں جائے گا۔

انٹرویو بھی ایک فارمیلٹی ہی تھا۔ صفورا نے کہہ دیا تو بس کہہ دیا۔ صفورا بہت سوشل اور تعلقات رکھنے والی لڑکی تھی۔ کسی کو ملازم چاہیے یا گارڈ، صفورا سے سب سے پہلے رابطہ کیا جاتا تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو کشمالہ نے سر اٹھایا اور کچھ کہنے لگی۔ لیکن نووارد کو دیکھ کے رک گئی۔ آنکھوں میں تعجب ابھرا۔

''کیا نام ہے آپ کا؟'' تصدیق چاہی۔

''میں کیف ہوں۔ کیف جمال۔'' سامنے کھڑا نوجوان رسمی مسکرا کے بولا۔

''آپ سیکیورٹی گارڈ کی جاب کے لیے آئے ہیں؟''

''جی۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ مالا نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ اس کے اب تک کے رکھے تمام گارڈز کرخت چہروں اور مونچھوں والے ہوتے تھے۔ یہ ایک پڑھا لکھا، اسمارٹ سا نوجوان لگتا تھا۔ حلیہ بے پرواہ سا تھا۔ بال ماتھے پہ کٹے ہوئے اور بل دار تھے۔ ان کو پیچھے کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ چہرے پہ چند دن کی بڑھی شیو تھی۔ آنکھیں بھوری تھیں اور رنگت کھلتی ہوئی۔ جینز کے اوپر ملٹری گرین رنگ کی کالر شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ گریبان کے اوپری بٹن کھلے تھے اور نیچے سے سفید شرٹ جھانک رہی تھی۔ کف بھی ایک تہہ موڑے ہوئے تھے۔ پیروں میں جرابوں کے بغیر سفید جوگرز تھے جو نئے لگتے تھے۔

اس کے اس بے ترتیب سے حلیے میں صرف اس کے جوگرز قابلِ ستائش تھے۔

''میں صفورا کا کزن ہوں۔'' مسکرا کے بولا۔ وہ مسکراتا تھا تو اس کے بائیں گال میں ڈمپل پڑتا تھا۔ اس کے چہرے میں سب سے زیادہ پرکشش کیا تھا؟ اس کے مسکرانے کا انداز؟ یا اس کی بھوری

''تشریف رکھیے۔''

وہ بیٹھ گیا اور ایک فائل اس کے سامنے رکھی۔ پھر گردن ہلائے بنا نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ آفس چھوٹا سا تھا۔ تین دیواریں سفید تھیں۔ چوتھی دیوار پہ جنگل کے اونچے درخت پینٹ کیے گئے تھے۔ جگہ جگہ منی پلانٹس اور ان ڈور پودوں کے گملے رکھے تھے۔ ان کی خوشبو کافی کی مہک میں مکس ہوگئی تھی۔

سامنے نیلے لباس میں بیٹھی لڑکی سر جھکائے اس کی فائل کے صفحے پلٹ رہی تھی۔ چہرے کے دونوں اطراف سے نکلتی لٹیں بھی فائل پہ جھکی تھیں۔ کانوں میں ڈائمنڈ ٹاپس دمک رہے تھے۔

کشمالہ نے فائل بند کردی۔ پھر چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

وہ اپنی مڑی ہوئی پلکوں والی آنکھوں سے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ تھا اس نوجوان کے بارے میں جو اس جاب انٹرویو سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ کچھ غیر فطری سا۔ وہ سمجھ نہیں پائی۔

''آپ نے صرف دو ماہ ایک پرائیوٹ سیکیورٹی فرم میں کام کیا ہے۔ وہ کام کیوں چھوڑا؟''

''میں ایک سیاستدان کے سیکیورٹی اسکواڈ میں شامل تھا۔ بطور پرسنل باڈی گارڈ۔ ٹائمنگ مشکل تھی۔ میں ساتھ ساتھ اپنے بزنس پلان پہ بھی کام کر رہا تھا۔ دو چیزیں مینیج کرنا مشکل تھا۔''

''کس چیز کا بزنس کر رہے تھے آپ؟'' وہ سیٹ پہ ٹیک لگائے سپاٹ انداز میں پوچھ رہی تھی۔ جوڑے سے نکلی دو لٹیں اس کے چہرے کے دونوں اطراف کو چھو رہی تھیں۔

''میں پروفیشنل فوٹوگرافر ہوں۔ ہم دوستوں نے ایک ویڈنگ فوٹوگرافی کمپنی بنائی تھی جس میں ہم بہت سی سروسز مہیا کرتے تھے۔ لیکن وہ فلاپ ہوگئی۔'' ہلکے سے کندھے اچکائے۔ ''میں نے باہر سے بہت قیمتی ایکوپمنٹ منگوالیا تھا جس کی وجہ سے میں شدید قرضوں میں گھرا ہوا ہوں اور وہی قرضے اتارنے کے لیے جاب کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے اس کے سوالات کا جواب دے رہا تھا۔

''کتنا قرضہ ہے آپ پہ؟''

''اتنا کہ اس جاب سے چند ماہ میں اتار لوں گا۔'' قدرے توقف سے بولا۔ ''آپ کو سیکیورٹی گارڈ چاہیے یا باڈی گارڈ؟''

''دونوں۔'' وہ سنجیدہ تھی۔ ''مگر آپ خود کو میرا ڈرائیور کہیں گے۔ صبح مجھے ریستوران ڈراپ کریں گے۔ شام کو یہاں سے پک کریں گے۔ اور رات میرے گھر ڈیوٹی دیں گے۔ جب تک میں ریستوران میں ہوتی ہوں مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ آپ گھر جا کے آرام یا کام وغیرہ کر سکتے ہیں۔''

''مجھے خود کو ڈرائیور کہنا ہے؟'' وہ جیسے سمجھا نہیں تھا۔

کشمالہ نے غیر آرام دہ انداز میں پہلو بدلا۔ ''میں اپنے رشتے داروں کے ساتھ رہتی ہوں۔ باڈی گارڈ کے لفظ سے وہ اَن کمفرٹیبل ہو جائیں گے۔''

''کیا ان کو نہیں معلوم کہ آپ کو سیکیورٹی تھریٹ ہے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کے بولا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''ویسے نیچر آف تھریٹ کیا ہے؟''

کشمالہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ گردن موڑ کے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ آسمان اندھیر ہوتا جا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے بادل گرج رہے تھے۔

کیف نے کھنکھار کے وضاحت کرنی چاہی۔ ''نیچر آف تھریٹ یعنی.....''

''مجھے معلوم ہے، نیچر آف تھریٹ کیا ہوتا ہے۔ مگر میں ابھی اس بارے میں بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔''

''حفاظت کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مجھے خطرے کی نوعیت کا علم ہو۔''

pklibrary.com

کے کیف کو دیکھا۔
کیف نے گہری سانس لے کر ہلکے سے کندھے اُچکائے۔ ”میں تب بھی آپ کی حفاظت کروں گا۔ میں نے صفورا سے وعدہ کیا ہے۔ میں اپنی جاب میں بہت اچھا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔ وہ واقعی اس کے گزشتہ گارڈز سے مختلف تھا۔ لیکن اچھا تھا۔ اس کے بات کرنے کے انداز میں ایک احساس تحفظ تھا۔ اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔
”مجھے لگتا ہے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔“ وہ بولی تو اس کی آواز دھیمی تھی۔ اس نے بھروسا کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ آخر وہ صفورا کا کزن تھا۔
”صرف لگتا ہے یا کسی کو دیکھا بھی ہے؟“ وہ چونکا۔
”دیکھا نہیں ہے۔ لیکن وہ ثبوت چھوڑ جاتا ہے۔ وہ میرے گھر میں داخل ہوتا ہے اور چیزیں چھیڑ کے چلا جاتا ہے۔“
”سی سی ٹی وی میں نظر نہیں آیا؟“
کشمالہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ممانی ان کے خلاف ہیں۔ صرف گیٹ پہ سی سی ٹی وی لگا ہوا ہے۔ باقی گھر میں وہ لگوانے نہیں دیتیں۔ ان کی پرائیویسی ڈسٹرب ہوتی ہے۔“
”آپ نے خفیہ کیمرے لگوانے کا نہیں سوچا؟“
”مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ میں کسی کے ساتھ رہوں اور اس کے پیٹھ پیچھے چھپ کے کچھ ایسا کروں جو اس کو نہیں پسند۔ اور میں نہیں چاہتی کہ انہیں معلوم ہو کہ مجھے کوئی مسئلہ ہے۔ خاندان میں باتیں ہوں گی۔“
”آپ کی کسی سے دشمنی ہے؟“ وہ سوچتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
وہ اداسی سے مسکرادی۔ ”میں ایک انتہائی بے ضرر انسان ہوں‘ کیف۔ میں صرف کام کرتی ہوں۔
وہ خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔ ذہن کے پردے پہ وہ فوٹو البم آ گیا۔ اور چھٹے صفحے پہ رکھی تصویر۔
”آپ کو خود کیا لگتا ہے؟ کوئی آپ کے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے؟“
کشمالہ نے کندھے اچکائے۔ ”شاید مجھے مارنے کے لیے۔“
”لیکن ابھی تک مارا نہیں ہے؟“
وہ اس کی بات پہ چونکی۔ ”ہوں؟“
کیف اپنی جگہ سے اٹھا اور ہاتھ بڑھا کے کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ پھر باہر کی طرف اشارہ کیا۔
”آپ روز اس کھڑکی کے سامنے بیٹھ کے کام کرتی ہیں۔ سامنے ایک کمرشل مارکیٹ ہے۔ اس کی کسی بھی عمارت کی کھڑکی سے آپ کو شوٹ کرنا بہت آسان ہے۔ اگر میں ہوتا تو اس سرمئی عمارت کا انتخاب کرتا۔“ اشارہ کر کے ایک عمارت دکھائی۔
”آپ وقت کی پابند ہیں۔“ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑے کھڑے بات جاری رکھی۔ ”روز فکسڈ ٹائم پہ ریسٹوران پہنچتی ہیں۔ یہ مجھے اسٹاف نے بتایا ہے۔ کوئی آپ کا تعاقب دو دن تک کرلے تو اسے معلوم ہوگا کہ آپ کب اور کہاں ہوتی ہیں۔ راستے میں کہیں بھی آپ کو شوٹ کیا جاسکتا ہے۔“
پھر اس نے میز پہ رکھی کافی کا مگ اٹھایا۔ کپ میں دو گھونٹ بچے ہوئے تھے۔ کپ نیچے سے پکڑ کے اونچا کیا۔ ”یہاں کسی بھی ویٹر یا اسٹاف کو چند پیسے دے کر آپ کی کافی میں کچھ ملایا جاسکتا ہے۔ ویسے میں ہوتا تو کافی میں زہر نہ ملاتا کیونکہ آپ آخری گھونٹ بچانے کی عادی ہیں۔ میں یہاں زہر لگاتا۔“ اس نے انگلی سے کپ کے دہانے کی طرف اشارہ کیا جہاں اس کی لپ اسٹک کا نشان لگا تھا۔ پھر کپ رکھا اور کرسی پہ واپس بیٹھا۔
”آپ کو مارنا بہت آسان ہے۔ میرا نہیں

وہ بس اس کو دیکھ رہی تھی۔ بنا پلک جھپکے۔ اس کے تاثرات دیکھ کے کیف کھنکھارا۔ ''میں صرف بتا رہا تھا۔ تھیوری میں۔''

کشمالہ نے جھرجھری لے کر سر جھٹکا۔ (اُف۔) پھر لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کے خیال میں کوئی میری گھات میں کیوں ہے؟''

''ظاہر ہے آپ کو ڈرانے کے لیے۔ اور ڈرانے والے کی غذا آپ کا ڈر ہوتا ہے۔ جس دن آپ اس کی غذا روک دیں گی' وہ کمزور پڑ جائے گا۔'' پھر مسکرایا۔ ''کیا میں ہائر کرلیا گیا ہوں؟''

''ہائر ہونے کا فیصلہ آپ خود کریں گے۔ میرے پاس گارڈز زیادہ دیر نہیں رہتے۔ اس لیے میں ہر آنے والے کو رکھ لیتی ہوں۔ کچھ دن بعد یا آپ جاب چھوڑ جائیں گے یا موجود رہیں گے۔''

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے ٹھہر ٹھہر کے کہہ رہی تھی۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھیں۔ میں کسی کو کام میں کوتاہی کی وجہ سے کبھی فائر نہیں کرتی۔ میں لوگوں کو چانس دیتی ہوں۔ کام سکھاتی ہوں۔ لیکن اگر وہ مجھ سے جھوٹ بولیں' میری پیٹھ پیچھے مجھ سے چھپا کے کچھ کریں' یا کسی بھی طرح مجھے دھوکا دیں' تو میں ان کو اپنے کام اور زندگی سے بالکل الگ کر دیتی ہوں۔ اس کے بعد وہ جتنی معافی مانگ لیں' میں انہیں واپس نہیں لیتی۔''

اس نے دیکھا، کیف کے چہرے پہ ایک سایہ سا گزرا ہے۔ لیکن بظاہر وہ مسکراتا رہا۔

''یعنی آپ کو ناراض کرنا بہت مشکل ہے لیکن ایک دفعہ ناراض ہو جائیں تو منانا مشکل ہے۔''

''مشکل نہیں' ناممکن ہے۔'' وہ ہلکا سا مسکرا دی۔ کیف نے بظاہر مسکراتے ہوئے تھوک نگلا۔

یہ وہ وقت تھا جب وہ اسے بتا سکتا تھا کہ وہ وہاں کیوں آیا ہے۔ وہ اسے بتا سکتا تھا کہ کسی کے پاس اس کی تصویر ہے۔ کوئی اسے نقصان پہنچانا چاہتا رہا ہے۔

لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اس کا یقین نہیں کرے گی۔ کوئی بھی اس کا یقین نہیں کرے گا۔

''آپ کو مجھ سے کبھی شکایت نہیں ہوگی۔'' پھر جیسے یاد آیا۔ ''آپ کے گارڈز بار بار جاب کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟''

''آپ جان جائیں گے۔'' وہ لیپ ٹاپ اٹھاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے ظہیر سے ملنا تھا۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ آفس سے باہر نکلے۔ وہ آگے بڑھ گئی اور وہ وہیں رک کے موبائل کے بٹن دبانے لگا۔ ''وائٹ ہیئر'' نام کی ایک چیٹ نکالی۔

''اس نے مجھے ہائر کرلیا ہے۔ یہ تو بہت آسان تھا۔'' اس کی انگلیاں ٹائپ کر رہی تھیں۔

ظہیر کا آفس ٹیرس کے دوسری جانب تھا۔ درمیان میں چند کرسیاں میزیں رکھی تھیں۔ وہ وہیں بیٹھ گئی اور صفورا کو کال ملائی۔

''میں نے تمہارے کزن کو ہائر کرلیا ہے۔'' گردن اٹھا کے آسمان کو دیکھا۔ سیاہ بادل دور دور سے اس کے سر پہ اکٹھے ہو رہے تھے۔ لگتا تھا آج برس برس کے اوشن کو بہا لے جائیں گے۔

''گڈ۔'' صفورا اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ''اچھا سنو۔ وہ کوئی غلطی کرے تو اس کو ایسے ہی ٹریٹ کرنا جیسے باقی ملازمین کو کرتی ہو۔ میرا کزن ہونے کا ناجائز فائدہ نہ اٹھانے دینا۔ اس کو بزنس کا شوق ہے لیکن وہ کبھی ترقی نہیں کرے گا۔ اس کے لیے بھی بہتر ہے کہ وہ تمہارے پاس نوکری کرتا رہے۔ اچھا مالا! سنو.....'' صفورا رکی۔ توقف کیا۔

''ہوں۔'' مالا ابھی تک گردن اٹھائے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ آدھا ریستوران اوپن ایئر تھا، بارش ان کے لیے اچھی ثابت نہیں ہوتی تھی۔

''میں نے سنا ہے ظہیر نے اوشن کو بیچ دیا ہے؟''

''کیا؟'' بادل اتنے زور سے گرجے کہ زمین دہل گئی۔

''ایوب بتا رہا تھا کہ ظہیر نے کسی لبنانی فوڈ چین کو اوشن بیچ دیا ہے۔ اس نے تمہیں اعتماد میں نہیں لیا؟''

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ ایسا... ایسا نہیں ہوسکتا۔'' وہ ایک دم کھڑی ہوئی۔ اسی پل بارش برسنے لگی۔ جیسے اوپر سے کسی نے پانی کا تھال الٹ دیا ہو۔

وہ تیز تیز چلتی ظہیر کے آفس میں داخل ہوئی۔ اس کی ہیلو گیلے نشانوں کی قطار اپنے پیچھے چھوڑتی جا رہی تھیں۔

''ظہیر۔''

ظہیر نے سر اٹھا کے دیکھا۔ مالا کے بال نم تھے اور چہرے پہ پانی کے قطرے تھے۔ آواز اونچی تھی۔

''یہ میں کیا سن رہی ہوں؟'' ہتھیلیاں میز کے کناروں پہ رکھے وہ بنا پلک جھپکائے اسے دیکھ رہی تھی۔ ''تم نے اوشن بیچ دیا ہے؟'' غصہ نہیں تھا۔ بے یقینی تھی۔ حیرت تھی۔

آفس کی کھڑکی کے شیشے پہ تڑتڑ بوندیں برس رہی تھیں۔ گویا آسمان سے برستے پتھر ہوں۔ اور ہر پتھر پہ کسی کا نام لکھا ہو۔

ظہیر چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر گردن موڑ کے کھڑکی کو دیکھنے لگا۔

''ہاں۔ میں نے ایک لبنانی گروپ کے ساتھ ڈیل کی ہے۔''

وہ چند لمحے ہل نہیں سکی۔ نہ پلک جھپکی۔ نہ سانس لیا۔ اس کے ذہن نے بات کو جذب ہی نہیں کیا تھا۔

''تم نے کیا کیا ہے؟'' میز سے ہاتھ ہٹائے۔ سیدھی کھڑی ہوئی۔

''میرے کچھ ذاتی مسئلے چل رہے ہیں۔ مجھے پیسے چاہیے تھے۔ سوری، میں تمہیں پہلے نہیں بتا سکا۔''

پیچھے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی شناسا مردانہ آواز۔ ''باس! آپ کا فون باہر گرا ہوا تھا۔ مسلسل بجے جا رہا ہے۔'' کہنے والا خود ہی خاموش ہوگیا۔ آگے آیا اور میز پہ کشمالہ کا فون رکھ کے واپس ہوگیا۔

''تم مجھے بتائے بغیر ایسا کیسے کر سکتے ہو؟'' وہ اسی طرح ظہیر کو بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

''کیونکہ انہوں نے اپنا اسٹاف لانا ہے۔ مالا میں ہر ایک کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ سب اپنا کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں۔'' وہ قدرے جھنجھلایا۔ ''میں نے کہا نا مجھے پیسے چاہیے تھے۔ بہت ضروری۔''

''ظہیر! تم..... تم مجھے بتائے بغیر ایسا کیسے کر سکتے ہو؟'' اس کو لگا اسے سانس نہیں آرہا۔

''میں کر سکتا ہوں۔ میں ریستوران کا مالک ہوں۔ ہمارے درمیان بھی کوئی ایسی بات نہیں طے ہوئی تھی جس سے میرا یہ حق سلب ہوجائے۔''

''مالک؟ تم مالک ہو؟ ظہیر! میں نے یہ ریستوران بنایا ہے تمہارے ساتھ۔ اپنے ان ہی ہاتھوں سے۔ اور تم نے ایک منٹ میں اس کو بیچ بھی دیا؟'' اس نے خود کو بولتے سنا۔ اور تب کسی اڑتے تیر کی طرح ایک فقرہ ذہن میں پیوست ہوگیا۔

''وہ اپنا اسٹاف لائیں گے؟ تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں اور ہمارا اسٹاف... ہم سب جاب لیس ہو گئے ہیں؟'' وہ دو قدم پیچھے ہوئی اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ظہیر کے چہرے پہ ملال ابھرا۔

''مالا! تم اتنی قابل، اتنی ٹیلنٹڈ ہو۔ تم کچھ بھی کر لوگی یار! میرا مسئلہ سمجھو۔''

وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ظہیر کے آفس سے نکلی تو ذہن شل تھا۔ اسے اپنے آفس تک جانے کے لیے ٹیرس عبور کرنا تھا۔ وہ قدم قدم آگے بڑھنے لگی۔ زرد جوتے مزید گیلے ہوتے گئے۔

اس نے ٹیرس کی دیوار پہ ہاتھ پھیرا۔ یہ وال

pklibrary.com

میٹر رکھی ہے' یہ اس نے طے کیا تھا۔ فالس سیلنگ کا ڈیزائن۔ لائٹنگ کس طرز کی کرنی ہے۔ ریستوران کا تھیم اور مینیو کیا ہوگا؟ یہ سب اس نے طے کیا تھا۔

ہر شے پہ ظہیر کا پیسہ اور کشمالہ مبین کے پانچ سال لگے تھے۔

ایک دم قطروں کا راستہ رک گیا۔ کشمالہ نے چونک کے گردن موڑی۔ پانی کی بوچھاڑ کے پار وہ بھوری آنکھوں والا نوجوان بازو لمبا کر کے اس کے اوپر چھتری تانے ہوئے تھا۔

''آپ بھیگ رہی ہیں۔'' وہ فکرمندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کشمالہ چند ثانیے اس کا چہرہ تکتی رہی۔ پھر مڑ گئی۔ ابھی ذہن کے اندر کوئی منظر جذب نہیں ہو رہا تھا۔ اسے جلد سے جلد کھلی فضا میں واپس جانا تھا۔

اوشن سے دور۔ ظہیر سے دور۔ اس سب سے دور۔

☆☆☆

بارش شام تک وقفے وقفے سے برستی رہی۔ لگتا تھا کوئی بادل پھٹ گیا ہے۔ یا شاید کسی کا دل تھا۔

وہ بتیاں بجھائے اندھیرے لاؤنج میں صوفے پہ لیٹی رہی۔ اس کا جوڑا ڈھیلا ہو چکا تھا اور رونے سے سارا مسکارا بہہ گیا تھا۔

ظہیر نے کب بیچا ریستوران؟ اسے علم کیوں نہیں ہوا؟ یا شاید اسے علم ہو سکتا تھا۔ وارننگ سائن عرصے سے آ رہے تھے۔

چند ہفتے پہلے اوشن میں ظہیر کے کوئی لبنانی دوست آئے تھے۔ کم از کم ظہیر نے یہی کہا تھا کہ وہ اس کے دوست ہیں۔ وہ ان کے ساتھ ریستوران میں نہیں بیٹھا۔ ساری جگہ گھما پھرا کے انہیں اپنے آفس میں لے کر بند ہو گیا۔ اور ہاں... اس نے سن رکھا تھا کہ ظہیر کی بیوی کا اصرار ہے، وہ دونوں اس کے ماں باپ کے پاس آسٹریلیا شفٹ ہو جائیں۔ کوئی خاندانی مسئلے تھے۔ ظہیر نے اس سے پہلے بھی اسے تب ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ وہ کبھی اس پہ اعتبار نہیں کر سکتی۔ لیکن پھر بھی اس نے کیا۔

''مالا باجی!'' جانے مغرب ہوئے کتنا وقت بیتا تھا جب ٹیرس کا دروازہ بجنے لگا۔ ممانی کی ملازمہ آئی تھی۔ وہ بدقت اٹھی۔ آنکھیں صاف کیں۔ بال کانوں کے پیچھے اڑسے اور دروازہ کھولا۔

نسرین کے ہاتھ میں کانچ کی پلیٹ تھی جس پہ چاکلیٹ براؤنیز رکھی تھیں۔ ''یہ آپ کی ممانی نے بھجوائی ہیں۔ نیچے نگینہ آنٹی آئی ہوئی ہیں۔ اور ہاں... آپ کا فون آف ہے۔ آپ کی امی جی کی کال آئی تھی۔ پریشان تھیں۔ ان کو کال کر لیں۔'' جلدی جلدی بتا کے وہ مڑی۔ پھر واپس پلٹی۔ ''اور ٹیرس کی لائٹ تو جلا دیں۔''

وہ چونکی۔ اس نے واقعی آج کوئی بتی نہیں جلائی تھی۔ باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وقت کا احساس ہی ختم ہو گیا تھا۔

براؤنیز کی پلیٹ اس نے سینٹر ٹیبل پہ رکھی اور خود وضو کرنے چلی گئی۔ قضا نماز ادا کی اور وہیں جائے نماز پہ زمین پہ بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ پھر سے گرنے لگے۔

''میرے ساتھ یہ کیوں ہوا ہے اللہ تعالیٰ؟ میں لوگوں کے دل نہیں دکھاتی۔ زکوٰۃ ادا کرتی ہوں' صدقہ دیتی ہوں۔ میں تو چیونٹی تک کو نہیں مارتی۔ پھر بھی میری جاب چلی گئی۔ اتنا بڑا سیٹ بیک۔''

دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے لیکن کیا دعا مانگے۔

''میں اب کہاں سے شروع کروں دوبارہ؟ اسکوائر ون سے؟ پانچ سال میں نے اس شہر میں اوشن کو سیٹ کیا' اپنی ایک سوشل لائف بنائی۔ اور ایک ہی دن میں سب ملیامیٹ ہو گیا۔''

نظریں اندھیرے لاؤنج میں نصب بک شیلف تک اٹھیں۔ ''اوپر سے پتا نہیں کون میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں کیا کروں اللہ تعالیٰ؟''

وہ واپس صوفے پہ آ بیٹھی۔ روئی روئی آنکھیں

pklibrary.com

میز پہ رکھی براؤنیز پہ ٹکی ہیں۔

صبح تک وہ ایک بہت اچھی جاب کی مالک تھی۔ وہ ایک نیا بزنس پلان کرنے جارہی تھی۔ اس کے پاس گھر جانے کا وقت بھی نہیں ہوتا تھا۔ زندگی مصروف اور پرامید تھی۔

شام ہونے سے پہلے وہ جاب لیس تھی۔

اس نے کھڑکی سے باہر پھیلے اندھیرے کو دیکھا۔ اس وقت وہ ہمیشہ ریستوران میں ہوتی تھی۔ یہ گہما گہمی کا وقت ہوتا تھا۔ لیکن آج وہ واپس زیرو پہ پہنچ کے گھر بیٹھی تھی۔

وہ میٹھے کی شوقین نہیں تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ بیکری بنانا چاہتی تھی لیکن وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جن کو چاکلیٹ اور آئس کریم خوش کر دیتی ہیں۔ ذرا سا میٹھا کھانے پہ بھی اسے پانی کا گھونٹ بھر کے اس کے ذائقے کو ختم کرنا پڑتا تھا۔ لیکن جہاں آج اتنا سب کچھ غلط ہو چکا تھا' وہاں براؤنیز ہی سہی۔ اس نے ایک ٹکڑا اٹھالیا اور دانت سے کاٹا۔ میٹھی سی کڑواہٹ منہ میں گھل گئی۔

پھر اس نے موبائل آن کیا۔ ماں کے میسجز آئے ہوئے تھے۔ اس نے کال بیک کی۔

''کیسی ہے میری بیٹی؟'' ماں اس کی آواز سے ہی کھل اٹھیں۔ ''فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھیں؟''

''بس کام میں بزی تھی۔''

''تمہاری ممانی تو کہہ رہی تھیں، شاید سوئی پڑی ہو۔ آج بتیاں بھی نہیں جلائیں۔''

''اُف۔ لاہور تک بتا دیا انہوں نے کہ مالا نے بتی نہیں جلائی۔ میں کام کر رہی تھی' ماں۔'' وہ جھنجلا گئی۔ ماں خاموش ہو گئیں۔

''تم نے آج ظہیر کو اپنا کوئی نیا بزنس پلان دینا تھا۔ اس کا کیا بنا؟''

اس کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا پڑ گیا۔ آواز آہستہ ہو گئی۔ ''آپ نے دعا مانگی تھی؟''

''ہاں بیٹے۔ میں نے دعا مانگی تھی کہ وہ ہو جو تمہارے حق میں بہتر ہو۔''

ہے۔'' آواز کو نارمل بنانے کی کوشش کی۔ ''بلکہ وہ شاید باہر شفٹ ہونے کا سوچ رہا ہے۔ کہہ رہا تھا شاید ریستوران بھی بیچ دے۔''

وہ اتنی جلدی اتنی بڑی بات نہیں بتا سکتی تھی۔ اس میں ہمت نہیں تھی۔

ایک لمحے کے لیے ماں خاموش ہو گئیں۔

''مالا......'' ان کی آواز ویسی ہی پرسکون تھی۔ ''اس نے تمہیں بتائے بغیر ریستوران بیچ دیا ہے۔ ہے نا؟''

مالا کی آنکھوں سے زاروقطار آنسو گرنے لگے۔ اس نے بدقت لبوں پہ ہاتھ رکھ کے سسکی اندر روکی۔

کیسے پتا چل جاتا تھا ماں کو ہر بات کا؟

''دفع کرو اس کو۔ تم گھر آجاؤ۔ عزہ کی شادی بھی ہے نا۔ مل کے اٹینڈ کریں گے۔'' انہوں نے بڑے تحمل سے بات بدل دی تھی۔ ماں کو اس کے کام کی کامیابی یا ناکامی سے بھی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان کو بس دو چیزوں کی فکر ہوتی تھیں۔ ان کے بچوں نے نماز پڑھی؟ یا ان کے بچوں نے کھانا کھایا؟

ماں کی کال بند ہوئی تو کچھ دیر بعد ماہی کی ویڈیو کال آنے لگی۔ اسے معلوم تھا خبر کینیڈا تک پہنچ گئی ہوگی۔

''ماں بتا رہی تھیں، ظہیر نے تم سے پوچھے بغیر ریستوران بیچ دیا۔'' ایپرن پہنے کچن میں کھڑی ماہی شدید غصے میں لگ رہی تھی۔ چھوٹے بال پونی میں قید تھے اور ہاتھ میں کفگیر تھا۔

''اس کے اپنے مسئلے تھے' ماہی۔'' اس نے ماہی سے آنسو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

''مسئلوں کی ایسی تیسی۔ اور تم...... ایسے ہی ناجاب چھوڑ دینا۔ ریستوران کی دو چار کھڑکیاں توڑ کے آنا۔ اور میں تو اس ظہیر کو پاکستان میں ایسا بدنام کروں گی' تم دیکھنا۔ میرے ساتھ اس کے کچھ رشتے دار ایڈ ہیں فیس بک پہ۔ یہ اپنے خاندان میں کسی کو

ہوں۔" ماہی کفگیر گھما گھما کے کہہ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہیں سے ظہیر کا سر توڑ دے۔

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گی ماہی! میں پہلے ہی بہت تھکی ہوئی ہوں۔" وہ روہانسی ہو کے بولی۔ ماہی کچھ کہنے لگی، پھر بھنویں اکٹھی ہو گئیں۔

"اس؟ تم کیک کھا رہی ہو؟ تمہیں کب سے میٹھا پسند ہو گیا؟"

"کیک نہیں ہے۔ براؤنیز ہیں۔ وہ بھی تمہاری فیورٹ بیکری کی۔ ممانی نے مہمانوں کے لیے منگوائی ہیں۔ کوئی نگینہ آنٹی آئی ہیں۔" اس نے آنسو رگڑ کے صاف کیے اور براؤنی کا ایک اور نوالہ لیا۔ ذہن دوسری طرف لگانا چاہا۔ "ہماری کون سی رشتے دار ہیں نگینہ آنٹی؟"

"وہ دبئی والی۔ عزہ کی شادی کے لیے آئی ہوں گی۔ ممانی کی کزن ہیں۔ اور ہمارے بابا کی بھی دور کی کزن ہیں۔ وہی جن کا بیٹا رائٹر ہے۔ زیاد سلطان۔ اس کی کتاب کا نیو یارک ٹائمز نے ریویو بھی کیا تھا۔ میں اسے انسٹا پہ فالو کرتی ہوں۔"

"اچھا، ہوگا۔ مجھے یاد نہیں۔" اس کی یادداشت میں کوئی زیاد سلطان نہیں تھا۔

"اوہو یاد کرو۔ سہیل کی شادی پہ ہم ان سے ملے تھے۔ جب اس کمبخت پارلر والی نے میرے بال خراب کر دیے تھے۔" ماہی کا پسندیدہ لفظ کمبخت تھا۔ کوئی اچھا لگتا تو دیکھو کمبخت کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ کوئی برا لگتا تو وہ ہے ہی کمبخت۔

"ویسے مجھے پتا ہے نگینہ آنٹی اپنے بیٹے کے رشتے کے لیے آئی ہیں پاکستان۔ عزہ کی شادی کا تو صرف بہانا ہے۔"

"تم کیسے کرتی ہو یہ ماہی؟ کینیڈا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بیٹھ کے تمہیں کیسے سارے پاکستان کی خبریں مل جاتی ہیں۔"

"چلی ویک ایک گاؤں نہیں ہے۔ تمہارے اسلام آباد سے بڑا ہے۔ جاؤ، میں تم سے بات نہیں تھی۔ اسے کچھ وقت اکیلے درکار تھا۔

براؤنی ہاتھ میں لیے وہ ٹیرس پہ آ گئی۔ اس نے ابھی تک وہاں کی بتی نہیں جلائی تھی۔ بالوں کا ڈھیلا جوڑا کھل گیا تھا اور اب وہ اس کے کندھوں پہ بکھرے تھے۔

ٹیرس گیلا تھا۔ بلکہ ٹیرس کیا، ساری کالونی گیلی تھی۔ جگہ جگہ جلتے اسٹریٹ پولز رات کا اندھیرا دور کرنے میں ناکام تھے۔

وہ ریلنگ کے ساتھ کھڑی تازہ ہوا کو سانس کے ذریعے اندر اتارنے لگی۔ ذہن پھر سے ظہیر کی طرف چلا گیا۔ قانونی طور پہ ظہیر نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ اور اخلاقی طور پہ اس نے کچھ درست نہیں کیا تھا۔

نیچے سے آتی آوازوں نے اس کا دھیان بٹا دیا۔ اس نے گردن جھکا کے جھانکا۔ نگینہ آنٹی لوگ پورچ میں کھڑے تھے۔ غالباً رخصت ہو رہے تھے۔ ممانی اور ماموں ان کو سی آف کرنے گیٹ تک آئے تھے۔

نگینہ آنٹی سر پہ سفید دوپٹہ لیے ہوئے تھیں۔ کندھوں پہ شال تھی۔ باوقار سی لگتی تھیں۔ ماما نے بہت عرصہ پہلے ان کو دیکھا تھا۔ ان کے بارے میں ہمیشہ یہی سنا تھا کہ بہت نیک خاتون ہیں جن کا ایک فرماں بردار سا بیٹا ہے جو اسے یاد نہیں تھا۔

وہی بیٹا اس وقت ماں کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ اس کی کشمالہ کی طرف پشت تھی۔ اس نے گردن مزید اونچی کر کے دیکھنا چاہا۔

وہ دروازہ بند کر کے کار کی دوسری جانب گیا۔ سینے پہ ہاتھ رکھ کے ماموں کو ایک دفعہ پھر خدا حافظ کہا۔ اور ڈرائیونگ ڈور کھولا۔ اب اس کا چہرہ مالا کے سامنے آیا۔

وہ کافی دراز قد تھا۔ بال سلیقے سے سیٹ تھے۔ جینز پہ سفید ڈریس شرٹ پہن رکھی تھی جس کے آستین کف سے فولڈ کیے ہوئے تھے۔ سانولی رنگت

اور پر ... ایسے کہ نگاہ نہیں ٹھہر رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے سارے مسئلے بھول کے اس کو دیکھے گئی۔ ٹال' ڈارک اینڈ ہینڈسم۔ اس کے ذہن میں یہی الفاظ آئے تھے۔

تو یہ تھا زیاد سلطان۔ انٹرسٹنگ۔

دروازہ کھولتے ہوئے زیاد کی نظر اوپر اٹھی۔ جیسے اسے احساس ہو گیا تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ جو ایک ہاتھ ریلنگ پہ جمائے' دوسرے سے براؤنی کھا رہی تھی' گڑبڑا کے جلدی سے پیچھے ہوئی۔ دل زور سے دھڑکا۔ اُف۔ کتنا برا لگا ہوگا۔ مگر نہیں۔ ٹیرس اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ زیاد کو نظر نہیں آیا ہوگا۔ ہاں ٹھیک ہے۔ اس نے خود کو تسلی دی۔

گاڑی کے ٹائر باہر نکلنے کی آواز آئی تو وہ واپس سیدھی ہوئی۔ پھر ٹیرس کی بتی جلائی اور اندر آ گئی۔

''آپ آج جلدی میں چلی گئیں اس لیے پوچھ نہیں سکا۔'' اندر آ کے موبائل اٹھایا تو کیف کا میسج سامنے تھا۔ ''صبح کتنے بجے کام پہ آؤں؟''

ذرا دیر کے لیے وہ اپنا غم بھولی تھی۔ ایک دم سے سب تازہ ہو گیا۔ اس نے نو بجے لکھ کے بھیج دیا۔ اسے صبح ایک دفعہ پھر اوشن جانا تھا۔

وہ صوفے پہ آلتی پالتی کر کے بیٹھی اور لیپ ٹاپ گود میں رکھ لیا۔ اسے وہ کانٹریکٹ پڑھنا تھا جو ظہیر نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ اسے یاد تھا کہ وہ بنا تین ماہ کے نوٹس کے اسے جاب سے نہیں نکال سکتا تھا۔ اور اگر وہ نکالتا تھا' تو اسے کتنا تاوان بھرنا تھا؟

وہ ظہیر سے لڑائی نہیں کرے گی۔ نہ وہ اس پہ چیخے چلائے گی یا اس کو الزام دے گی۔ یہ اس کی فطرت میں نہیں تھا۔ لیکن وہ اس سے اپنا حق ضرور لے گی۔

☆☆☆

اگلی صبح گزشتہ روز جیسی ہی روشن اور خوب صورت اتری تھی لیکن کشمالہ مبین کے لیے سارا شہر بے رونق اور اداس ہو گیا تھا۔ وہ کاغذوں کا پلندہ لیے صبح صبح ظہیر کے آفس میں گئی اور دروازہ بند کر دیا۔

پیچھے کھڑے ہو کے سننے لگے۔ سارا ماحول سہا ہوا اور اداس تھا۔

کیف اس کے انتظار میں بار کاؤنٹر کے ساتھ اونچے اسٹول پہ بیٹھا تھا۔ کاؤنٹر ٹاپ پہ رکھے کافی مگ میں چمچ ہلاتے ہوئے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا جب سیڑھیوں پہ آہٹ ہوئی۔ اس نے نظریں اٹھا کے دیکھا۔ وہ زینے اتر رہی تھی۔

اس نے آج سیاہ لمبی قمیص کے ساتھ سفید دوپٹہ کندھے پہ ڈالا ہوا تھا۔ بالوں کا جوڑا بندھا تھا اور ایک لٹ دائیں گال کو چھو رہی تھی۔ آج اس نے ٹاپس نہیں پہنے تھے۔ پیروں میں سفید ہیلو تھیں اور پیشانی پہ ابھی تک بل تھے۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ ہاتھ میں ایک باکس تھا جس میں اس کی چیزیں تھیں۔ سب سے اوپر نیکلس کا ننھا سا گملہ تھا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ہاتھ سے باکس لے لیا۔

''تھینکس۔'' اس نے ایک سرسری نظر کیف پہ ڈالی۔ اس کے نئے جوگرز آج بھی اجلے سفید تھے۔ البتہ حلیہ وہی تھا۔ بڑھی ہوئی شیو۔ ماتھے پہ آئے نو عمر لڑکوں جیسے بل دار بال۔ ٹی شرٹ پہ کالر والی شرٹ جس کے بٹن سامنے سے کھلے تھے۔ چہرے پہ مسکراہٹ اور ہاتھ پیچھے کو بندھے ہوئے۔

''یس باس۔''

''مجھے مال تک جانا ہے۔ تم ڈرائیو کرو گے۔''

کار ریموٹ اس کی طرف بڑھایا اور خود آگے بڑھ گئی۔

کیف باکس اٹھائے اس سے دو قدم پیچھے تھا۔ یکدم کشمالہ کو احساس ہوا کہ وہ رک گیا ہے۔ اس نے پلٹ کے دیکھا۔

وہ ریستوران کے ہال کی مرکزی دیوار کے سامنے رکا ہوا تھا۔ گردن اونچی اٹھائے وہ دیوار کو دیکھ رہا تھا۔

وہ دیوار بذاتِ خود ایک پینٹنگ تھی۔ وہاں

pklibrary.com

سمندر بس کی سطح پہ دھوپ چمک رہی تھی۔ ایک جھولا جو ریت پہ ستونوں سے نصب کیا گیا تھا۔ جھولے پہ ایک کتاب درمیان سے کھول کے الٹی رکھی تھی۔ منظر اتنا خوبصورتی سے پینٹ کیا گیا تھا کہ حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ دیوار کے آگے فرش پہ اصلی ریت اور سیپیاں بکھری تھیں۔ وہ صرف پینٹنگ نہیں تھی۔ تھری ڈی پینٹنگ تھی۔

کیف کی نظریں دیوار کے نچلے کونے تک گئیں۔ وہاں "مالا" کے نام سے دستخط تھے۔ ساتھ پانچ برس قبل کی تاریخ درج تھی۔ اس نے گردن موڑ کے ستائشی نظروں سے مالا کو دیکھا جو اس کی منتظر کھڑی تھی۔

"یہ آپ نے پینٹ کیا ہے؟"

"ہوں۔ چلیں؟" وہ بنا کسی تاثر کے بولی اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ گہری سانس لے کر اس کے ساتھ ہولیا۔

"آپ الوژن آرٹسٹ بھی ہیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا۔" وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"پرانی بات ہے۔" وہ جیسے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دے رہی تھی۔ کیف خاموش ہوگیا۔

راستے میں وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ ایک دو بار نگاہ اٹھا کے کیف کی طرف دیکھا تو احساس ہوا کہ اس نے بیٹھتے ہی بیک ویو مرر کو چھت کی طرف کردیا تھا تاکہ ڈرائیور اور سواری ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔ صفورا درست کہہ رہی تھی۔ اس کا کزن ڈیسنٹ ہے۔ ورنہ ہر ڈرائیور بیک ویو مرر سے گھورتا ضرور تھا۔

"سنو۔ تم ڈرائیورز یونیفارم نہیں پہن سکتے؟"

"میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔" وہ موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔ اس کے انداز میں ایک عجیب بے نیازی تھی جو کبھی کبھی کشمالہ کو کھلتی تھی۔ لیکن خیر۔ وہ باہر بھاگتی ٹریفک کو دیکھنے لگی۔ دھوپ کے باعث سبز آنکھوں کی پتلیاں سکوڑ رکھی تھیں۔

آورز کے لیے پوچھ رہا ہوں۔"

"کل ہمیں لاہور جانا ہے ایک ہفتے کے لیے۔ واپس آکے اس بارے میں بات کریں گے۔"

مال کی پارکنگ میں کیف نے کار روکی تو باہر نکلنے سے قبل مالا نے سرسری انداز میں کہا۔

"مجھے گھنٹہ لگ جائے گا۔ چاہو تو گھوم پھر لو۔ چاہو تو بیٹھے رہو۔"

کیف نے محض سر ہلا دیا۔ کچھ کہا نہیں۔

کچھ دیر وہ یونہی مال کی راہداریوں میں چلتی رہی۔ دن کا وقت تھا، اس لیے بہت رش نہیں تھا۔ اسے عزہ کے لیے گفٹ لینا تھا لیکن دل نہیں چاہ رہا تھا۔ پہلے جب بھی وہ خاندان کی شادیوں پہ جاتی، اس کو سلیبریٹی ٹریٹمنٹ ملتی تھی۔ کشمالہ ان سب کی کامیاب انٹرپرونیور کزن تھی۔ اپنے پیروں پہ کھڑی عورت۔ وہ مہنگے گفٹس دیتی تھی۔ لوگوں سے ملتے ہوئے بھی ہاتھ میں موبائل آن ہوتا۔ وہ ساتھ ساتھ اسلام آباد آفس کو مانیٹر کررہی ہوتی تھی۔ اب اس کے پاس کچھ کرنے کو ہی نہیں تھا۔ سوشل میڈیا سے جلد ہی سب کو علم ہوجائے گا کہ اوشن بند ہورہا ہے۔ ہر کوئی اس سے سوال کرے گا۔ اُف۔

وہ اپنی کیفیت میں چلتی جارہی تھی جب ایک احساس ہوا۔ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔

چلتے چلتے اس نے گردن موڑی۔ دائیں بائیں۔ پیچھے۔ وہاں بہت سے لوگ تھے لیکن سب اپنی اپنی سمت میں جارہے تھے۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے جھرجھری لے کر سر جھٹکا۔ شاید اسے وہم ہوا تھا۔

ایک ڈیزائنر برانڈ سے اس نے ایک کامدار جوڑا لیا۔ عزہ کے ٹیسٹ کے مطابق ٹھیک تھا۔ شاپ سے باہر نکلی تو سیدھ میں ایک بک شاپ نظر آئی۔ اس کی گلاس وال کے اس پار کیف کھڑا تھا۔ وہ کاؤنٹر پہ پے منٹ کررہا تھا۔ وہ اس کی طرف چلی آئی۔

کیف نے اسے نہیں دیکھا۔ اس کی کشمالہ کی

pklibrary.com

طرف پشت کی۔ وہ موبائل کان اور کندھے کے درمیان لگائے شاپنگ بیگز کاؤنٹر سے اٹھا رہا تھا۔ دبی آواز میں کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ آواز اتنی ہلکی تھی کہ کچھ سنائی نہ دیا۔ نہ وہ سننے کی خواہش مند تھی۔

"کیف؟" اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے پکارا۔ وہ ایک دم جھٹکے سے مڑا۔ موبائل چھوٹ گیا۔ شاپنگ بیگ بھی نیچے گر گیا۔ وہ ڈر کے ایک قدم پیچھے ہٹی۔

"سوری۔ میں نے تمہیں ڈرا دیا؟"

"نہیں نہیں۔ میں کسی اور خیال میں تھا۔" کیف کی رنگت تبدیل ہوئی جیسے وہ لمحے بھر کے لیے پریشان ہوا ہو۔ مگر فوراً سے سنبھل گیا۔ جلدی سے موبائل اٹھانے جھکا جو کشمالہ کے قدموں کے ساتھ گرا تھا۔ اس نے گردن جھکا کے دیکھا۔ اس پہ کال ملی ہوئی تھی۔ "وائٹ ہیز" لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کیف نے جلدی سے فون اٹھایا اور کال کاٹ کے اسے جیب میں ڈال دیا۔

"میرے ایک انکل ہیں۔ ان سے بات کر رہا تھا۔" اب وہ پنجوں کے بل بیٹھا شاپنگ بیگ سے نکلا سامان اندر واپس ڈال رہا تھا۔

"میں فری ہوں۔ چلیں؟" اس نے نظر انداز کیا۔ البتہ وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک اسکیچ بک اور چند گریفائٹ پنسلیں تھیں جنہیں وہ جلدی جلدی سمیٹ رہا تھا۔ پھر وہ کھڑا ہوا۔ نظر کشمالہ کے ہاتھوں پہ گئی۔ فوراً ہاتھ بڑھایا۔

"یہ مجھے پکڑا دیں۔"

"نو پرابلم۔ میں اٹھا سکتی ہوں۔" وہ آگے جانے لگی لیکن کیف سامنے آیا اور "ادھر لائیں" کہتے ہوئے نرمی سے اس سے شاپنگ بیگ لے لیا۔ وہ بنا کچھ کہے آگے بڑھ گئی لیکن اسے اچھا لگا تھا۔ اس نوجوان میں بہت مینرز تھے۔ بس یونیفارم والی بات پہ "میں ایسے ہی ٹھیک ہوں" والا ایٹی ٹیوڈ نہ ہوتا تو وہ بہترین ملازم تھا۔ کشمالہ کے تجربے کے مطابق ایٹی ٹیوڈ والا ملازم زیادہ دیر تک ملازم نہیں رہ سکتا تھا۔

"کافی لیں گی؟" لفٹ کی طرف جاتے ہوئے کیف نے پوچھ لیا۔ وہ اس سے دو قدم پیچھے چل رہا تھا۔

"ہاں میرے لیے ایک....."

"ایسپریسو ڈبل شاٹ۔ رائٹ؟"

وہ پرس سے کارڈ نکالتے ہوئی چونکی۔ ابرو تعجب سے اکٹھی ہوئیں۔

"تمہیں کیسے معلوم میں کیسی کافی پیتی ہوں؟"

"آپ کی اسسٹنٹ صاعقہ سے پوچھا تھا۔" وہ مسکرایا۔ گال کا گڑھا گہرا ہوا۔

"نہیں، میں تمہیں اپنا اسسٹنٹ نہیں رکھنے لگی۔"

"حالانکہ آپ کو ایک نئے اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔" اس کے ہاتھ سے کارڈ اچکتے ہوئے مسکرا کے بولا۔ "صاعقہ کو اوشن جیسی تنخواہ دینا آپ افورڈ نہیں کر سکتیں۔ جلد یا بدیر آپ کو کوئی نیا کام شروع کرنا ہوگا۔ اس وقت کم تنخواہ پہ اگر کوئی دستیاب ہے تو وہ میں ہوں۔"

"کافی لاؤڈ شاباش۔" ابرو سے اشارہ کیا۔ وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کیف نے اسے گھر ڈراپ کیا تو وہ اسے صبح جلد آنے کی ہدایت دیتے ہوئے کار سے نکلی۔ پھر شاپنگ بیگز لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ وہ وہیں گیٹ کے اندر کھڑا موبائل پہ اپنے لیے رائیڈ بک کروانے لگا۔ اس وقت گھر پہ کوئی نہیں ہوتا تھا۔ ممانی ورکنگ وومن تھیں۔ بچے اسکول کالج والے تھے۔ وہ بیگز لیے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

اوپر ٹیرس تک آئی تو رک گئی۔ بیگز وہیں فرش پہ رکھ دیے۔ گردن موڑ کے پیچھے دیکھا۔ وہ موبائل کان سے لگائے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ اسی پل چہرہ اٹھا کے اوپر دیکھا۔ کشمالہ کے چہرے کی پریشانی بھانپ کے وہ الرٹ سا ہوا۔ موبائل نیچے کیا اور سوالیہ انداز میں ابرو اٹھائے۔

کا اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے اندر آیا۔ سیڑھیاں دو دو کر کے پھلانگیں۔ انداز چوکنا تھا۔

ٹیرس کے دہانے پہ آ کے وہ رک گیا۔ نظریں فرش سے ہوتی ہوئی داخلی دروازے تک اٹھتی گئیں۔

''تم نے پوچھا تھا نا میرے پچھلے گارڈز جاب کیوں چھوڑ جاتے ہیں؟ یہ ہے اس کی وجہ۔'' کشمالہ نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

سیڑھیوں کے اختتام پہ خون پڑا تھا۔ بہت سا خون۔ جیسے کسی نے پیالہ بھر کے انڈیل دیا ہو۔ خون کے چھینٹے دیوار پہ بھی آئے ہوئے تھے۔ اور وہ ابھی تک گیلا تھا۔

''کیا یہ پہلے بھی کبھی ہوا ہے؟'' وہ احتیاط سے پیر بچاتے ہوئے اوپر آیا۔ پھر ایک جگہ اکٹھے ہوئے گیلے خون کے ساتھ پنجوں کے بل بیٹھا۔ گردن جھکا کے غور سے اسے دیکھا۔

''ایک گارڈ نے اسی وجہ سے جاب چھوڑی تھی۔ اور دوسرے نے اس لیے کہ کسی نے پتھر مار کے میری کار کا شیشہ توڑ دیا تھا۔''

''اور تیسرا؟'' وہ گردن جھکائے خون کا معائنہ کر رہا تھا۔

''اس کو میں نے خود نکالا تھا۔ اسموکنگ کرتا تھا۔'' اس نے بے چینی سے خون آلود فرش کو دیکھا۔ عجیب وحشت ہو رہی تھی وہ سب دیکھ کے۔ پھر اس نے دیکھا، پنجوں کے بل زمین پہ بیٹھا کیف خون کی طرف انگلی بڑھا رہا ہے۔

''ہاتھ مت لگاؤ اسے۔ پتہ نہیں کس کا خون ہے۔''

کیف نے آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ بولا کچھ نہیں۔ واپس سر جھکایا اور دو انگلیاں خون میں ڈبوئیں۔ پھر سرخ پوروں کو چہرے کے قریب لا کے سونگھا۔ اس کے بعد اسے انگوٹھے اور انگلیوں کے درمیان مسلا جیسے کپڑا مسل کے چیک کرتے ہیں۔

''یہ خالص خون نہیں ہے۔ اسے پتلا کیا گیا وہ چونک گئی۔ ''پتلا؟ کیوں؟''

''تاکہ یہ جلدی خشک نہ ہو اور آپ کے پیروں کے ساتھ لگ جائے۔ اصل خون جلد گاڑھا ہو کے جم جاتا ہے۔''

کشمالہ نے سر جھکا کے اپنی سفید ہیلو دیکھیں۔ وہ صاف تھیں۔

کیف اب کھڑے ہوتے ہوئے ٹشو سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ ''کوئی آپ کو ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

اس نے تھک کے گہری سانس لی۔

''اگر تم جاب چھوڑنا چاہتے ہو تو ابھی سے بتا دو۔ مجھے کل لاہور جانا ہے۔ میں ڈرائیور کا بندوبست کر رکھوں۔''

''میں کیوں جاب چھوڑوں گا؟'' ٹشو سے انگلیاں رگڑتے ہوئے وہ حیرت سے بولا۔

''اس حرکت سے ڈر کے۔ لوگ خون دیکھ کے ڈر جاتے ہیں۔''

''میں ایسے انسان سے کیوں ڈروں گا جو بزدلوں کی طرح چھپ کے کسی عورت کے گھر میں خون پھینکتا ہے؟'' وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ مروڑا ہوا خون آلود ٹشو اس کے ہاتھ میں تھا۔ ''میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا آپ کی حفاظت کا۔ آج میں آپ سے ایک اور وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس شخص کو ڈھونڈ کے آپ کے پاس ضرور لاؤں گا۔'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ کچھ تھا اس کے انداز میں۔ یقین دلانے والا۔ بے خوف کر دینے والا۔ اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔ اس نے ممنونیت سے کیف کو دیکھا۔ بولی کچھ نہیں۔

وہ اب سوچتی نظروں سے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔

''کوئی سی سی ٹی وی نہیں ہے؟''

''بتایا نا۔ یہ لوگ لگوانے نہیں دیتے۔ گھر کے باہر لگا ہوا ہے ایک سی سی ٹی وی۔ اس میں بھی کوئی نظر

pklibrary.com

نہیں آیا۔ چوکیدار بھی موجود ہے۔ وہ کسی کو یوں داخل نہیں ہونے دیتا۔"

"ضروری نہیں ہے کہ کوئی باہر سے آیا ہو۔" وہ ٹیرس کی ریلنگ کے ساتھ چلتے ہوئے نیچے دیکھ رہا تھا۔ "گھر کے کسی ملازم کو پیسے دے کر بھی یہ کام کروایا جاسکتا ہے۔"

"ناممکن۔ ماموں کے ملازم بہت پرانے ہیں۔ ہم سب ہر موقعے پہ ان کی مدد کرتے ہیں۔ وہ ایسے کیوں کریں گے؟"

"آپ ان کو پیسے سے خوش رکھتی ہیں۔ وہی پیسہ کوئی زیادہ دے تو وہ اس کا کام کردیں گے۔ پیسہ ہر وقت ہر ایک کی ضرورت ہوتا ہے باس۔ آپ اس سے کسی کو بھی خرید سکتے ہیں۔" وہ منڈیر سے جھک کے کچھ دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں بھی؟"

کیف ٹھٹک کے رکا۔ پھر آہستہ سے اس کی طرف پلٹا۔

وہ سینے پہ بازو لپیٹے سنجیدگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"وہ ہوتا ہے نا مووِیز میں...... باڈی گارڈ کو سب سے پہلے خریدا جاتا ہے۔ اگر میرے پیچھے لگا ہوا شخص (فرش پہ گرے خون کی طرف اشارہ کیا) تمہیں خریدنا چاہے تو کیا کرو گے؟"

لمحے بھر کو ٹیرس پہ سناٹا چھا گیا۔

"آپ کسی سے پوچھیں کہ وہ بک سکتا ہے تو وہ کہے گا نہیں۔ میں بھی یہی کہوں گا۔ وقت کے ساتھ آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا۔"

وہ ہلکا سا مسکرادی۔ "میں مذاق کر رہی تھی۔ تم جاؤ تمہاری رائیڈ آگئی ہے۔" نیچے بائیک آچکی تھی۔ کیف نے بائیکر کو اشارہ کیا۔ پھر واپس اس کی طرف پلٹا۔

"آپ پریشان تو نہیں ہیں؟ یعنی اس خون سے۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلا کے کندھے

اچکا ہے۔ آپ کے ...
نا' وہ مجھے مارنا نہیں چاہتا۔"

لیکن جب وہ چلا گیا تو مالا کو احساس ہوا کہ خون دیکھ کے اسے ایک دفعہ پھر سے وحشت شروع ہوگئی تھی۔ وہ جوتے بدل کے آئی' اور فرش صاف کرنے میں جت گئی۔ پہلے خون صاف کیا۔ پھر پائپ لگا کے فرش دھودیا۔ جب تھک ہار کے لاؤنج میں واپس آئی تو مغرب اتر رہی تھی۔

"آج پھر سے کسی نے ٹیرس پہ خون پھینکا ہے۔" ماہی کو میسج لکھا۔ پھر مٹادیا۔ پھر لکھا۔ پھر مٹا دیا۔ پھر تیسری دفعہ لکھ کے سینڈ دبادیا۔

☆☆☆

کینیڈا کے شہر چلی ویک میں ماہ بینہ اور عباد کے گھر کا واحد بیڈروم خاموشی میں ڈوبا تھا۔ ماہی کروٹ کے بل سو رہی تھی جب میسج ٹون سے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ بدقت پلٹ کے دیکھا۔ عباد گہری نیند سو رہا تھا۔ ماہی نے چھوٹے بال کانوں کے پیچھے اڑسے اور فون اٹھا کے کھولا۔ چہرہ موبائل کی نیلی روشنی سے روشن ہوگیا۔

میسج پڑھ کے اس کی آنکھوں میں فکرمندی اتر آئی۔ انگلیاں ٹائپ کرنے لگیں۔

"It's him" لکھ کے بھیج دیا۔ پھر دبے قدموں وہ لحاف تلے سے نکلی۔ اس نے آدھی آستین کا گاؤن پہن رکھا تھا۔ بال کھلے تھے۔ وہ ننگے پیر لکڑی کے فرش پہ چلتی دروازے تک آئی۔ ذرا سے چلنے پہ بھی آہٹ سنائی دیتی تھی۔

لونگ روم میں ٹی وی کنسول کے نیچے بنے کیبنٹ کو وہ چند لمحے دیکھتی رہی۔ کھولے یا نہ کھولے۔ پھر اس نے کونے والی کیبنٹ کھولی۔ جھک کے اندر سے ایک اسکیچ بک نکالی۔ اور سیدھی ہوئی۔

اسکیچ بک کے درمیان میں کہیں گریفائٹ پنسل رکھی تھی۔ ماہی نے پینسل والے صفحے کو کھولا۔

وہاں ایک تصویر بنی تھی۔ وہ چند لمحے اس تصویر

pklibrary.com

ذمہ دار یہ چہرہ تھا۔ اس کی آنکھیں... اس کی فاتحانہ مسکراہٹ..... وہ اس چہرے کو بنا پلک جھپکے دیکھ رہی تھی۔ عجیب بے بسی اور نفرت کا احساس ہو رہا تھا۔

اس نے اسکیچ بک واپس رکھ دی۔ پھر دیوار پہ نصب گھڑی کی طرف دیکھا۔ فجر کا وقت ہونے کو تھا۔

وہ مالا کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ مالا اس کی نہیں سنتی تھی۔ کوئی ماہی کی نہیں سنتا تھا۔ وہ صرف دعا کر سکتی تھی۔ وہ دعا کرے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ماہی کی دعائیں عموماً قبول ہوا کرتی تھیں۔ یہ بھی ہوگی۔ وہ خود کو تسلی دیتی ہوئی وضو کرنے چل دی۔

☆☆☆

کیف اگلی صبح فجر ہوتے ہی اسے لینے آ گیا تھا۔ پہلے اس نے مالا سے دوبارہ اس کا ٹیرس دیکھنے کی اجازت مانگی۔ چوکیدار اس نوجوان کو اوپر جاتا دیکھ کے گھورتا رہا لیکن اس نے پرواہ نہیں کی۔ ہر طرف سے ٹیرس کا جائزہ لیا۔ پھر گھر کے لاکس چیک کیے۔ کھڑکیوں کا جائزہ لیا۔ جب مطمئن ہوا تو نیچے آیا۔ اور ان کا سفر شروع ہوا۔

وہ لانگ روٹ پہ ڈرائیو نہیں کرتی تھی کیونکہ کر نہیں سکتی تھی۔ اسے متلی ہوتی تھی۔ اس لیے وہ پچھلی سیٹ پہ کھڑکی سے سر ٹکا کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ چلنے سے قبل اس نے ماں کو میسج کر دیا تھا۔ اب ہر گھنٹے بعد ماں کا میسج آتا تھا۔ کہاں پہنچی ہو۔ خیریت سے سفر گزر رہا ہے؟ وہ مسکرا کے جواب دیتی اور فون رکھ کے آنکھیں موند لیتی۔ وہ بھی خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

''کچھ لیں گی آپ؟'' قیام وطعام اسٹیشن پہ کار اندر لے جاتے ہوئے کیف نے پوچھا۔ جواب نہیں آیا تو اس نے گردن موڑ کے دیکھا۔ وہ سر سیٹ کی پشت سے ٹکائے آنکھیں موندے ہوئے تھی۔ سر قدرے ترچھا پڑا تھا۔ ایک طرف سے کچر سے نکلتے سیٹ پہ ٹوکری میں ننھے ننھے پودے رکھے تھے۔

وہ واپس سیدھا ہو گیا۔ چہرے پہ اضطراب پھیلا۔ کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

اب بھی وقت تھا۔ وہ اس کو سب کچھ بتا سکتا تھا۔ وہ یہاں کیوں ہے۔ اور وہ اس کو کیسے دھوکا دے رہا ہے۔ وہ یہ ڈیزرو نہیں کرتی تھی کہ وہ اسے دھوکا دے۔ اس میں اور ظہیر میں فرق ہونا چاہیے تھا۔

کیف نے آنکھیں کھولیں۔ ونڈ اسکرین کے پار دیکھا۔ دنیا ویسی ہی تھی جیسی اس کے آنکھیں بند کرنے سے پہلے تھی۔ آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی تھی۔ اسے خاموشی سے صرف اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ ایسے اس لڑکی سے ہمدردی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اپنے مسئلے حل کرنے تھے۔ وہ اس کو دھوکا ضرور دے رہا ہے لیکن ساتھ ہی وہ اس کی حفاظت بھی کرے گا۔ یوں حساب برابر ہو جائے گا۔ بس دو ماہ وہ اس کی نوکری کرے گا اور پھر کہیں غائب ہو جائے گا۔ وہ اسے بھول جائے گی۔ اور معاملہ دفن ہو جائے گا۔ بس دو ماہ اور.....

کشمالہ کی کھڑکی کے شیشے پہ دستک ہوئی تو اس نے چونک کے آنکھیں کھولیں۔ پھر شیشہ نیچے کیا۔ کیف باہر کھڑا کافی کا کپ اس کی طرف بڑھائے ہوئے تھا۔

''ریسٹ ایریا آ گیا؟'' وہ خود سے بولی اور کپ تھام لیا۔ آنکھوں میں ابھی تک کچی نیند تھی۔ وہ گھوم کے واپس ڈرائیونگ سیٹ تک آیا۔ اپنی کافی اس نے کپ ہولڈر میں رکھی اور سیٹ بیلٹ پہننے لگا۔

''ایک بات پوچھوں آپ سے؟'' کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ وہ کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے اسے سنے گئی۔

''آپ کے پاس کوئی فیوچر پلان تو ہوگا۔ دوبارہ سے اپنا کام سیٹ کرنے کا پلان۔''

''تمہارا مطلب ہے کامیابی کا نیا پلان۔'' وہ باہر دیکھتے ہوئے تلخی سے مسکرائی۔ ''اسکول سے

قسمت؟''

''یعنی قسمت۔'' اس نے تائید میں سر ہلایا۔

''تم کہہ رہے ہو کہ انسان کی قسمت اس کی محنت سے زیادہ ضروری ہے؟''

''محنت اور بزنس کی سمجھ بوجھ۔ یہ لازم ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی ہم فیل ہوجاتے ہیں کیونکہ اس چیز میں ہمارا بخت نہیں ہوتا۔ لیکن وہ کسی دوسری چیز میں ضرور ہوتا ہے۔ آپ کا اگر بخت ریستوران میں نہیں ہے' تو شاید وہ کسی اور کام میں ہو۔ اب بتائیں۔ کیا میں اسسٹنٹ پوزیشن کے لیے ہائر کرلیا گیا ہوں؟''

''جانتے ہو تم میں اور میرے پرانے ڈرائیورز میں فرق کیا ہے؟''

''وہ میری طرح اسٹریٹ اسمارٹ نہیں تھے؟''

''وہ اتنا بولتے نہیں تھے۔'' اور چہرہ موڑ کے باہر دیکھنے لگی۔

اس سے بہتر اسسٹنٹ کشمالہ کو نہیں ملنے والا تھا۔ لیکن ابھی وہ اس بات کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

کشمالہ 'معید'' ماہ بینہ اور حورِ جہاں کا گھر ''مبین منزل'' کہلاتا تھا۔ شہر کے ایک پوش علاقے میں بنا ایک کنال کا دو منزلہ گھر جس کے لان میں بوگن ویلیا کے درخت ہر دیوار کے ساتھ اگے تھے۔ گھر کا کوئی کونا گملوں اور بیلوں سے خالی نہ تھا۔

وہ کار سے نکلی اور آنکھیں بند کر کے اپنے گھر کی فضا میں گہرا سانس لیا۔ کہتے ہیں انسان محبت اور سکون کی تلاش میں ساری دنیا کا سفر کرتا ہے مگر وہ اس کے گھر پہ اس کا منتظر ہوتا ہے۔

سلیم گیٹ بند کر کے اس طرف آیا تو اس نے کیف کی طرف اشارہ کیا جو کار ٹرنک سے اس کا سامان نکال رہا تھا۔

کیوں نہیں سکھاتا کہ ناکام کیسے ہوتا ہے؟ جاب چلی جائے گی تو کیا کرو گے؟ کام میں نقصان ہوگا تو کیا کرو گے؟ صفر سے دوبارہ کیسے شروع کرو گے؟ سب ہمیں کامیابی کے لیے تیار کرتے ہیں۔ کوئی ہمیں ناکام ہونے کے لیے تیار کیوں نہیں کرتا؟''

''میرے خیال میں انسان کا ایکسیڈنٹ ایک دم سے نہیں ہوتا۔ پہلے ہمیں اشارے ملتے ہیں تاکہ ہم سنبھل جائیں۔ ریڈ فلیگز نظر آتے ہیں۔ ظہیر کے بارے میں بھی آپ کو نظر آئے ہوں گے۔''

وہ ڈرائیو کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ کشمالہ نے سوچتی نظروں سے اس کے کندھے کی پشت کو دیکھا۔

''کیا تمہیں قرضوں میں گھرنے سے پہلے ریڈ فلیگز نہیں نظر آئے تھے؟ طنز نہیں کر رہی۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں کیونکہ تم بہت اسمارٹ لگتے ہو۔ پھر اتنا نقصان کیسے کرلیا اپنا۔''

کیف نے گہری سانس لی۔ ''ایک اچھا بزنس مین بننے کے لیے اسمارٹ ہونا کافی نہیں ہوتا۔''

''پھر کیا چاہیے ہوتا ہے؟''

''ایک آئیڈیا۔ ایک یونیک آئیڈیا۔ اس آئیڈیے سے محبت کرنا۔ پھر اس کے گرد بہت محنت سے اپنے کام کو تعمیر کرنا۔'' اس کی آواز میں جوش سا بھر گیا تھا۔ ''پھر اس آئیڈیے کو کامیاب کرنے کے لیے ایک اچھی ٹیم بنانا اور بیچنے سے پہلے اپنی ٹارگٹ آڈیئنس کا علم ہونا۔ اپنے کام کی کوالٹی اور ویلیوز پہ کبھی سمجھوتا نہ کرنا۔''

وہ اسٹیئرنگ وہیل پہ ہاتھ جمائے بولے جا رہا تھا اور وہ انگلیوں پہ گن رہی تھی۔

''مگر یہ سب بھی کافی نہیں ہوتا' باس۔ بزنس میں ترقی یہاں سے آتی ہے۔'' ایک ہاتھ اسٹیئرنگ سے ہٹا کے اپنی پیشانی پہ دستک دی۔ ''آپ کی پیشانی کے بخت سے۔''

یہ میرا ڈرائیور ہے لیف۔ اس کو اس کا کمرہ دکھادو۔ اور کھانا کھلادو۔"

پھر وہ آگے آئی۔ داخلی دروازہ کھولا۔ سامنے راہداری تھی جو لاؤنج میں کھلتی تھی۔ برسوں پرانی عادت تھی۔ اسے معلوم تھا جب وہ راہداری کا کونا مڑے گی تو ایک تخت نظر آئے گا۔ اس تخت پہ ماں بیٹھی ہوں گی۔

کشمالہ کے قدم آگے بڑھے۔ راہداری کا کونا عبور کیا۔ اور سامنے وہی پرانا منظر نظر آیا۔

لاؤنج میں صوفے بھی تھے لیکن حور جہاں بیگم تخت پہ بیٹھی تھیں۔ ایک ٹانگ سیدھی لمبی کیے۔ دوسری اندر کی طرف موڑے۔ گھٹنے کے ساتھ سبزی کے تھال رکھے تھے۔ سر پہ دوپٹہ تھا جو ایک کان کے پیچھے اڑسا ہوا تھا۔ وہ چہرہ جھکائے آلوؤں کے قتلے کاٹ رہی تھیں۔ بھرے بھرے سفید بازو آستین سے جھلک رہے تھے۔ دائیں کلائی میں سونے کی چوڑیاں تھیں۔

حور جہاں بیگم فربہ خاتون تھیں۔ رعب دار اور دبنگ سی۔ لیکن ساتھ ہی کچھ بہت نرم اور ملائم سا تھا ان میں۔ چہرہ سفید گلابی سا تھا۔ ناک میں ہیرے کی لونگ تھی۔ سبز آنکھوں کے گرد جھریاں تھیں۔ پیشانی اور قلموں سے سیاہ سفید بال جھلکتے تھے۔ بڑھتی عمر نے ان کے حسن کو گہنایا نہیں تھا۔ بلکہ مزید باوقار کر دیا تھا۔

آہٹ پہ انہوں نے سر اٹھا کے دیکھا۔ چہرہ کھل اٹھا۔ سبز آنکھوں میں رونق دوڑ گئی۔

"میری بیٹی آ گئی۔" چھری ایک طرف رکھی۔ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے پیروں سے زمین پہ جوتے تلاش کیے کہ فربہ خاتون تھیں۔ جھک نہیں سکتی تھیں۔ تب تک وہ ان کے قریب آ پہنچی تھی۔

"میری پیاری ماں۔" اس نے پرس ایک طرف پھینکا۔ اور جھک کے ان کے گلے سے لگ گئی۔ ماں نے اس کا چہرہ دونوں طرف سے چوما۔ ان کے چہرے پہ اتنی خوشی تھی کہ بیان سے باہر تھی۔

"میری بچی آئی ہے۔ اچھا کیا واپس آ گئی۔ اس سے الگ ہو کے اس کا چہرہ دیکھ کے بولیں۔ "اس ظہیر کو تو....."

"چھوڑیں اس کو ماں۔" وہ ماں سے الگ ہو کے نرمی سے بولی۔ پھر دیکھا ساتھ کی چوکی پہ بخت بی بیٹھی تھی۔ وہ جھک کے اس سے بھی ملی۔ بخت بی ادھیڑ عمر عورت تھی۔ بالوں میں تیل لگا کے کس کے چوٹی بنائے وہ کانوں میں سنہری بالیاں پہنے ہوئے تھی۔ وہ مالا کو ملی تو بے اختیار دعا دی۔ بخت بی جب ملتی ایسے ہی دعائیں دیا کرتی تھی۔

بخت بی بی کتنے برسوں سے ان کی ملازمہ تھی، اب تو مالا کو گنتی ہی بھول گئی تھی۔ بس اتنا یاد تھا کہ اس کا شوہر مرا تھا تو وہ پانچ بچوں کے ساتھ ان کے سرونٹ کوارٹر میں آئی تھی۔ اب اس کے بچے جوان ہو کے اس آشیانے سے اڑ چکے تھے۔ ایک بیٹا سلیم چوکیدار بھی تھا اور سودا سلف بھی لاتا تھا۔ باقی بیٹیوں کی شادی ہو گئی لیکن بخت بی بی اور ماں کا ساتھ قائم تھا۔

"سفر ٹھیک گزرا؟ راستے میں متلی تو نہیں ہوئی؟" وہ ماں کے کندھے سے سر ٹکائے بیٹھی تھی اور وہ اس کے بال کان کے پیچھے اڑس رہی تھیں۔

"نہیں ماں۔ ڈرائیور ساتھ لائی ہوں۔"

تبھی راہداری میں آہٹ ہوئی۔ ماں نے چونک کے دیکھا۔ کیف ہاتھ میں ٹوکری لیے کھڑا تھا۔ وہ سیدھی ہو کے بیٹھی۔

"پلانٹس کہاں رکھوں؟"

"میاں! تم کون ہو اور اندر کہاں چلے آ رہے ہو؟" حور جہاں بیگم کے ماتھے پہ بل پڑے۔ دو انگلیوں سے اشارہ کیا۔ "پیچھے۔"

"سوری۔ میں....." وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ متذبذب سا چند قدم پیچھے ہوا۔ "میں کیف جمال ہوں۔ کشمالہ بی بی کا ڈرائیور۔"

"تمہاری بی بی نے تمہیں بتایا نہیں ہے کہ ڈرائیور گھروں کے اندر نہیں آتے؟ اور پیچھے۔" وہ

انگلیاں جھٹک کے کہا۔

''سوری۔'' وہ نا سمجھی کے انداز میں مزید پیچھے ہوا۔ کشمالہ نے مسکرا کے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ کیف نے ٹوکری وہیں رکھی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

''یہ کیا تم رنگ برنگے ڈرائیور رکھتی رہتی ہو۔'' ماں نے خفگی سے اسے دیکھا۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔

''باجی! یہ ڈرائیور تو نہیں لگتا۔'' بخت بی لاؤنج کی دیوار گیر کھڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں کیف سلیم کے ساتھ جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

''یہ میرا اسسٹنٹ بھی ہے ماں۔ بتایا تھا نا۔ میں نیا بزنس سیٹ کرنے لگی ہوں۔''

ماں کی سبز آنکھوں میں افسوس سا ابھرا۔ تاسف سے سر ہلایا۔

''کیا کرو گی اتنا پیسہ کما کے مالا؟''

اور یہیں پہ ماں اور اس کا اختلاف شروع ہوتا تھا۔

''ماں..... یہ اکیسویں صدی ہے۔ عورت صرف پیسے کے لیے کام نہیں کرتی۔ اسے اپنا بھی کچھ چاہیے ہوتا ہے تاکہ اس کی sanity برقرار رہے۔ وہ خود کو گھر کے چولہے میں ضائع نہ کرے۔ حور جہاں بیگم کی طرح۔'' ماں کے کان کے پاس شرارت سے جھکی۔

ان کی آنکھوں میں خفگی اتری۔ ''پرے بدتمیز۔ تمہیں لگتا ہے میں نے خود کو ضائع کیا؟'' سر جھٹک کے چھری اٹھائی اور کھٹ کھٹ آلو کے ٹکڑے کرنے لگیں۔ اب پروٹوکول ختم تھا۔ مالا اب پرانی ہو چکی تھی۔ ماں اس سے زیادہ بچوں کو پروٹوکول دینے کی عادی نہیں تھیں۔

''ضائع نہیں کیے تو کچھ کارآمد بھی نہیں کیا۔ ماسٹرز ہولڈر تھیں۔ مگر بچوں میں لگی رہیں۔ آپ کا سارا دن اسی فکر میں گزرتا ہے کہ آپ کے بچوں نے کھانا کھایا یا نہیں۔ اب وہ بچے اپنی اپنی زندگیوں آج فراغت میں آپ کے پاس کچھ کرنے کو ہوتا۔ آپ اب بھی سبزی کاٹ رہی ہیں جو بخت بی بھی کاٹ سکتی ہے۔ یہی فرق ہے آپ کی اور ہماری جنریشن میں۔ آپ چولہے سے نہیں نکلتیں اور ہم دنیا فتح کرنا چاہتے ہیں۔''

''بخت..... اپنی مالا بی بی کو بتاؤ کہ ہر انسان دنیا میں اپنا کردار ادا کرنے آتا ہے۔ کسی کا کردار دنیا فتح کرنا ہوتا ہے اور کسی کا اس فاتح کی تربیت کرنا۔''

مگر مالا مسکرا کے شانے اچکا کے اٹھ گئی۔ ''اگر آپ نے تیس سال پہلے کوئی بزنس شروع کیا ہوتا تو آج آپ بھی ایک بزنس وومن ہوتیں۔ کبیرہ تائی کی طرح۔''

ماں نے اپنی چپل کی تلاش میں پیر زمین پہ مارا۔ وہ ہنستی ہوئی بیگ اٹھا کے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ماں خفگی سے بڑبڑاتے ہوئے سبزی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

☆☆☆

کبیرہ تائی ہماری کہانی کا ایک اہم کردار ہیں۔ وہ ابا کے فرسٹ کزن کی بیوی تھیں۔ ایک خوب صورت، دولت مند اور بااثر خاتون۔ اس کے علاوہ جن خصلتوں سے وہ پہچانی جاتی تھیں، ان میں تکبر، بدزبانی اور منافقت سرفہرست تھیں۔ بھری محفلوں میں دوسروں کا تمسخر اڑانا تو لازم تھا۔ کسی کی بدصورتی تو کسی کی غربت کا مذاق۔ خود حسین تھیں۔ رئیس تھیں۔ رشتے دار ان کے گرد منڈلاتے تھے۔

بیٹے والے ان کی بیٹی کی وجہ سے۔ اور بیٹی والے ان کے اس بیٹے میں دلچسپی رکھتے تھے جو ماں کی طرح مغرور مشہور تھا۔ اتنا مغرور کہ وہ کبھی پاکستان نہیں آیا تھا نہ اپنے رشتے داروں سے ملا تھا۔

ان کا بیٹا جب تین چار برس کا تھا' تب وہ لوگ انگلینڈ شفٹ ہو گئے تھے۔ کئی برس بعد ان کی فیملی خود تو پاکستان سیٹل ہو گئی لیکن ان کا بیٹا لوٹ کے نہیں آیا۔ نہ اسے کبھی کسی نے دیکھا۔ نہ کوئی اس سے ملا۔

pklibrary.com

تھا' اس کو چارسدہ کے عام سے گھرانے کی ہاؤس وائف ٹوک کے اٹھ گئی تھی۔ کبیرہ بیگم کی ایسی توہین کسی نے کبھی نہ کی تھی۔ معید کا کہنا تھا کہ یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی لیکن کبیرہ تھوڑی سائیکو بھی تھیں۔ ایسے لوگوں کو ہمیشہ ایک ولن کی تلاش ہوتی ہے جس کو وہ اپنی بے سکونی کے لیے الزام دے سکیں۔ اس لیے اس دن سے کبیرہ نے حورِ جہاں کے ساتھ بیر پال لیا۔

ایسے چند واقعات اور بھی ہوئے۔۔تب کبیرہ انگلینڈ میں رہتی تھیں۔ وہاں بیٹھ کے بھی سارے پاکستان کی خبر رکھتیں۔ سال میں تین چار چکر بھی لگا لیتیں۔ انہوں نے خاندان میں مشہور کرنا شروع کر دیا کہ حور جہاں ان سے جلتی ہے۔ ایک دو الزام بھی لگائے ماں پر۔ کوئی نو دس سال پرانی بات تھی جب کبیرہ اور ماں کا اسی طرح ایک محفل میں پھر سے ٹاکرا ہو گیا۔ کبیرہ نے کسی کی بے عزتی کی اور ماں نے سب کے سامنے اس غریب رشتے دار کی سائیڈ لی۔

اس دن کے بعد کبیرہ اور ماں کی بول چال ختم ہوگئی۔ دوبارہ محفلوں میں ایک دوسرے کو جب بھی دیکھا' ماں پھر بھی سلام کرتیں لیکن کبیرہ گھمنڈ اور نفرت سے منہ موڑ کے گزر جاتیں جیسے سنا ہی نہیں۔ ماہی ماں کو منع کرتی تھی۔ وہ جواب نہیں دیتیں تو آپ کیوں سلام کرتی ہیں؟ لیکن ماں بڑے ہی سکون سے کہتیں کہ دیکھو اللہ نے ہم پہ سلام فرض کیا ہے۔ بیٹھ کے گپیں مارنا فرض نہیں کیا۔ میں بس اتنا کر رہی ہوں جتنا میرے اوپر فرض ہے۔

اب اتنے برس ہو گئے تھے۔ کبیرہ پاکستان واپس آ گئیں لیکن دونوں کے تعلقات بحال نہیں ہوئے تھے۔ کبیرہ کا نام اب ان کے لیے ایک مذاق تھا۔ مالا ماں کو تنگ کرنے کے لیے ان کا نام لیتی۔ ماہی کو جب کسی انسان کو شدید برا کہنا ہوتا تو اس کو کبیرہ سے ملا دیتی۔ اور رہا معید...... تو جب اس کی

کی کامیابی اور وجاہت کے قصے سنایا کرتی تھیں۔ اپنے بیٹے پہ ان کو بہت ہی مان تھا۔ ماہی کا کہنا تھا کہ ان کا بیٹا بھی انہی کی طرح ہوگا۔ سائیکو کیس۔

کبیرہ تائی کو کوئی نفسیاتی عارضہ بھی تھا۔ وہ لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے تسکین محسوس کرتی تھیں۔ کسی بھی رشتے دار کے گھر خوشی غمی ہوتی تو فوراً پہنچ جاتیں۔ مہنگے گفٹس۔ بھاری سلامیاں۔ پھر اسی رشتے دار کے گھر بیٹھ کے باقی خاندان کا مذاق اڑاتیں۔

سارے خاندان میں اگر کبیرہ کی کسی سے نہیں بنی تھی تو وہ حورِ جہاں بیگم تھیں۔

حورِ جہاں جب بیاہ کے اس خاندان میں آئیں تو کبیرہ نے ان کو بھی اپنی دولت سے دبانے کی کوشش کی۔ لیکن حورِ جہاں ان عورتوں میں سے نہیں تھیں جن کی اپنی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ یا وہ کسی کی دولت سے متاثر ہو کے اپنی آواز کھو دیتی ہیں۔ حورِ جہاں اپنے آپ میں کافی تھیں۔ حسین بھی تھیں اور پڑھی لکھی بھی۔ ان کو کسی قسم کا احساس کمتری نہ تھا۔ پہلی دفعہ جب بھری محفل میں انہوں نے کبیرہ کو کسی کا تمسخر اڑاتے اور خاندان والوں کو مسکرا کے سنتے دیکھا تو ٹوک دیا۔

"دیکھو کبیرہ۔ سب کی صورت شکل اللہ نے بنائی ہیں۔ جو خوبصورت ہیں ان کی خوبصورتی ہی ان کا امتحان ہوتا ہے۔ ایسے غرور نہ کیا کرو۔ اللہ کو یہ نہیں پسند۔"

ایسا کئی موقعوں پہ ہوا۔ یہاں تک کہ ایک محفل میں جب کبیرہ اپنی نند کا ذکر کرتے ہوئے کچھ کہنے لگیں تو حورِ جہاں یہ کہتے ہوئے اٹھ گئیں کہ "میں ایسی محفل میں نہیں بیٹھوں گی جہاں کسی کا مذاق اڑایا جائے۔ میں نے اللہ کو جواب دینا ہے۔"

محفل میں دوسرے لوگ بھی دبی دبی آواز میں بولنے لگے۔ آہستہ آہستہ سب تتر بتر گئے۔

pklibrary.com

ماہی سے بڑائی ہوتی تو وہ کہتا۔
"پہلے زمانے میں میل ہوتی تھی۔ اب ای میل ہوتی ہے۔ ایسے ہی پہلے زمانے میں کبیرہ تھی اور اب ای کبیرہ ہوتی ہے۔ اور وہ تم ہو ماہی۔"

☆☆☆

وہ فریش ہو کے کمرے سے نکلی تو معید کچن کے دروازے پہ کھڑا سیب کھا رہا تھا۔ اسے دیکھ کے ہنس دیا۔
"پھر کیسا مذاق کیا ظہیر نے آپ کے ساتھ؟"
وہ قریب آیا اور بند مٹھی اس کی طرف بڑھائی۔ مالا نے ہنس کے اپنی بند مٹھی اس کی مٹھی سے ٹکرائی۔
"بدتمیز۔" پھر سر سے پیر تک معید کو دیکھا۔
"اپنی سناؤ۔ ماں کو ٹائم دیتے ہو یا فون پہ اپنی دوسری ماؤں کے ساتھ لگے رہتے ہو۔"
وہ جھینپ گیا۔ "میری ماں اس وقت صرف جنرل سرجری ہے اوکے۔"
معید نکلتے ہوئے قد کا نوجوان تھا۔ کلین شیو۔ ماتھے پہ کٹے ہوئے بال۔ ماہی جیسی بھوری آنکھیں۔ چہرے پہ ہر وقت بجی مسکراہٹ۔ اور کانوں میں ہینڈز فری۔ وہ جنرل سرجری میں ٹریننگ کر رہا تھا۔ گھر اس کے لیے ہوٹل کی طرح تھا جہاں وہ صرف سونے آتا تھا۔
"یہ باہر تمہارا ڈرائیور ہے؟" معید نے سیب کی بائٹ لیتے ہوئے سرسری سا پوچھا۔
اف یہ سوال۔ کیا تھا اگر کیف جمال یونیفارم پہن لیتا۔ یا اتنا خوش شکل نہ ہوتا۔
"ایک تو سب کو میرے ڈرائیور سے کیا مسئلہ ہے؟" وہ چڑی نہیں تھی۔ نہ اسے غصہ آیا۔ بس اس تکرار سے تھک گئی تھی۔
"مسئلہ نہیں ہے بابا۔ میں تو کہتا ہوں مجھے بھی اپنا ڈرائیور رکھ لو۔ بڑا اسکوپ ہے اس کام کا۔" وہ سیب کھاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اس کے پاس گھر والوں کے لیے بس اتنا وقت ہوتا تھا۔
وہ واپس کمرے میں آ گئی کیونکہ لاؤنج میں بی ماں اور بخت بی اس پر دکھیاں ... رہی تھیں۔
"باجی...... مالا بی بی کی شادی کر دیں۔ پہلے تو ان کے سر پہ ریستوران سوار ہوتا تھا۔ شکر ہے وہ قصہ ختم ہوا۔"
اسے ہنسی آ گئی۔ بخت بی کو اس کی ٹریجڈی میں بھی امید کی کرن نظر آئی تھی۔
"تمہاری مالا بی بی ہی نہیں مانتی۔ ورنہ خاندان میں کس نے رشتہ نہیں مانگا۔ حسن بھی آزمائش ہے بخت بی بی۔"
مالا مسکراتے ہوئے کمرے میں آ گئی۔ اسے اس ذکر کی اتنی عادت تھی کہ اب فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے کسی حسین ترین مرد سے شادی کرنی تھی۔ نہیں۔ بس وہ ذہین ہو۔ اس کے کام کو سپورٹ کرے۔ کم از کم ویسا ہو جیسی وہ خود ہے۔ اور یہ ساری خوبیاں اس کے رشتے داروں کے بیٹوں میں ایک ساتھ نہیں تھیں۔
کھڑکی کے پردے ہٹائے تو لان نظر آیا۔ کیف گیٹ کے ساتھ بنے گارڈ روم کے باہر کرسی ڈالے گود میں لیپ ٹاپ رکھے ٹائپ کر رہا تھا۔ اس نے مالا سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنے بزنس پلان پہ کام کر رہا ہے اس لیے جب فارغ ہوگا اپنا کام کرتا رہے گا۔ مالا کو ظاہر ہے اعتراض نہیں تھا۔ البتہ اس نے نوٹ کیا کہ سلیم ساتھ والی کرسی پہ بیٹھا دلچسپی سے کیف کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں بات بھی کر رہے تھے۔ خیر اسے کیا۔ وہ وہاں سے ہٹ گئی۔
"یہ کمپیوٹر آپ کا اپنا ہے؟ نیا لگتا ہے۔" سلیم نے متاثر ہوتے ہوئے انگلی لیپ ٹاپ کے کنارے پہ پھیری۔ کیف نے ایک نظر اسے دیکھا۔
"تمہیں اگر کوئی فلم وغیرہ دیکھنی ہو تو میرے کمپیوٹر پہ دیکھ لینا۔" فراخ دلی سے آفر کی۔ سلیم کا چہرہ کھل اٹھا۔
"شکریہ کیف بھائی۔" ذرا دیر کو خاموشی کا وقفہ آیا۔

pklibrary.com

ہوئے سرسری سا سوال کیا۔
''معید بھائی اور بڑی باجی۔'' سلیم جوش سے بتانے لگا۔ ''پہلے بڑی باجی کی چھوٹی بہن بھی یہاں رہتی تھیں۔ مالا بی بی کی خالہ۔ وہ بیمار تھیں۔ محتاج تھیں۔ بڑی باجی نے ان کی بڑی خدمت کی۔ میری امی کے ہاتھوں میں ہی وہ فوت ہوئیں۔''
''بڑی باجی کے سارے بچوں کی شادی ہوگئی ہے؟''
''نہیں۔ صرف ماہی باجی کی ہوئی ہے۔ وہ کنیڈا ہوتی ہیں۔'' سلیم کینیڈا کو کنیڈا کہتا تھا۔
''اچھا۔ مالا بی بی کی منگنی بھی نہیں ہوئی؟'' اسے تعجب ہوا۔ ''وہ سب سے بڑی ہیں نا۔''
''ان کو شادی کا شوق نہیں ہے جی۔ وہ بس اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔'' سلیم کو اس کے علاوہ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ کیف کی ٹائپ کرتی انگلیاں رک گئیں۔ وہ سوچتی نظروں سے اسکرین کو دیکھنے لگا۔
یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا اس کی کوئی منگنی وغیرہ تو ہو چکی ہوگی۔ شاید ہو کے ختم ہوگئی ہو۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ یا شاید کچھ اور تھا جو اسے چبھ رہا تھا۔
چند دن پہلے تک کشمالہ مبین اس کا ایک ٹارگٹ تھی جس کے پاس اسے نوکری کرنی تھی۔ وہ اکیلی تھی۔ کام، ریستوران' گھر۔ لیکن آج اس نے کچھ اور دیکھا تھا۔ وہ اب صرف ایک ٹارگٹ نہیں تھی۔ اس کی ایک فیملی۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔
لاہور آنا پلان کا حصہ نہیں تھا۔ شاید یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔

☆☆☆

رات تک وہ گھر سے نہیں نکلی۔ بس کمرے میں پڑی سوتی رہی۔ کیف سے اس کی ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ وہ اسے گویا یہاں لا کے بھول ہی گئی تھی۔ ڈرائیورز گھر کے اندر نہیں آیا کرتے تھے۔ ان کا داخلہ صرف ڈرٹی کچن تک محدود تھا۔
ان کے لاؤنج سے ملحقہ بڑا سا کچن کلین کچن ڈرٹی کچن میں کھلتا تھا۔ اور ڈرٹی کچن سے ایک دروازہ باہر کی طرف۔ تاکہ ملازم یعنی سلیم باہر سے ہی ڈرٹی کچن میں آئے اور اپنا ناشتہ چائے وغیرہ بنا کے وہیں سے رخصت ہو جائے۔ ماں کو مرد ملازموں کا گھر کے اندر آنا پسند نہیں تھا۔ کھانا البتہ سب کا ماں خود بناتی تھیں۔ وہ کسی اور کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھا سکتی تھیں۔ بلکہ اکثر اپنے ملازموں کی فرمائش پہ کھانے اور میٹھے بنایا کرتی تھیں۔
ماہی کہتی تھی ماں نے ان کو ملازم نہیں رکھا۔ انہوں نے ماں کو مالک رکھا ہوا ہے۔
بخت بی اور سلیم کا کمرہ بیسمنٹ میں تھا۔ بیسمنٹ کی سیڑھیاں گھر کے باہر سے تھیں تاکہ ملازموں سے پرائیویسی رہے۔ انہوں نے کیف کو بھی بیسمنٹ میں ایک کمرہ دے دیا تھا جسے اس نے چپ چاپ قبول کرلیا۔
صبح فجر پہ اس کی آنکھ لاؤنج میں ہوتی کھٹ پٹ پہ کھلی۔ اسے معلوم تھا یہ ماں ہوں گی۔ ماں فجر خوب شور کے پڑھا کرتی تھیں تاکہ ان کے بچوں کی نیند ایسے خراب ہو کے وہ دوبارہ سو نہ سکیں۔ اسلام آباد میں نمازیں آگے پیچھے ہو جایا کرتی تھیں لیکن لاہور میں مجال تھی کہ ایسا ہو۔ وہ نماز پڑھ کے جائے نماز پہ بیٹھی اور سوچا کہ کیا دعا مانگے۔ اسے اس وقت سب سے زیادہ کیا چاہیے تھا؟
نیا بزنس۔ وہ دوبارہ سے برسر روزگار ہو جائے۔ اپنے پیروں پہ کھڑی ہو جائے۔ اور اب کوئی مرد اسے ظہیر کی طرح دھوکہ نہ دے سکے۔
دعا مانگ کے وہ اٹھی اور جمائی لیتے ہوئے کھڑکی کے سامنے آئی تو رک گئی۔
اندھیرے لان میں گارڈ روم کے سامنے وہ گھاس پہ جائے نماز ڈالے دوزانو بیٹھا تھا۔ وہ شاید نماز پڑھ چکا تھا۔ اب بس یونہی سر جھکائے بیٹھا تسبیح کے دانے گرا رہا تھے۔
اسے بہت عجیب لگا۔ مانا کہ بہت سے لڑکے

pklibrary.com

لیکن تسبیح؟ اسے نہیں یاد اس نے کبھی کسی نوجوان کو ہاتھ میں تسبیح پکڑے دیکھا ہو۔ وہ خود بھی تسبیحوں کی عادی نہیں تھی۔ وقت ہی نہیں ملتا تھا۔

کیف جمال تسبیح پڑھتا تھا؟ عجیب بات تھی۔

صبح بخت بی جب اس کے کمرے میں کافی لائیں تو اسے حیرت ہوئی۔

"آپ کو کب سے کافی بنانی آ گئی؟"

"اس موئے ڈرائیور نے بنائی ہے۔ میں نے اسے چائے کی چیزیں پکڑائیں تو بابو آگے سے بولا۔ "میں چائے نہیں پیتا۔ مجھے کافی میکر دو۔ (اس کی نقل کر کے بولیں) پھر خود ہی کچن سے معید بھائی کا پرانا کافی میکر ڈھونڈ لایا اور سیٹ کر دیا۔ بازار سے موٹے بیجوں والے ڈبے بھی لے آیا۔ اور ساتھ یہ مجھے پکڑا دی کہ میری بی بی یہی پیتی ہیں۔ ہونہہ۔"

وہ ہنس دی۔ مبین منزل کو پہلی دفعہ ایسا رنگ برنگا ملازم ملا تھا۔ بخت بی سے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

"چھوٹی باجی..... اس لڑکے کو ذرا فاصلے پہ رکھیو۔ مجھے یہ وارداتیا لگتا ہے۔"

"اچھا بخت بی۔ اب جائیں اور کیف سے کہیں تیار رہے۔ اس نے مجھے سیلون لے کر جانا ہے۔"

شام میں عزہ کے نکاح کا فنکشن تھا۔ اور صد شکر اس کے چہرے پہ ایک بھی پمپل نہیں تھا ورنہ عموماً کسی فنکشن سے پہلے ہی یہ پمپل حاضری دیا کرتے تھے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی فیشل کروالے تو شام تک اس کا اثر نظر آنے لگے گا۔

وہ باہر آئی تو کیف گارڈ روم کی باہر کرسی پہ بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں اسکیچ بک تھی اور وہ پنسل سے اس پہ کچھ کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کے کھڑا ہو گیا۔ اسکیچ بک پیچھے کر لی۔ آج جینز پہ سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں جوگرز تھے اور چہرے کی ہلکی بڑھی شیو ویسی ہی تھی۔

"کیا کر رہے ہو؟" وہ اس کی اسکیچ بک کو کیچر میں باندھے وہ آنکھوں پہ سیاہ چشمہ لگائے ہوئے تھی۔ کیف کے چہرے پہ جھینپ جانے کا تاثر ابھرا۔ رخسار ہلکے سے گلابی ہوئے یا شاید دھوپ کے باعث اسے ایسا لگا تھا۔

"یونہی فارغ وقت میں اسکیچز بناتا ہوں۔"

"کیا بنا رہے ہو؟ دکھاؤ۔" وہ دوستانہ لہجے میں کہتی اس کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اب وہ دونوں دھوپ میں تھے۔ چھاؤں پیچھے رہ گئی تھی۔

کیف نے اسکیچ بک کھول کے اس کے سامنے کی۔ صفحے پلٹائے۔ اس پہ موٹر بائیک کا سیاہ سفید اسکیچ بنا تھا۔

"تمہیں موٹر بائیکس پسند ہیں؟"

"بہت زیادہ۔" وہ تھوڑا شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ مالا نے غور سے اسکیچ کو دیکھا۔

"یہ ہیوی بائیک ہے۔ کافی مہنگی ہوتی ہے۔ اگر تم اپنا نیا بزنس اس لیے شروع کرنا چاہتے ہو کہ ایک دن تم یہ بائیک خرید سکو تو یہ ایک غلط اپروچ ہے۔" نرمی سے تنبیہہ کی۔ اسے سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ نوجوان قرضوں کا شکار کیوں تھا۔ مہنگی بائیکس کا شوق۔ مہنگا کیمرا ٹاپ۔ قیمتی فوٹوگرافی آلات امپورٹ کروانا۔ وہ اپنی بساط سے اونچی جست لگانا چاہتا تھا اور ایسے میں زمین اس کے قدموں تلے سے نکل جاتی تھی۔

کیف نے جواب نہیں دیا۔ کار کی طرف بڑھ گیا۔ جیسے وہ اس کی بات سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔

وہ خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا جب صفورا کی کال آنے لگی۔

"کیف کیسا کام کر رہا ہے؟ تم اس سے مطمئن ہو نا؟" مالا کا فون کار سے کنیکٹڈ تھا۔ آواز خود بخود اسپیکرز پہ گونجنے لگی۔

"ہاں۔ کیف اچھا کام کر رہا ہے۔ کافی اسمارٹ اور سمجھ دار ہے۔ ساتھ ہی اپنے نئے بزنس پلان کو بھی وقت دیتا ہے۔" وہ سادگی سے کہتے

pklibrary.com

تھی جو سی کو اس کے سامنے اس لیے نہیں سراہتے کہ وہ سر نہ چڑھ جائے۔ جو سچ ہو اسے کہہ دینا چاہیے۔

''اسمارٹ ہوتا تو اب تک کامیاب ہو چکا ہوتا۔ اس کے لیے اچھا ہے کہ تمہارے پاس ہی جاب کرتا رہے۔ ورنہ اس کا اپنا کام کبھی کامیاب نہیں ہونا۔ اور ہاں۔ بس یہ دھیان کرنا کہ وہ تم سے ایکسٹرا پیسے ویسے نہ لے۔ تھوڑا سا لالچی بھی ہے۔ میرا کزن ہے نا' مجھے اس کا پتا ہے۔''

صفورا اتنا تیز تیز بولے جا رہی تھی کہ اسے اسپیکر آف کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بے اختیار کیف کے کندھے کی پشت کو دیکھا۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ (اف)

''ہے کہاں وہ؟ ذرا بات کرواؤ میری۔'' صفورا اپنے تئیں ایک اچھی دوست ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔

کیف نے ایک ہاتھ ہلا کے نفی کا اشارہ کر دیا۔ کہا کچھ نہیں۔ چونکہ بیک ویو مرر اوپر کی طرف تھا' وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''ابھی وہ مصروف ہے۔ تم بعد میں اسے خود ہی کال کر لینا۔'' کال بند ہونے کے بعد بھی کار میں ایک عجیب سی ٹینشن پھیل گئی۔

''اس کو معلوم نہیں تھا کہ تم سن رہے ہو۔''

''وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہی تھیں۔ کیف جمال ایک لوزر ہے اور رہے گا۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ''جان میکس ویل کہتا تھا' تم پیسے سے نہیں جیت سکتے۔ اس کو کمانے پہ فوکس کرو تو مادیت پرست کہلاؤ گے۔ کمانا چاہو اور نہ کما سکو تو لوزر ہو۔ بہت کما کے خرچ نہ کرو تو کنجوس ہو۔ اگر کما کے خرچ کرتے رہو تو فضول خرچ ہو۔ اگر کمانے کی فکر نہ کرو تو تم میں آگے بڑھنے کی لگن نہیں۔ اگر بڑھاپے تک بہت سے پیسے کے مالک ہو تو تم بے وقوف ہو کہ اس پیسے کو قبر میں لے جانا چاہ رہے تھے۔''

''پھر کیا کرنا چاہیے پیسے کے ساتھ؟''

باس۔ اس کو مٹھی میں نہیں دبا لینا بلکہ ڈھیلی گرفت کے ساتھ اس کو پکڑنا ہے اور پھر کھلے دل سے اس کو قابلِ قدر چیزوں کو حاصل کرنے پہ صرف کرنا ہے۔'' ذرا توقف سے بولا۔ ''آپ سے ایک درخواست ہے۔ دوبارہ ان کی کال آئے تو مجھ سے بات مت کروائیے گا۔ ان کا میرے اوپر احسان ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے سامنے ان کو کچھ ایسا بول دوں جس پہ مجھے بعد میں شرمندگی ہو۔''

ساری بات ہی ختم ہو گئی تھی۔ (کاش وہ اسپیکر آف رکھتی)

سیلون ایک کمرشل بلاک کی دو منزلوں پہ پھیلا تھا۔ تیسری اور چوتھی منزل پہ کوئی جم تھا۔ وہ اترنے لگی تو کیف نے پوچھا کہ کیا وہ اسے اندر دروازے تک چھوڑنے آئے؟ مگر کشمالہ نے منع کر دیا۔ سیلون اس کی کزن کا تھا۔ یونہی اس نوجوان کو ساتھ دیکھ کے باتیں بنتیں۔

اسے وہاں دو گھنٹے لگ گئے۔ جب وہ واپسی پہ لفٹ میں سوار ہوئی تو اندر کوئی اور بھی تھا۔ ایک ہٹا کٹا سا آدمی جو اس کی طرف پہلو کیے کھڑا تھا۔ وہ نظر انداز کر کے اندر آئی اور گراؤنڈ فلور کا بٹن دبایا۔

جو کچھ ہوا ایک لمحے میں ہوا۔ کسی نے اس پہ پیچھے سے حملہ کیا۔ وہ اوندھے منہ نیچے گری۔ سر کے پچھلے حصے میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

''باس..... باس.....''

کشمالہ نے آنکھیں کھولیں۔ بصارت کے آگے اب بھی دھند تھی۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔

وہ لفٹ کے فرش پہ چہرے کے بل گری ہوئی تھی۔ اس کے سامنے وہ بچوں کے بل بیٹھا اسے پکار رہا تھا۔ وہ بدقت ہتھیلی کے بل اٹھی۔ پھر چونک کے ادھر ادھر دیکھا۔

لفٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ گراؤنڈ فلور تھا۔ باوردی گارڈ باہر کی طرف کھڑا تھا۔ اور کیف اس

"آپ ٹھیک ہیں؟" وہ فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار سر کے پچھلے حصے کی طرف گیا۔ درد کی ٹیس ابھی تک اٹھ رہی تھی۔

"کیا ہوا مجھے؟" اس نے الجھن سے ادھر ادھر دیکھا۔

"لفٹ نیچے آئی تو آپ اندر بے ہوش تھیں۔ گارڈ کو معلوم تھا کہ آپ کس کار سے نکلی تھیں' اس لیے وہ مجھے بلا لایا۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔ چلو۔" وہ تکلیف برداشت کرتے ہوئے اٹھنے لگی۔

"مگر ہوا کیا تھا؟" وہ تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"چلو نا۔" اس سے پہلے کہ لوگ جمع ہوتے' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سر گھوم رہا تھا لیکن وہ بظاہر خود کو سنبھالے قدم اٹھانے لگی۔

"یہ مجھے دیں۔" اس نے نرمی سے اس کے ہاتھ سے پرس لے لیا۔ پھر وہ گارڈ کے سامنے رکا۔ بٹوے سے پانچ سو کا نوٹ نکال کے اسے تھمایا۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور کشمالہ کے پیچھے چل دیا۔ کسی نے گارڈ کو روک کے پوچھا کہ کیا ہوا تھا۔

"وہ ایک باجی سیلون آئی تھیں۔ ان کی شاید طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ میں ان کے شوہر کو پارکنگ سے بلا لایا۔" وہ قصہ بیان کر رہا تھا۔

"سیدھے گھر چلو۔" اس کا سر شدید درد کر رہا تھا۔ سیٹ کی پشت سے اسے ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"پہلے مجھے بتائیں ہوا کیا تھا؟" وہ کہتے کہتے چونکا۔ "کسی نے کچھ کیا ہے؟ میں ابھی دیکھتا ہوں۔" کیف نے تیزی سے سیٹ بیلٹ کھولی اور باہر نکلنے لگا جب مالا نے روکا۔

"واپس بیٹھو کیف۔" انداز میں تحکم بھی تھا اور تکان بھی۔ "یہ میری کزن کا سیلون ہے۔ یہاں تماشا نہیں بنانا۔ خاندان میں باتیں بنتی ہیں۔"

وہ اس کی طرف رخ موڑ کے بیٹھا اور سنجیدگی سے پوچھا۔ ماتھے پہ بل تھے۔ آنکھوں میں غصہ بھی تھا۔

اسے جو یاد تھا' بتا دیا۔

"میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا مگر میں اس کو نہیں جانتی۔ اور لفٹ میں سی سی ٹی وی بھی نہیں تھا۔"

"لفٹ کے باہر تو ہوگا۔ مجھے دیکھنے تو دیں۔ میرا کیا فائدہ آپ کو اگر میں یہ چیزیں میچ نہیں کر سکتا؟" اسے غصہ آ رہا تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ نہ پولیس رپورٹ درج کروائے گی نہ شور ڈالے گی۔

"میں نے کہا نا، یہاں تماشا نہیں بنانا۔ گھر چلو۔" وہ تکان سے بولی۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔

اس آدمی نے اسے بہت زور سے مارا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر میں واپس آؤں گا۔ اور آپ کا نام لیے بغیر ان کے ریکارڈز ضرور نکلواؤں گا۔ ایسے کیسے کوئی آپ پہ حملہ کر سکتا ہے۔" وہ ڈرائیو کرتے ہوئے برہمی سے کہہ رہا تھا۔ اس نے پہلی دفعہ کیف کو غصے میں دیکھا تھا۔

"جیسے وہ میرے گھر میں خون پھنکواتا ہے۔ ایسے ہی وہ مجھ پہ حملہ بھی کر سکتا ہے۔"

"اس نے اپنا چہرہ نہیں ڈھانپا ہوا تھا، اس لیے میرا نہیں خیال کہ وہ آپ کا تعاقب کا رتھا۔ کوئی کرائے کا آدمی ہوگا۔ مگر اس نے ایسا کیوں کیا؟" وہ سوچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "ایک منٹ اپنا پرس چیک کریں۔ کچھ مسنگ تو نہیں ہے۔"

اس کا ذہن ابھی تک شل تھا۔ وہ جو اتنے عرصے سے صرف ایک وہم لگتا تھا، وہ آج حقیقت بن کے سامنے آ گیا تھا۔ ایسے میں اسے پرس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

اس نے پرس کھولا اور اندر سے ایک ایک چیز نکال کے دیکھنے لگی۔ موبائل۔ بینک کارڈز۔ کیش۔ سب ویسا ہی تھا۔

البتہ ایک چیز وہاں ایسی بھی تھی جو اس کی نہیں

''اس نے میرے بیگ میں کچھ رکھا ہے۔'' وہ تعجب سے بولی تو کیف نے بیک ویو مرر کا رخ ٹھیک کیا اور اس کے عکس میں مالا کو دیکھا۔ وہ ایک سلور رنگ کا لائٹر الٹ پلٹ کے دیکھ رہی تھی۔

''کوئی میرے بیگ میں سگریٹ لائٹر کیوں رکھے گا؟''

''مجھے دکھائیں۔ کوئی ریکارڈنگ ڈیوائس بھی ہوسکتی ہیں۔''

لیکن وہ نہیں سن رہی تھی۔ وہ لائٹر کی نچلی سائیڈ کو اوپر اٹھائے کچھ دیکھ رہی تھی۔

''وہ مجھے اپنا نام بتانا چاہتا ہے۔'' وہ تلخی سے مسکرائی۔ ''لائٹر پہ اس کا نام لکھا ہے۔''

''واقعی؟'' کیف کو حیرت ہوئی۔ موڑ کاٹتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا لکھا ہے؟''

کشمالہ نے لائٹر پہ لکھے دو الفاظ پڑھے۔

''ماہر فرید۔''

اس نے ایک جھٹکے سے بریک لگائی۔ کار کے ٹائر چرچرائے۔

''آرام سے کیف۔''

لیکن وہ تیزی سے پیچھے گھوما اور لائٹر اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر اسے اونچا اٹھا کے دیکھا۔

اس پہ واقعی انگریزی میں لیزر انگریونگ سے ماہر فرید لکھا تھا۔

کیف کا حلق خشک ہونے لگا۔ (ناممکن)

''بال آخر مجھے میرے تعاقب کار کا نام معلوم ہوگیا ہے۔''

کیف نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ گلابی سا ہو رہا تھا۔ سبز آنکھوں میں الجھن تھی۔ ناسمجھی تھی۔

اس نے بہت سا تھوک خشک گلے سے نیچے اتارا۔

''آپ کسی ماہر فرید کو جانتی ہیں؟'' لہجہ سرسری بنایا۔

''اس نے میرے بیگ میں کچھ رکھا ہے۔'' وہ تعجب سے بولی تو کیف نے بیک ویو مرر کا رخ ٹھیک کیا اور اس کے عکس میں مالا کو دیکھا۔ وہ ایک سلور رنگ کا لائٹر الٹ پلٹ کے دیکھ رہی تھی۔

''کوئی میرے بیگ میں سگریٹ لائٹر کیوں رکھے گا؟''

''مجھے دکھائیں۔ کوئی ریکارڈنگ ڈیوائس بھی ہوسکتی ہیں۔''

لیکن وہ نہیں سن رہی تھی۔ وہ لائٹر کی نچلی سائیڈ کو اوپر اٹھائے کچھ دیکھ رہی تھی۔

''وہ مجھے اپنا نام بتانا چاہتا ہے۔'' وہ تلخی سے مسکرائی۔ ''لائٹر پہ اس کا نام لکھا ہے۔''

''واقعی؟'' کیف کو حیرت ہوئی۔ موڑ کاٹتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا لکھا ہے؟''

کشمالہ نے لائٹر پہ لکھے دو الفاظ پڑھے۔

''ماہر فرید۔''

اس نے ایک جھٹکے سے بریک لگائی۔ کار کے ٹائر چرچرائے۔

''آرام سے کیف۔''

لیکن وہ تیزی سے پیچھے گھوما اور لائٹر اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر اسے اونچا اٹھا کے دیکھا۔

اس پہ واقعی انگریزی میں لیزر انگریونگ سے ماہر فرید لکھا تھا۔

کیف کا حلق خشک ہونے لگا۔ (ناممکن)

''بال آخر مجھے میرے تعاقب کار کا نام معلوم ہوگیا ہے۔''

کیف نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ گلابی سا ہو رہا تھا۔ سبز آنکھوں میں الجھن تھی۔ ناسمجھی تھی۔

اس نے بہت سا تھوک خشک گلے سے نیچے اتارا۔

''آپ کسی ماہر فرید کو جانتی ہیں؟'' لہجہ سرسری بنایا۔

''میں یہ لائٹر رکھ لوں؟ اس کو چیک کرنا ہوگا۔ اندر کوئی ریکارڈنگ ڈیوائس نہ ہو۔''

کشمالہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ واپس کار اسٹارٹ کرنے لگا، البتہ اس کے چہرے کی رنگت اڑی اڑی سی تھی۔

گھر کے پورچ میں جب وہ گاڑی سے نکلی تو وہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ پریشان لگ رہا تھا۔

''صفورا تمہارے بارے میں غلط تھی۔ جو لوگ پیسے کے لالچی ہوتے ہیں' وہ گارڈز کو ٹپ نہیں دیتے۔''

وہ چونکا۔ اس حالت میں بھی وہ نوٹ کر گئی تھی۔ وہ پھیکا سا مسکرایا۔ ''آپ نے پیٹرول کے جو پیسے دیے تھے' اس میں سے دیا تھا۔''

اس کے جانے کے بعد کیف کے تاثرات بدلے۔ چہرے پہ برہمی در آئی۔ اس نے فون نکالا اور وائٹ ہیئر کی چیٹ کھولی۔

''تم میرے ساتھ کوئی ڈبل گیم کھیل رہے ہو؟ یہ حرکت تمہاری یا تمہارے آدمیوں کی ہے نا؟''

انگلیاں تیزی سے ٹائپ کر رہی تھیں۔ وہ شدید بے بسی محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

اس شام مبین منزل میں گہما گہمی کا عالم تھا۔ سب شادی میں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ معید کسی باتھ روم سے چلاتا اپنے کپڑے مانگ رہا تھا۔ ماں خود تخت پہ بیٹھی تھیں۔ بالوں میں صبح ہی ہیئر ڈائی لگایا تھا۔ سو اب وہ سفید نہیں گہرے بھورے لگ رہے تھے۔ گرے رنگ کا کامدار جوڑا پہنے' وہ کلائیوں میں سونے کے کنگن پہن رہی تھیں۔ لمبے بال کھلے تھے۔ بخت بی ان میں کنگھی پھیر رہی تھی۔

سامنے گاؤ تکیے پہ ان کا موبائل کھڑا رکھا تھا جس پہ یاہی نظر آ رہی تھی۔ وہ کچن کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی تھی۔ ایپرن پہنے' چھوٹے بالوں کی پونی

بجائے وہ پہنچوں پہ ہاتھ رکھے [illegible] نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"ائیر رنگز دکھائیں مجھے۔" کینیڈا سے حکم آیا۔

ماں نے چہرہ ترچھا کر کے ایک کان دکھایا۔ ماہی نے ماتھے کو چھوا۔

"اف ماں۔ یہ کیا انیس سو دس والے کانٹے پہن لیے ہیں۔ وہ گرے اسٹونز والے ٹاپس کہاں ہیں جو میں لبرٹی سے لائی تھی۔"

"کہاں رکھے ہیں؟" ماں سر جھکائے اپنے جیولری باکس میں سے ڈھونڈنے لگیں۔ ماہی کا حکم وہ نہیں ٹالا کرتی تھیں۔

"جیولری باکس کا سب سے نچلا خانہ دیکھیں۔" ماہی کو یاد تھا۔ اسے ماں کی ہر چیز یاد رہتی تھی۔

ٹاپس وہیں تھے۔ ماں نے انہیں نکال کے اونچا کیا۔ وہ واقعی بہت حسین تھے۔ سونے کے کانٹے اتار کے انہیں کانوں میں پہنا تو چہرے کا وقار مزید بڑھ گیا۔

"اچھا بتاؤ، شال کون سی لوں؟" وہ اپنی سمجھ دار بیٹی سے پوچھ رہی تھیں۔

"مالا سے کہیں، وائٹ والی شال نکال دے جس کا گرے بارڈر ہے۔" ماں نے مڑ کے دیکھا۔ مالا لاؤنج کی ایک کرسی پہ بیٹھی موبائل پہ لگی تھی۔ کھوئی کھوئی سی۔ جب سے وہ سیلون سے آئی تھی وہیں بیٹھی تھی۔

"مالا...... بیٹے! وہ وائٹ شال تو نکال دو۔ اور تم کب تیار ہو گی؟" پھر غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ سر میں درد ہے۔ میں شال نکالتی ہوں۔" وہ وہاں سے اٹھ گئی۔ اس نے کمرے میں پہلے سے وہی سفید شال نکال رکھی تھی لیکن ماں کو دی نہیں تھی۔ ماں اسے تب پہنیں گی جب ماہی کہے گی۔ ماں کو صرف ماہی کی چوائس پہ اعتبار تھا۔

ماہی یہاں ہوتی تھی تو فنکشنز وغیرہ پہ ماں کو خود تیار کرتی [illegible] کام کرواتی۔ ماں کے کپڑے حتیٰ کہ مالا کے بھی اکثر کپڑے ماہی لیا کرتی تھی۔ اس کو شوق تھا، دکانداروں سے لڑ لڑ کے قیمتیں کم کروانے کا۔ یہ ٹاپس بھی اس نے مالا کے ساتھ ہی لیے تھے۔ مالا کہتی رہی کہ اب چھوڑ دو۔ وہ پندرہ سو سے کم میں نہیں دے گا۔ لیکن ماہی بھی ڈٹی رہی۔ نہیں۔ یہ مجھے آٹھ سو میں دے گا۔ دیکھ لینا۔ اور پندرہ منٹ بعد ماہی وہ ٹاپس آٹھ سو میں لے کر ہی ہٹی تھی۔

شال ماں کو دینے آئی تو ماہی ویڈیو کال پہ کہہ رہی تھی۔

"فنکشن کی ساری تصویریں فوراً ہی مجھے بھیجنی ہیں آپ نے ماں۔ آپ کے باقی دونوں بچے ہر فنکشن میں مجھے بھول جاتے ہیں۔ ہائے کاش میں پاکستان میں ہوتی۔"

"اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں ہر حال میں ماہی۔" ماں نے ٹوکا۔ "شکر کرو، اللہ نے تمہیں شادی کے پانچ سال بعد خوشی دکھائی ہے۔ بس خوب کھاؤ پیو اور اپنا خیال رکھو۔ شادیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔"

"ہاں چھوٹی بی بی۔" بخت بی بی ماں کے کندھے کے پیچھے سے کال میں شامل ہوئی۔ وہ کینیڈا کی کال پہ اتنا اونچا بولتی تھی کہ جیسے آواز ہوا کے دوش پہ کینیڈا جاتی ہے۔ "تیری ماں نے بڑی دعائیں کی ہیں تیری گود ہری ہونے کے لیے۔ ہر وقت کہتی تھی اللہ میری ماہی کو بچہ دے۔ تو بس اپنا خیال رکھ۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ عباد کی نوکری نہ ہوتی تو میں کبھی کینیڈا نہ رہتی۔ بورنگ ٹھنڈا ملک۔" ماہی روہانسی ہو کے بولی۔ پھر کچھ یاد آیا۔ "شادی پہ کبیرہ تائی بھی ہوں گی نا۔"

ماں کے چہرے پہ ناپسندیدگی ابھری۔ سر جھکا کے تخت پہ بکھری اپنی چیزیں سمیٹنے لگیں۔ "پرے کرو اس کو۔ ہمیں کیا۔"

"دیکھنا آپ۔ وہ شادی پہ آئیں گی اور سارے رشتے دار آپ کو جلانے کے لیے ان کے

pklibrary.com

معید تیار ہو کے آ گیا تھا اور اب صوفے پہ بیٹھ کے جوتے پہن رہا تھا۔ منہ میں بڑبڑایا۔

''لاہور اور اس کے مضافات میں غیبتوں کا وقت ہوا چاہتا ہے۔''

ماہی اس بات کا کرارا سا جواب دیتی لیکن اسے کچھ نظر آیا تھا۔ اسکرین پہ چہرہ قریب کیا اور تفتیشی انداز میں سوال کیا۔

''یہ باہر لان میں کون ہے؟'' ماہی کی تیز نظریں ماں کے پیچھے کھڑکی پہ جمی تھیں۔

ماں نے ایک نظر کھڑکی کو دیکھا جہاں لان میں موبائل پہ لگا کیف ٹہلتا نظر آ رہا تھا۔

''اپنی بہن سے پوچھو۔ وہی ساتھ لائی ہے۔''

ماں نے مالا کو فون پکڑا دیا اور خود گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھیں۔ ان کا رخ کمرے کی جانب تھا۔ ابھی انہوں نے جوتے پہننے تھے۔

''میرا ڈرائیور ہے۔ اور اسسٹنٹ بھی۔'' مالا نے فون تھام لیا۔ ماہی بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

''ذرا قریب سے دکھاؤ اس کی شکل۔'' ماہی کی آنکھوں میں شرارت ابھری۔ اپنے سامنے لاؤنج میں کام کرتے ہوئے عباد کو دیکھ کے اونچا سا بولی۔ ''بڑا عرصہ ہو گیا، کوئی ہینڈسم آدمی نہیں دیکھا۔''

عباد پہ اثر نہیں ہوا۔ لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹائے بغیر بولا۔

''آئینہ دیکھ لو۔ خود بھی تم کسی مرد سے کم نہیں لگ رہیں۔''

ماہی کی ہنسی غائب ہوئی۔ چہرہ سرخ ہوا۔

''سنو۔ تم لوگ شادی اٹینڈ کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

برٹش کولمبیا میں اب جنگ عظیم چھڑنے والی تھی۔

☆☆☆

نکاح کا ہال سفید اور سبز رنگ میں سجا تھا۔ اونچی چھت سے جگہ جگہ فانوس لٹک رہے تھے۔ اسٹیج

معید تیار ہو کے آ گیا تھا اور اب صوفے پہ بیٹھ کے جوتے پہن رہا تھا۔ منہ میں بڑبڑایا۔

''لاہور اور اس کے مضافات میں غیبتوں کا وقت ہوا چاہتا ہے۔''

ماہی اس بات کا کرارا سا جواب دیتی لیکن اسے کچھ نظر آیا تھا۔ اسکرین پہ چہرہ قریب کیا اور تفتیشی انداز میں سوال کیا۔

''یہ باہر لان میں کون ہے؟'' ماہی کی تیز نظریں ماں کے پیچھے کھڑکی پہ جمی تھیں۔

ماں نے ایک نظر کھڑکی کو دیکھا جہاں لان میں موبائل پہ لگا کیف ٹہلتا نظر آ رہا تھا۔

''اپنی بہن سے پوچھو۔ وہی ساتھ لائی ہے۔''

ماں نے مالا کو فون پکڑا دیا اور خود گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھیں۔ ان کا رخ کمرے کی جانب تھا۔ ابھی انہوں نے جوتے پہننے تھے۔

''میرا ڈرائیور ہے۔ اور اسسٹنٹ بھی۔'' مالا نے فون تھام لیا۔ ماہی بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

''ذرا قریب سے دکھاؤ اس کی شکل۔'' ماہی کی آنکھوں میں شرارت ابھری۔ اپنے سامنے لاؤنج میں کام کرتے ہوئے عباد کو دیکھ کے اونچا سا بولی۔ ''بڑا عرصہ ہو گیا، کوئی ہینڈسم آدمی نہیں دیکھا۔''

عباد پہ اثر نہیں ہوا۔ لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹائے بغیر بولا۔

''آئینہ دیکھ لو۔ خود بھی تم کسی مرد سے کم نہیں لگ رہیں۔''

ماہی کی ہنسی غائب ہوئی۔ چہرہ سرخ ہوا۔

''سنو۔ تم لوگ شادی اٹینڈ کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

برٹش کولمبیا میں اب جنگ عظیم چھڑنے والی تھی۔

☆☆☆

نکاح کا ہال سفید اور سبز رنگ میں سجا تھا۔ اونچی چھت سے جگہ جگہ فانوس لٹک رہے تھے۔ اسٹیج

مہمانوں کے لیے میزوں کے گرد رکھے صوفے بھی سفید تھے۔

وہ ماں کے ساتھ ایک تھری سیٹر صوفے پہ بیٹھی تھی۔ ماں چند رشتے دار خواتین سے باتوں میں مصروف تھیں۔ معید ہم عمر کزنز کی طرف چلا گیا تھا لیکن وہ خود کو یہاں زیادہ محفوظ تصور کر رہی تھی۔ اگر وہ کزنز میں گئی تو سب کی زبان پہ ایک ہی سوال ہونا تھا۔ اوشن بند کیوں ہو گیا؟ اور کیا اب وہ جاب لیس ہو گئی ہے؟ اور اس وقت وہ اس سوال کا سامنا کر کے موڈ نہیں خراب کرنا چاہتی تھی۔

ویسے بھی ایسے ماں پہ نظر رکھنی تھی۔ ان کی شوگر کنٹرول میں نہیں تھی۔ اور شادیوں پہ تو وہ کچھ زیادہ ہی دل کھول کے کھاتی تھیں۔ معید ان کی شوگر کا اتنا دھیان نہیں رکھتا تھا کہ وہ گھر ہی کب ہوتا تھا۔ لیکن آج وہ دیکھے گی کہ ماں کیسے میٹھا کھاتی ہیں۔

ماں ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ شال ایک کندھے پہ تھی۔ شفون کا گرے ڈوپٹہ سر پہ تھا۔ وہ ہلکے کاجل اور لپ اسٹک کے ساتھ بہت باوقار لگ رہی تھیں۔ کسی کو اپنے گھٹنوں کے درد کا بتا رہی تھیں اور رشتے دار خاتون ان کو کوئی دیسی ٹوٹکا بتا رہی تھیں جو ان کے میاں نے فیس بک پہ پڑھا تھا۔

واقعی۔ حور جہاں جیسی خوبصورتی اسے، ماہی یا معید کو نہیں ملی تھی۔ ''ناٹ فیئر 'اللہ تعالیٰ۔'' آسمان کو شاکی نظروں سے دیکھا۔

''حورے بھابھی... آپ گھٹنوں کا آپریشن کروا ہی لیں۔ میں نے خود کروایا ہے۔ سمجھو نئی زندگی مل گئی ہے۔'' خاتون نے مشورہ دیا۔ ماں کا نام حور جہاں تھا۔ حور کے نیچے زیر تھی۔ (اسے حورے جہاں پڑھتے تھے) اسی لیے بہت سے رشتے دار ان کو اب بھی حورے کہتے تھے۔

''نہ بابا نہ۔ میں نے نہیں آپریشن کروانا۔'' ماں نے ناک سے مکھی اڑائی۔ ''انسان کبھی پیچھے کو نہیں پلٹ سکتا۔ اب جیسے ہیں گھٹنے ویسے ٹھیک

ہیں۔"

"ماں۔" اس نے ماں کے قریب سرگوشی کی۔ "آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے نا کہ آپ میٹھا نہیں کھائیں گی۔ آج صبح آپ کی فاسٹنگ شوگر ایک سو چالیس تھی۔" نرمی سے تنبیہہ کی۔

ماں دوسری جانب جھک کے ان خاتون سے کسی بہت اہم موضوع پہ بات کرنے لگیں۔ یوں ظاہر کیا جیسے مالا کی بات سنی ہی نہ ہو۔

دفعتاً ساتھ بیٹھی ممانی کسی کو دیکھ کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کشمالہ نے نظریں اوپر اٹھائیں۔

سامنے نگینہ آنٹی کھڑی تھیں۔ وہ جو اس روز اسلام آباد میں اپنے بیٹے کے ساتھ ماموں کے پورشن میں آئی تھیں۔ انہوں نے سفید سلک کا ڈریس پہن رکھا تھا۔ سر پہ دوپٹہ تھا۔ وہ مسکرا کے پہلے ممانی سے ملیں۔ پھر ماں سے۔ ماں ان کو دیکھ کے خوش ہوئیں۔ اپنے پاس صوفے پہ جگہ دی۔

"تم کب آئیں دبئی سے؟"

"زیاد اور میں پچھلے ہفتے آئے ہیں۔ اتنے عرصے بعد کسی خاندان کی شادی میں شرکت کر رہے ہیں۔ یہ کون سی والی بیٹی ہے تمہاری ماشاءاللہ سے؟" انہوں نے مسکرا کے مالا کی طرف دیکھا تو وہ بھی مسکرا دی۔

"میں کشمالہ ہوں۔ مجھ سے چھوٹی ماہی کینیڈا ہوتی ہے۔"

"ارے ہاں۔ تم تو اسلام آباد ہوتی ہو نا۔ ہم تمہارے ماموں کی طرف گئے تھے اس دن۔" نگینہ آنٹی نے ممانی کو دیکھ کے کہا۔ "پتا چلا تم سو رہی ہو۔ ورنہ ضرور ملاقات ہوتی۔"

"جی مجھے پتا چلا تھا۔" وہ مسکرا کے بولی۔

"زیاد کیسا ہے؟ کیا کر رہا ہے آج کل؟" ماں رسماً نگینہ بیگم سے پوچھنے لگیں۔

"زیاد رائٹر ہے۔ کتابیں لکھتا ہے۔ ساتھ ایک ڈیجیٹل مارکیٹنگ فرم میں بہت اچھی جاب بھی کر رہا ہے۔ مگر بڑے عرصے سے کچھ لکھا نہیں۔" کہتے ہوئے نگینہ آنٹی کی آواز میں اداسی گھل گئی۔

مالا کی متلاشی نظریں سارے میں گھومیں۔ اور پھر وہ اسے نظر آ ہی گیا۔ وہ کچھ مردوں کے ایک گروپ کے ساتھ کھڑا تھا۔ ٹال، ڈارک اینڈ ہینڈسم۔ سیاہ بالوں کو جیل سے پیچھے کیے وہ دوسرے گزنز کی طرح کرتے شلوار میں ملبوس تھا۔

اس وقت وہ سنجیدگی سے کسی کی بات کا جواب دے رہا تھا۔ دن کی روشنی میں زیادہ جاذب نظر تھا۔

"اس کی منگنی کی تھی تم نے کچھ عرصہ پہلے۔ کوئی مسئلہ ہوا تھا پھر۔" ماں کو یاد آیا۔

بظاہر دوسری طرف دیکھتی کشمالہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

"بس بھابھی۔ کیا بتاؤں۔ اس کی منگیتر کی ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہو گئی۔ وہ زیاد کی اپنی پسند تھی۔ اس نے دل پہ بہت بوجھ لے لیا ہے۔ ڈیڑھ سال ہو گیا ہے اس بات کو۔ اب میرا بیٹا شادی کا نام ہی نہیں لیتا۔" نگینہ بیگم دور نظر آتے اپنے بیٹے کو دیکھ کے اداسی سے بولیں۔ ماں بھی افسوس سے خاموش ہو گئیں۔

"حورے بھابھی۔ آپ اتنی نیک ہیں۔" انہوں نے ماں کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھا۔ "آپ میرے زیاد کے لیے دعا کیا کریں کہ وہ اس ٹراما سے نکل آئے اور نئی زندگی شروع کرے۔"

"کیوں نہیں نگینہ۔ میں ضرور دعا کروں گی۔" ماں نے خلوص دل سے کہا۔

ایک بلند آواز کانوں میں پڑی تو کشمالہ نے چونک کے نظریں گھمائیں۔ سبزہ زار کی انٹرنس پہ ایک اونچا نسوانی قہقہہ گونجا تھا۔ یہ اس بات کا غماز تھا کہ کبیرہ بیگم پہنچ چکی تھیں۔

یہ طے تھا کہ وہ ہر فنکشن پہ جان بوجھ کے دیر سے آتی تھیں تاکہ ہر نظر ان کی طرف اٹھے۔ اور واقعی وہ اتنی خوبصورت تھیں کہ ایسا ہی ہوتا تھا۔

آج بھی وہ داخلی دروازے پہ چند خواتین کے جمگھٹے میں کھڑی اونچے قہقہے لگاتے ہوئے سب کی

pklibrary.com

ملبوس تھیں۔ کانوں اور گردن میں چمکتے ہوئے ڈائمنڈز پہن رکھے تھے۔ بال بوائے کٹ میں کٹے تھے۔ (اگر لمبے رکھتیں تو زیادہ خوبصورت لگتیں لیکن وہ جانتی تھی کہ تائی بال چھوٹے کیوں رکھتی ہیں۔ اس کی بھی ایک مضحکہ خیز سی وجہ تھی)

اب وہ چلتی ہوئی باری باری مہمانوں سے ملتی جارہی تھیں۔ اپنی طرف بڑھتے ہاتھوں کو غرور سے ذرا سا ملا کے چھوڑ دیتیں۔

ممانی ان رشتے داروں میں سے تھیں جن کی کبیرہ تائی سے بہت بنتی تھی۔ وہ ان کو دیکھ کے اٹھ کھڑی ہوئیں اور نگینہ سے بولیں۔ ”آپ نے نہیں ملنا کبیرہ سے؟“

”نہیں تابندہ! میرا کبیرہ سے کوئی رشتہ نہیں۔ البتہ میرا حور جہاں بھابھی سے رشتہ ہے۔ اگر کبیرہ حور جہاں بھابھی سے ملے خود نہیں آسکتی تو میں کیوں جا کے اس سے ملوں۔“ پھر چہرہ موڑ کے ماں کو دیکھا۔ ”ہاں تو آپ کیا کہہ رہی تھیں.....“

سادہ۔ دوٹوک انداز۔ ممانی پہ تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ کشمالہ اندر ہی اندر مسکرادی۔ کوئی تو رشتے دار تھا جو ماں کا ساتھ دے رہا تھا۔ ورنہ سب کبیرہ کی دولت کی چمک دمک سے اتنے متاثر تھے کہ ان کے گرد مکھیوں کی طرح بھنبھناتے تھے۔

ماہی کے میسجز آرہے تھے۔ تصویریں بھیجو۔ اس کے فون کی بیٹری کم تھی اور وہ بیٹری پیک کار میں بھول آئی تھی۔ اس نے کیف کو کال کی اور اسے بیٹری پیک لانے کو کہا۔

•

کیف جب سفید پھولوں سے سجے وسیع ہال میں آیا تو وہ اسے سامنے ہی نظر آ گئی۔ صوفوں پہ خواتین کے ایک گروپ میں بیٹھی وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بس مسکراتے ہوئے سب کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے آف وائٹ کام دار ڈریس پہن رکھا تھا۔ بال چہرے کے ایک طرف ڈالے ہوئے تھے۔ کانوں میں بڑے بڑے سلور جھمکے نظر آرہے تھے۔

اس کا چہرہ سادہ تھا۔ جلد اعتبار کرنے والا۔ آنکھیں ذہین تھیں لیکن چالاک نہ تھیں۔ ایسی آنکھیں جو مہربان ہوتی ہیں۔ شک نہیں کرتیں۔ انتقام نہیں لیتیں۔ وہ لوگوں کی اچھائی پہ نظر رکھتی ہیں۔

اور وہ ایسی لڑکی کو دھوکا دے رہا تھا۔ کیف کے چہرے پہ کرب ابھرا۔ اس کا دل برا ہونے لگا۔

ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کہ وہ اسے ایک کونے میں لے جائے۔ اور اس کو بتائے کہ اس سے بڑی غلطی ہوگئی تھی۔ وہ جھوٹ اور دھوکے کے ساتھ مالا کی زندگی میں شامل ہوا تھا۔ اب بھی وقت تھا۔ وہ سب کچھ کلیئر کرسکتا تھا۔ اس سے معافی مانگ سکتا تھا۔ وہ اس مہربان لڑکی کو بتانا چاہتا تھا کہ کسی کے پاس اس کی تصویر ہے اور وہ اسے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اور وہ کوئی عام شخص نہیں ہے۔ وہ ایک سائیکو پیتھ ہے۔ کوئی عام شخص ایسی البم نہیں بناتا۔

مالا نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ صوفے سے اٹھ کے اس کی طرف آ گئی۔ کیف نے بیٹری پیک اس کی طرف بڑھادیا۔ بولا کچھ نہیں۔ وہ یہ سب اسے نہیں بتا سکتا تھا۔ اس کی اپنی مجبوریاں تھیں۔

سچ بولنا جھوٹ بولنے سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔

”تھینک یو کیف۔“ وہ بیٹری پیک پکڑتے ہوئے مسکرائی۔ وہ دونوں ایک پھولدار ستون کے ساتھ آمنے سامنے کھڑے تھے۔

”میں سیلون گیا تھا۔ میں نے آپ کا نام نہیں لیا۔ جم کے کیمرے کا رزلٹ بہت مدھم تھا۔ آپ کے بتائے حلیے کا شخص لفٹ میں سوار ہوا تھا اور واپس جم میں ہی اتر گیا تھا۔ لیکن اس کی شکل واضح نہیں ہے۔ میں نے فوٹیج آپ کو ای میل کی ہے۔“

”کیا فائدہ؟ میں اس کو نہیں پہچانتی تھی۔“

”آر یو شیور آپ کسی ماہر فرید کو نہیں جانتیں؟“ اس نے لہجے کو سرسری سا بنایا۔ کشمالہ نے کندھے اچکادیے۔

”جو آج ہوا ہے وہ اچھا نہیں ہوا۔ یہ دوبارہ

بھی ہوسکتا ہے۔ پولیس تک آپ نہیں جانا چاہتیں۔ اس لیے آئندہ آپ میرے بغیر کہیں نہیں جائیں گی۔ میں قریب رہوں گا۔"

کیف اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ آپ نے مجھے سب کچھ نہیں بتایا۔ آپ پولیس تک کیوں نہیں جانا چاہتیں؟ کچھ ہے جو آپ اپنے تعاقب کار کے بارے میں جانتی ہیں۔" آواز دھیمی کی۔ "دیکھیں۔ میں آپ کا باڈی گارڈ ہوں۔ آپ کو مجھ پہ اعتبار کرنا ہوگا۔ اگر آپ کچھ بھی اور جانتی ہیں تو مجھے بتادیں۔ کچھ بھی ایسا جو ابھی تک آپ نے مجھے نہیں بتایا۔"

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک قدم آگے ہوئی۔ فنکشن کے شور اور ہنگامے میں ان کی آواز دور نہیں جاسکتی تھی۔ کشمالہ نے آواز سرگوشی میں بدل دی۔

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ایک آدمی کے پاس میری ایک تصویر ہے۔ اس تصویر کی بیک پہ لکھا ہے حورِ جہاں کی بیٹی کشمالہ۔ اور وہ آدمی مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔" کشمالہ سرگوشی کرکے پیچھے ہوگئی۔

اور کیف کے لیے ایک دم ساری دنیا برف ہوگئی۔ وہ جہاں تھا وہیں جم گیا۔ ٹھنڈا اور ساکت۔

"آپ یہ کیسے جانتی ہیں؟ اور کون آدمی ہے وہ؟" وہ بدقت بول پایا۔

کشمالہ گردن موڑ کے دوسری جانب دیکھنے لگی۔ "میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی۔" وہ واپس صوفوں کی طرف چلی گئی۔

وہ برف کا مجسمہ بنا وہیں کھڑا رہ گیا۔

وہ کس کھیل کا حصہ بن گیا تھا؟ یہاں سب اس سے زیادہ جانتے تھے۔

ماں گھٹنوں کی وجہ سے اٹھ نہیں سکتی تھیں اس لیے وہ کھانا لگنے پہ بفے ٹیبل پہ چلی آئی تاکہ ماں کے لیے کھانا ڈال سکے۔ شادیوں کا مزہ ماہی کے ساتھ آتا تھا۔ تصویریں بنانا' اپنی میز پہ بیٹھ کے لوگوں اور کھانے پہ تبصرے کرنا۔ کس نے کیا پہنا ہے ڈس کس کرنا۔ ماہی کے بغیر سارے فنکشنز بے رونق تھے۔

وہ پلیٹ میں کھانا ڈال رہی تھی جب عقب میں نگینہ آنٹی کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے کچھ کہتے ہوئے پلیٹ اٹھا رہی تھیں۔ مالا کا سارا وجود کان بن گیا۔ بظاہر وہ سر جھکائے کھانا نکالتی رہی۔ پھر پلٹی تو دیکھا' نگینہ آنٹی کے ساتھ ان کا بیٹا تھا جسے وہ کوئی ہدایت دے رہی تھیں۔ انہوں نے بھی اسی وقت اسے دیکھا۔ اسے دیکھ کے مسکرادیں۔ پھر جیسے خیال آیا۔

"کشمالہ... تم زیاد سے ملی ہو؟"

اس نے زیاد کو دیکھا اور زیاد نے اس کو۔ یہ وہی تھا۔ بھورے کرتے والا۔ ٹال' ڈارک اینڈ ہینڈسم۔ چہرے پہ سادگی اور مسکراہٹ تھی۔ ایک تو کچھ مردوں کو اتنا اچھا لگنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

بظاہر رسمی انداز میں مسکرائی۔ "کیسے ہیں آپ؟ خوشی ہوئی آپ سے مل کے۔"

"مجھے بھی۔" پھر ماں کو دیکھا۔ "ہم ان ہی کے گھر گئے تھے نا؟" جیسے یاد کروایا۔ وہ آہستہ بولتا تھا۔ نرمی اور شائستگی سے۔

"وہ ان کے ماموں کا گھر تھا۔ لیکن کشمالہ وہیں رہتی ہے۔"

زیاد نے ہوں کہہ کے سر ہلادیا۔ گفتگو دم توڑ گئی۔ وہاں کھڑا رہنا آکورڈ لگتا تھا۔ وہ ان سے معذرت کرکے ماں کی پلیٹ لیے میز پہ واپس آگئی۔ کھانا کھل چکا تھا اور سب اس وقت کھانے میں مگن تھے۔ اس نے ماں کے سامنے پلیٹ رکھی۔

انہوں نے ایک اچٹتی نگاہ پلیٹ میں موجود لوازمات پہ ڈالی۔ جیسے دلچسپی نہ ہو۔ پھر چہرہ ادھر ادھر گھمایا۔ کیف ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ ماں نے دور سے اسے اشارہ کیا۔

"لڑکے...... ادھر آؤ۔" تحکم سے دو انگلیوں سے بلایا۔

pklibrary.com

کیف فوراً اس طرف آیا۔
"پہلے بتاؤ، تم کون ہو؟ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔" ماں نے سر سے پیر تک اسے گھورا۔
کیف نے بے اختیار مالا کو دیکھا۔ پھر ماں کو۔
"میں کشمالہ بی بی کا ڈرائیور ہوں۔ کیف جمال۔"
"جو بھی ہو...... وہ پیچھے دیکھو، ٹیبل پہ سفید رنگ کی کیا چیز رکھی ہے۔"
"وہ سفید رنگ کی چیز ڈیزرٹ ہے ماں۔ اور آپ وہ نہیں کھا سکتیں۔" وہ دھیمی مگر سخت آواز میں بولی۔
ماں نے اسے گھور کے دیکھا۔ "میری ماں نہ بنو۔" پھر ان ہی خشمگیں نظروں سے کیف کو دیکھا۔
"جاؤ۔ لے کر آؤ۔"
اس نے فوراً کشمالہ کو دیکھا۔ جس نے نفی میں گردن ہلائی۔ کیف نے ماں کو دیکھا۔ وہ اب کے سختی سے بولیں۔
"آواز نہیں آئی؟ لے کر آؤ۔"
"جی اوکے۔" وہ فوراً سے پلٹ گیا۔ کشمالہ نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔
"ماں آپ کو شوگر ہے یار۔ نہ کریں ایسے۔"
ماں نے تو یوں ظاہر کیا جیسے سنا ہی نہیں ہے۔
کیف نے ڈش سامنے لا کے سرو کی تو انہوں نے جی بھر کے میٹھا ڈالا۔
"اچھا، تھوڑا کم کر دیں۔" اس نے ہاتھ ان کے پیالے کی طرف بڑھایا تو ماں نے اس کے ہاتھ پہ چمچہ مارا۔
"میں نے کہا نا، میری ماں نہ بنو۔ جاؤ یہاں سے۔"
وہ خفگی سے اٹھ گئی۔ پھر کیف کی طرف آئی۔ غصے سے اسے دیکھا۔
"تمہیں کس نے کہا تھا ڈیزرٹ لے آؤ؟"
"میں کیا کرتا؟ آنٹی غصہ کر رہی تھیں۔"
[illegible] وہ۔ [illegible] جا

سکتیں نا۔ ان کی فاسٹنگ ایک سو چالیس تھی صبح۔ حد ہے یار۔" وہ جھنجلائی ہوئی لگ رہی تھی۔
"باس......" وہ ہلکا سا کھنکھارا۔ "آنٹی نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں۔ وہ کل سے مجھ سے تین دفعہ یہی سوال پوچھ چکی ہیں۔"
"ماں کی عادت ہے مذاق کرنے کی۔ اب ان کو کچھ میٹھا نہیں دینا۔ اوکے۔" وہ تنبیہہ کر کے آگے بڑھ گئی۔ وہ بس اسے جاتے دیکھتا رہا۔
اس کا موڈ ماں کی اس حرکت پہ خراب ہو گیا تھا۔ وہ ایسے ہی بددلی سے سینے پہ بازو لپیٹے بوفے ٹیبل کے ساتھ کے کھڑی ہو گئی۔ اکثریت کھانا نکال چکی تھی اس لیے یہاں رش کم تھا۔
تب ہی قریب میں کوئی کھنکھارا۔ "آپ کھانا نہیں کھا رہیں۔"
وہ چونکی۔ پھر سنبھلی۔ چہرے کے زاویے درست کیے۔
وہ زیاد تھا۔ ہاتھ میں پلیٹ لیے اس کے قریب آ رہا تھا۔ تشویش سے اسے دیکھا۔ پھر گردن موڑ کے اس میز کو جہاں ماں بیٹھی مزے سے میٹھا کھا رہی تھیں۔ زیاد ہلکا سا ہنس دیا۔
"اچھا۔ آپ کی بھی اپنی امی سے یہی لڑائی چلتی رہتی ہے۔"
کشمالہ نے افسوس سے ماں کی طرف دیکھا۔
"میں ان کی گھٹنے کی سرجری کروانا چاہتی ہوں۔ شوگر کنٹرول نہیں ہو گی تو سرجری کیسے ہو گی۔"
"اس کا ایک حل ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔
پھر اپنی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔ "دو منٹ یہ پکڑیں۔"
کشمالہ نے ناسمجھی کے انداز میں پلیٹ پکڑی۔ زیاد گھوم کے بوفے ٹیبل کے دوسری طرف گیا، ایک پیالہ چمچہ اٹھایا اور واپس آیا۔ اب وہ ڈش سے میٹھا پیالے میں نکال رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔
"اس کا حل یہ ہے کہ آپ پریشان نہ ہوں اور
[illegible]
کچھ کھا لیں۔" وہ پیالہ لے کر مسکراتا ہوا اس کے

سامنے آیا۔ اسے پیالہ تھمایا اور اپنی پلیٹ واپس لی۔
''تھینک یو۔ مگر میں میٹھا نہیں کھاتی۔'' اس نے پیالہ رکھا نہیں۔ پکڑے کھڑی رہی۔ لیکن اسے میٹھا نہیں پسند تھا۔ سو یہ طے تھا کہ وہ نہیں کھائے گی۔
''اچھا؟'' وہ حیران ہوا۔ اپنی پلیٹ سے چاولوں کا چمچہ بھرا۔ ''اس دن تو آپ ٹیرس پہ براؤنیز کھا رہی تھیں۔''
(اف... اس نے اسے دیکھ لیا تھا۔)
''اچھا؟ مجھے یاد نہیں۔'' کندھے بے نیازی سے اچکا دیے۔ پھر بات بدلنے کو بولی۔
''آپ کیا لکھ رہے ہیں آج کل؟''
زیاد نے گہری سانس لے کر سر جھکا دیا۔ وہ چمچے سے چاول ادھر ادھر مکس کرنے لگا۔
''میں آج کل رائٹرز بلاک کا شکار ہوں۔ پاکستان آیا تھا کہ یہاں بیٹھ کے شاید کچھ لکھ سکوں۔ لیکن نہیں لکھ پا رہا۔''
''کیا لکھنا چاہ رہے ہیں آپ؟''
زیاد نے آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔
''وہی جو سب شوق سے پڑھتے ہیں۔ ایک عظیم لو اسٹوری۔''
اس نے دیکھا' زیاد سلطان کی آنکھیں اداس تھیں۔ ایسی آنکھیں جن کو محبت کے ہیپی اینڈنگ پہ بھروسا نہیں ہوتا۔ اسے نگینہ آنٹی کی باتیں یاد آئیں۔
''آپ کی سپر پاور کیا ہے؟''
''میری سپر پاور؟'' وہ حیران ہوا۔
''ہاں نا۔ ہر شخص کی ایک سپر پاور ہوتی ہے۔ آپ کس چیز میں اچھے ہیں؟ اگر آپ لو اسٹوری لکھنے کے بجائے وہ لکھیں جس میں آپ اچھے ہیں تو آپ کا یہ بلاک ختم ہو جائے گا۔''
''ہوں۔'' وہ مسکراہٹ دبائے سوچنے لگا۔ پھر اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ ''میں رائٹر ہوں۔ اور میرا مشاہدہ اچھا ہے۔ میں وہ نوٹ کرتا ہوں جو کوئی اور نوٹ نہیں کرتا۔''
''میں کیسے مان لوں؟''
''آزما کے دیکھ لیں۔''
''اچھا؟'' وہ اس کے چیلنج پہ مسکرائی۔ ''یہ جو سامنے لڑکی جا رہی ہے۔ اس کے بارے میں کچھ بتائیں۔''
نگاہوں سے اسٹیج کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں عزہ کی بہن ویٹرز کو ہدایات دیتی نظر آ رہی تھی۔ زیاد نے اس طرف دیکھا۔
''اس کے پیر میں ہائی ہیلز کی وجہ سے درد ہے اور وہ شدید ان کمفرٹیبل ہے۔'' پھر زیاد نے چہرہ گھما کے اگلا ہدف ڈھونڈا۔ ''وہ ویٹر جو ٹرے اٹھائے جا رہا ہے' اس کی ابھی ابھی بے عزتی کی گئی ہے کیونکہ اس کے کان اور گال سرخ ہو رہے ہیں۔''
''آپ خود سے بنا رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں' میں ان باتوں کی تصدیق نہیں کر سکتی۔''
''نہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مثلاً آپ.....'' اس نے ایک نظر غور سے کشمالہ کو دیکھا۔ اس کو اپنے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوتی محسوس ہوئی۔ کوئی سحر سا تھا اس شخص کی آنکھوں میں۔
''آپ کے بارے میں کچھ بتاؤں؟''
''بتائیں۔'' لیکن وہ اندر سے خائف ہوئی۔ کہیں وہ جان نہ لے کہ وہ اس سے کتنا متاثر ہو رہی ہے۔
''آپ کی گردن یا سر کے پچھلے حصے میں درد ہے۔ آپ گردن اس طرف نہیں موڑ رہیں اور بار بار ہاتھ سے پیچھے دبا رہی ہیں۔''
وہ جھینپ کے ہنس دی۔ ہاتھ نیچے کیا۔
''اوکے مان لیا۔'' تسلیم کرنے کے انداز میں سر ہلایا۔
''تھینک یو۔'' زیاد کے چہرے پہ حیران سی ممنونیت تھی۔ ''آپ کی اس نصیحت نے میری مدد کی ہے۔ شاید مجھے وہ نہیں لکھنا جو مجھ سے میری ایڈیٹر لکھوانا چاہتی ہے۔ بلکہ مجھے وہ لکھنا چاہیے جو میں انجوائے کروں گا۔''

...آگے بڑھ گئی۔
دور کسی سے بات کرتی کبیرہ بیگم نے غور سے ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ صبح بخت بی کے رونے کی آوازوں سے اٹھی۔ پہلے کچھ دیر تو بستر میں لیٹی پلکیں جھپک جھپک کے چھت کو دیکھے گئی۔ جب سے کام کرنا چھوڑا تھا' دن رات کا کوئی حساب نہیں تھا۔ ایک عجیب سی مایوسی ذہن پہ چھائی تھی۔ کام کرنے والی لڑکی کے لیے فارغ گھر بیٹھنا بہت مشکل تھا۔ خیر۔ آج وہ اپنے بزنس پلان پہ کام شروع کرے گی۔ ایک آئیڈیا آیا تھا اس کے ذہن میں۔

وہ بالوں کو جوڑے میں لپیٹتی باہر آئی تو بخت بی آنسو بہاتے ہوئے حور جہاں بیگم کو اپنی بیٹی کا قصہ سنا رہی تھی۔ وہی روایتی کہانی۔ شوہر کام نہیں کرتا۔ نشہ کرتا ہے۔ سارا دن گھر میں پڑا رہتا ہے۔ اور بیٹی کو مارتا ہے۔

''بخت بی۔'' اس نے پیچھے سے بخت بی کے دونوں کندھوں پہ ہاتھ رکھا اور سر جھکا کے نرمی سے تسلی دی۔ ''آپ اپنی بیٹی سے کہیں کہ وہ اسٹینڈ لے۔ ہم اس کے ساتھ ہیں۔''

بخت بی نے اپنا سانولا کھردرا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ ''وہ ڈرتی ہے جی۔''

مالا سیدھی کھڑی ہوئی اور افسوس سے بولی۔
''واقعی۔ وہ بھی کیسے اسٹینڈ لے؟ جب تک عورت کے پاس تعلیم اور مالی خودمختاری نہیں ہوگی تب تک وہ ایسے ہی پٹتی رہے گی۔''

''مالا ٹھیک کہہ رہی ہے بختو!'' ماں کے ماتھے پہ بل تھے۔ اور وجود جلال میں آیا ہوا تھا۔ وہ گود میں سبزیوں کی پرات رکھے تخت پہ بیٹھی تھیں۔ چھری والا ہاتھ اونچا کر کے بولیں۔ ''بیٹیوں کی طرح پالا ہے میں نے نسیم کو۔ اس سے کہو میرے پاس آ جائے۔ وہ اکیلی نہیں ہے۔ ہم اس کے سامنے بیٹھے ہیں ادھر۔''

وہ کچن میں آئی تو ڈرتی کچن کی طرف کھلتا دروازہ نیم وا تھا۔ کیف وہاں کافی بناتا نظر آ رہا تھا۔ آہٹ پہ پلٹا اور اسے وہاں کھڑے دیکھا۔

وہ خوابیدہ آنکھیں لیے بالوں کا گول مول جوڑا بنائے ہوئے تھی۔ رات والا میک اتارنے کے باوجود آنکھوں کے گرد ہلکی سی سیاہی تھی۔

''کافی بناؤں آپ کی؟'' وہ نظریں موڑ کے دوسری طرف پلٹ گیا۔

''ہاں پلیز۔'' توقف کیا۔ اور آواز آہستہ کی۔ ''پھر؟ کچھ نکلا لائٹر سے؟''

''اونہوں۔ عام سا لائٹر ہے۔ کچھ نہیں ہے اس میں۔'' وہ کین سے کافی بینز نکالتے ہوئے بولا۔ اس کے ہاتھ تیز تیز چل رہے تھے۔

''مالی خودمختاری اور تعلیم... آپ کے خیال میں یہ چیزیں عورت کو ابیوز ہونے سے بچا سکتی ہیں؟''

فلٹر پیپر لگا کے کافی بینز اندر ڈالے۔ پھر اس کمپارٹمنٹ کو کھٹک کر کے بند کیا اور مشین آن کر دی۔

''تمہیں اختلاف ہے؟'' مالا کو تعجب ہوا۔

کیف اس کی طرف پلٹا۔ کاؤنٹر سے ٹیک لگائی اور سینے پہ بازو لپیٹ لیے۔ جوگرز کی قینچی بنالی۔

''ساری لڑکیاں ابیوز ہوتی ہیں' باس۔ بخت بی بی کی بیٹی اپنے شوہر کے ہاتھوں اور ایلیٹ کلاس کی لڑکی اپنے بوائے فرینڈ کے ہاتھوں۔''

''یہ دونوں باتیں مختلف ہیں۔'' کافی میکر سے پانی ابلنے کی آواز آ رہی تھی۔ سارے میں کافی کی خوشبو پھیل گئی تھی۔

''اونہوں۔ ایک ہی بات ہے۔ غریب کی لڑکی چائے دیر سے لائے تو شوہر کا موڈ خراب ہوتا ہے۔ وہ اس کو مارتا ہے۔ امیر کی لڑکی پارٹنر کے ساتھ ڈرگز نہ کرے تو پارٹنر کا موڈ خراب ہوجاتا ہے۔ اس کو خوش رکھنے کے لیے وہ ڈرگز پہ لگ جاتی ہے۔ دونوں ابیوز ہوتی ہیں۔ غریب لڑکی بھی۔ اور امیر پڑھی لکھی لڑکی بھی۔''

"وجہ یہ ہے باس! کہ کسی نے عورتوں کو نہیں سکھایا کہ مردوں کے ساتھ کیسے رہنا ہے۔ اور کسی نے مردوں کو نہیں سکھایا کہ عورتوں کے ساتھ کیسے رہنا ہے۔ کافی۔" گرم مگ اس کی طرف بڑھایا۔

"انٹرسٹنگ۔ خیر...... آج جیولرز کی طرف چلنا ہے۔"

"گولڈ لینا ہے تو چند دن ٹھہر جائیں۔" وہ اب اپنی کافی کے لیے فریش بینز ڈال رہا تھا۔ "تولہ ابھی ایک لاکھ سترہ ہزار کا ہے۔ ایک ہفتے میں یہ نوے ہزار تک گرے گا۔"

"تمہیں کیسے پتا؟"

کیف نے شانے اچکائے۔ "مجھے پتا ہوتا ہے۔"

"چلیں آپ کی اطلاع کے لیے مجھے بھی معلوم ہے کہ گولڈ گرنے والا ہے۔ میں نے خریدنا نہیں بیچنا ہے۔ کچھ برکس ہیں میرے پاس گولڈ کی۔ ان کو بیچ کے نیا کام شروع کرنا ہے۔"

اسی اثنا میں بخت بی کچن میں داخل ہوئیں۔ ایک نظر درمیانی دروازے کو دیکھا جو کھلا تھا اور پھر دوسری خشمگیں نظر کیف پہ ڈالی۔

"تمہارا کام ختم ہو گیا ہے تو کھڑے کیوں ہو؟"

کیف نے اپنا مگ اٹھاتے ہوئے فریج کی طرف اشارہ کیا۔

"میں کشمالہ بی بی سے کہہ رہا تھا کہ پتا نہیں کون نا سمجھ ہے جو ڈبل روٹی کو فریج میں رکھ دیتا ہے۔ حالانکہ فریج میں رکھنے سے ڈبل روٹی جلدی خراب ہوتی ہے۔ اس کو ہمیشہ باہر روم ٹمپریچر پہ رکھتے ہیں۔" معصومیت سے کہہ کے اپنا مگ لیے باہر نکل گیا۔ بخت بی نے پیر پٹخا۔

"میں بتا رہی ہوں مالا باجی، یہ ڈرائیور کم اور وارداتیا زیادہ لگتا ہے مجھے۔"

وہ دل کھول کے ہنس دی۔ تب ہی فون پہ ماہی کی طرف چلی گئی تا کہ لان میں جا کے تسلی سے ماہی سے بات کر سکے۔ یہاں بات کرتی تو لاؤنج میں ماں تک آوازیں جاتی۔

"کل کی شادی کیسی رہی؟ تم لوگوں نے مجھے واپس آ کے فون ہی نہیں کیا۔" ماہی الگ ناراض تھی۔

"تھک گئے تھے نا رات میں۔ اب سناتی ہوں سارے قصے۔" وہ پچھلی گیلری میں مگ لیے آگے بڑھ رہی تھی۔ کیف بھی وہیں جا رہا تھا۔ آہٹ پہ رک کے ایک طرف ہو گیا۔ اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

"پہلے یہ بتاؤ، زیاد کا کیا سین ہے؟ ماں بڑا ذکر کر رہی تھیں اس کا۔ کیسا ہے وہ؟" ماہی کا لہجہ تفتیشی تھا۔ مالا مسکرا دی۔

"زیاد؟ ہوں۔" فون کان اور کندھے کے درمیان لگائے وہ آگے جا رہی تھی۔ "لمبا، ڈارک اینڈ ہینڈسم۔"

وہ آگے نکل گئی اور کیف چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔

"صرف ٹال اور ڈارک تھا۔ ہینڈسم کہاں سے تھا؟ ہونہہ۔" منہ میں بڑبڑایا۔

اگلا آدھا گھنٹہ وہ لان میں بیٹھی کافی پیتے ہوئے ماہی کو ساری شادی کا قصہ سنائے گئی۔ کس نے کیا پہنا۔ کون کون آیا۔ کون پہلے ملا اور کون نہیں ملا۔ اور ماہی کا فیورٹ سوال۔ کھانے میں کیا تھا؟

کال بند ہوئی تو اس نے دیکھا، ماں اب لان میں چلی آ رہی تھیں۔ ماں اس وقت پودوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ اپنے فربہ وجود کے ساتھ اب وہ قدم قدم چلتے ہوئے بوگن ویلیا کے درختوں کا معائنہ کر رہی تھیں۔ ہاتھ میں تسبیح تھی جس کے دانے بھی ساتھ ساتھ گر رہے تھے۔

"ادھر آؤ۔" ماں کی نظر اس پہ پڑ گئی جو گارڈ روم کے ساتھ کرسی پہ بیٹھا لیپ ٹاپ پہ لگا تھا۔ دو انگلیوں سے اشارہ کر کے اسے بلایا۔

pklibrary.com

کیف نے پہلے دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اسے ہی بلا رہی تھیں۔ پھر لیپ ٹاپ رکھ کے اٹھا۔ اور سیدھا ان کی طرف آیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"کیف جمال۔"

"کب سے تم نے پودوں کو پانی نہیں دیا۔ تنخواہ کس بات کی لیتے ہو؟"

"ابھی دے دیتا ہوں۔"

"اب کیوں؟ شام میں یا صبح میں دیتے ہیں پانی۔" وہ بڑبڑا کے پودوں کی طرف مڑ گئیں۔ وہ متذبذب سا کھڑا رہا۔ جائے یا رکا رہے۔

وہ جو مسکرا کے یہ سب دیکھ رہی تھی اٹھ کے ان کی طرف آ گئی۔

"ماں... سلیم لگا دے گا پودوں کو پانی۔ کیف کو اپنے کام کرنے ہوتے ہیں۔ اس کو جانے دیں۔"

ماں نے سنا نہیں۔ ہاتھ پہلوؤں پہ رکھے، پودوں کا جائزہ لیتے ہوئے برہمی سے بولیں۔

"ویسے یہ ظہیر انتہائی ناشکرا آدمی ہے۔"

"اف ماں۔ اس کا کیا ذکر یہاں۔" وہ کراہی۔

"پرسوں چارسدہ سے گڑ آیا تھا۔ میں نے اسے بھجوایا۔ کل اس کو مل بھی گیا لیکن مجال ہے کہ اس نے شکریے کا فون کیا ہو۔"

مالا کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ ساکت رہ گئی۔

"واٹ؟ ماں آپ نے... ظہیر کو گڑ بھجوایا ہے؟"

وہ تینوں بوگن ویلیا کے گلابی پھولوں والے درخت کے ساتھ کھڑے تھے۔ کیف خاموشی سے باری باری دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"کیوں؟ ہمیشہ بھیجتی ہوں۔ اب نیا کیا ہے۔" وہ چڑچڑی لگ رہی تھیں۔

کشمالہ مبین کو جلدی غصہ نہیں آیا کرتا تھا۔ وہ یا تو ہنس دیتی یا کل سے بات بدل دیا کرتی تھی۔ یا اس جگہ سے اٹھ جایا کرتی تھی۔ لیکن یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

"ماں آپ نے یہ کیا کیا؟ وہ کیا سوچے گا؟" اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"اس کو شکریہ کہنے کی توفیق پھر بھی....."

"ماں آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہیں۔ آپ کو میرے کام کی نہیں سمجھ میں آتی مان لیا۔ لیکن میری عزت بے عزتی کا خیال تو کرنا تھا۔ اچھا شرمندہ کروایا ہے آپ نے مجھے۔" اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ "اس آدمی نے میرے ساتھ اتنی بڑی زیادتی کی اور آپ اس کو گڑ بھیج رہی ہیں۔ وہ سمجھے گا میں اس کی منت کر رہی ہوں اب۔ واٹ دا ہیل ماں۔"

ماں نے ایک خفا نظر اس پہ ڈالی اور سر جھکا لیا۔ کسی معصوم بچے کی طرح جس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ پھر کیف سے آہستہ سے بولیں۔

"میری ٹانگیں درد کر رہی ہیں۔ مجھے ادھر کرسی لا دو۔"

مالا پیر پٹخ کے اندر چلی گئی۔ کمرے میں آ کے اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اور وہ جو اتنے دنوں سے آنسو روکے ہوئے تھے وہ ایک دم بہنے لگے۔

بے روزگاری کا احساس۔ بے کار ہونے کا گلٹ۔ تاریک نظر آتا مستقبل۔ راکھ ہوا کیریئر۔ وہ اتنے سالوں سے اپنا کماتی اور خرچ کرتی آئی تھی۔ وہ کسی پہ بوجھ نہیں تھی۔ لیکن اگر اس کا نیا کام نہ چلا تو وہ اپنے بلز خود نہیں بھر سکے گی۔ کیسی بے بسی ہوگی یہ۔

سب کچھ ایک دم سے حواسوں پہ سوار ہوا تھا۔ وہ بیڈ پہ بیٹھی روتی رہی۔ ماں کو کبھی اس کا کام سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بس معید کی ڈاکٹری ان کو کوئی کام لگتا تھا۔ باقی مالا اور ماہی کی پڑھائی تو بس شغل تھی جیسے۔

اسے ماں پہ بیک وقت غصہ بھی آ رہا تھا اور اپنی

بے بسی پہ رونا بھی۔ ماں کے ساتھ مسئلہ کیا تھا۔ خوامخواہ ان کو سب کو سوغاتیں بھیج کے اچھا بننے کا شوق تھا۔ وہ اٹھی اور اپنا بیگ پیک کرنے لگی۔ وہ آج ہی اسلام آباد واپس جا رہی تھی۔ بس یہ طے تھا۔

کیف کی کال آ رہی تھی۔ اس نے غصے میں کاٹ دی۔ وہ دوبارہ کال کرنے لگا۔ اس نے جھنجھلا کے کال اٹھائی۔

"باہر آئیں۔ آپ سے بات کرنی ہے۔"

اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ اس نے آنسو رگڑ کے پونچھ ڈالے۔ آج یہ بھی اس سے کچھ سنے گا۔

وہ باہر آئی تو ماں لان میں کرسی پہ بیٹھی تھیں۔ سر جھکائے موبائل پہ بٹن دبا رہی تھیں۔ وہ ان کو نظر انداز کر کے پورچ کی طرف آ گئی جہاں اوپر جانے کا بیرونی زینہ بنا تھا۔ وہاں کیف کھڑا تھا۔ ریلنگ سے ٹیک لگائے، ایک جوگر زمین پہ اور ایک جوگر اوپری زینے پہ رکھے۔ سینے پہ بازو لپیٹے۔ وہ اس کا منتظر تھا۔

"ادھر آ کے بیٹھیں اور میری بات سنیں۔" اس کی روئی روئی گلابی آنکھیں دیکھ کے سنجیدگی سے بولا۔ سامنے ایک خالی کرسی رکھی تھی۔ وہ ناک سکوڑ کے گیلی سانس اندر کھینچتی کرسی پہ آ بیٹھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائی۔

"کیا مسئلہ ہے؟" لہجہ سخت تھا۔

"میں ابھی سن رہا تھا جو آپ اپنی ماں سے کہہ رہی تھیں۔" وہ کھنکھارا۔ کشمالہ کے ماتھے پہ شکنیں ابھریں۔

"کیف تم اپنے کان اور منہ بند کرنا سیکھو۔ مجھے بالکل پسند نہیں ہے کہ تم میرے گھر کی باتیں سنو یا ان پہ تبصرہ کرو۔"

وہ سنجیدگی سے اسے دیکھے گیا۔ پھر بولا تو آواز آہستہ تھی۔

"اپریل میں گڑ نہیں ہوتا، کشمالہ بی بی۔ چار سدہ کا گڑ سیزن مارچ میں ختم ہو جاتا ہے۔"

وہ ایک دم بالکل ٹھہر گئی۔ ساکن۔ ہوا رک گئی۔

"میں نے سلیم سے پوچھا ہے۔ فروری کے بعد چار سدہ سے کوئی گڑ نہیں آیا نہ آنٹی نے کسی کو بھیجا ہے۔"

وہ اس کی آنکھوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

اور تب اسے یاد آیا۔ ماں نے ظہیر کو جنوری میں گڑ بھیجا تھا اور اس نے شکریے کا فون نہیں کیا تھا۔

کیف پہلے زینے پہ بیٹھ گیا اور اسی سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"آنٹی نے مجھ سے چار دفعہ پوچھا ہے کہ میں کون ہوں۔ وہ اپنی بات بار بار دہراتی ہیں۔ اور وہ چیزیں بھول رہی ہیں۔ ان کے ذہن میں نئی یادداشتیں نہیں بن رہیں۔ یا شاید وہ وقت کا حساب کھو رہی ہیں۔"

پورچ کی فضا بالکل ساکن تھی۔ نہ وہاں پھولوں کی خوشبو تھی نہ پودوں کا سبزہ۔ ہر شے کو زوال آ گیا تھا۔

"کشمالہ..." اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ ٹھہر ٹھہر کے بولا۔

"آپ کی ماں بیمار ہیں۔"

اس کا چہرہ سفید پڑتا گیا۔ جیسے کسی برفانی رات میں گھر سے باہر گم ہو جانے والے کا ہوتا ہے۔ نہ جان تھی۔ نہ سانس تھی۔

وہ کسی خواب کی سی کیفیت میں اٹھی۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔

(یونیورسٹی، کالج، کتابیں... سب یہ سکھاتے ہیں کہ کامیاب کیسے ہونا ہے۔ کوئی یہ کیوں نہیں سکھاتا کہ ناکام کیسے ہونا ہے؟)

وہ گھاس پہ قدم اٹھاتی لان چیئرز کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

ماں وہاں اکیلی بیٹھی تھیں۔ سر جھکائے موبائل پہ لگی تھیں۔

(کوئی یہ کیوں نہیں سکھاتا کہ جاب چلی جائے

pklibrary.com

جو فیصلہ پانچ برس میں نہیں ہو سکا وہ پانچ منٹ میں ہو گیا تھا۔

''میں کہیں نہیں جا رہا۔ میرے گھر میں کوئی ایسا نہیں ہے جو مجھے مس کرے۔ میں نے جو وعدہ آپ سے کیا ہے وہ میں پورا کروں گا۔ میں یہیں ہوں آپ کے ساتھ۔''

کیف کو دیکھتی اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اس نے بس اثبات میں سر ہلا دیا اور واپس مڑ گئی۔ اس کی انگلیاں ماہی کو میسج لکھ رہی تھیں۔ وہ میسج جو کوئی انسان اپنے ماں باپ کے بارے میں نہیں پڑھنا چاہتا۔

''ماہی۔ ماں بیمار ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ شاید الزائمرز۔ تم پاکستان آ جاؤ۔ فوراً۔''

☆☆☆

چلی ویک کے اس چھوٹے سے گھر کے لاؤنج میں صوفے پہ نیم دراز ماہ بینہ کا فون بجا تو اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ٹی وی دیکھتے دیکھتے سو گئی تھی۔ وہ چونک کے سیدھی ہوئی۔ موبائل اٹھا کے دیکھا۔

وہ ایک میسج اس کی جان نکال گیا۔ وہ تیزی سے اٹھی۔ پیروں میں جوتے گھسیڑے اور کھڑی ہوئی۔ اور تب ہی اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔

اس کو شدید تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ اتنی شدید کہ حد نہیں۔ وہ کھڑی ہوئی اور سفید صوفے کو دیکھا جس پہ وہ سو گئی تھی۔ وہاں خون کے دھبے تھے۔ اس کے لباس پہ بھی خون تھا۔ نچلے وجود میں تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔

''ماں۔'' تکلیف میں اس کے لبوں سے یہی نکلا۔ وہ دوہری ہو کے بیٹھتی گئی۔ اور پھر دوسرا احساس زیادہ جان لیوا تھا۔

''میرا بچہ۔''

(کوئی یہ کیوں نہیں سکھاتا کہ ماں بیمار ہو جائے گی تو کیا کرو گے؟)

ماں کے ماتھے پہ پسینہ آیا ہوا تھا جسے وہ دوپٹے کے کنارے سے پونچھ رہی تھیں۔

(دل ٹوٹے گا تو کیا کرو گے؟ مستقبل تاریک نظر آئے گا تو کیسے آگے بڑھو گے؟)

وہ ان کے ساتھ کرسی پہ بیٹھی اور غور سے ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ خوبصورت باوقار چہرہ آج بوڑھا لگ رہا تھا۔ جھریاں بڑھ گئی تھیں۔ بائیں جانب سے ہونٹوں کے قریب کی جلد لٹک سی گئی تھی۔

(کوئی یہ کیوں نہیں سکھاتا کہ ماں بیمار ہو جائے گی تو کیا کرو گے؟)

وہ شاید ماہی کو میسج لکھ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ ٹائپ کرتی تھیں۔ مالا نے نرمی سے انگلیوں کی پشت ان کے گال پہ پھیری۔ انہوں نے چونک کے اسے دیکھا۔

''ماں۔'' اس نے گیلی آواز میں پکارا۔ ''آپ نے ظہیر کو گڑ بھیجا تھا؟''

''میں نے؟ نہیں تو۔'' انہوں نے حیرت سے نفی میں دائیں بائیں سر ہلایا۔ اس حرکت میں ایک بے بس سی معصومیت تھی۔ آنکھوں میں کچھ کھوئے کھوئے سے ہونے کا احساس تھا۔ ''گڑ تو سردیوں میں ہوتا ہے مالا۔''

وہ نرمی سے ان کے چہرے پہ انگلیوں کی پشت پھیر گئی۔ کچھ مختلف سا تھا ان کے چہرے میں۔

(کوئی یہ کیوں نہیں سکھاتا کہ ماں بیمار ہو جائے گی تو کیا کرو گے؟)

مگر کشمالہ مبین کو معلوم تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ وہ حورِ جہاں کی بیٹی تھی۔ اس کے راستے متعین ہو چکے تھے۔

''ہم اسلام آباد واپس نہیں جا رہے۔ میں یہیں رہوں گی۔'' وہ سیڑھیوں کے ساتھ کھڑا تھا جب وہ اس کے پاس آئی اور اسے اپنا فیصلہ سنایا۔ ''تم جانا چاہو تو تمہاری مرضی ہے۔ میں کسی اور کا بندوبست کر لوں گی۔''

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

ہائی وے پر ٹرالر اور کار کا شدید ایکسیڈنٹ ہوتا ہے ٹرالر کا ڈرائیور بھاگ جاتا ہے، کار بری طرح پچک جاتی ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مرد اور اگلی نشست پر ہی بیٹھی عورت خون میں لت پت ہیں۔ ریسکیو عملے کا انتظار ہے کہ وہ آئے تو گاڑی کی باڈی کاٹ کر لاشیں نکالی جائیں اسی وقت گاڑی سے ایک بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔

ہاسپٹل میں چار لوگ آئی سی یو کے باہر بیٹھے ہیں نرس باہر آ کر کہتی ہے آپ کے پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

سرخ پھولوں سے سجی گاڑی پوش ایریا کے ایک بنگلے کے آگے رکتی ہے تو۔ دولہا کی ماں ملازمہ سے کہتی ہے کہ دلہن کو لے کر اندر آؤ۔ ملازمہ دلہن کو بیڈ روم میں بٹھا کر جانے لگتی ہے تو دلہن اس سے سر درد کی گولی مانگتی ہے۔ ملازمہ کہتی ہے کہ چائے بھی لے آؤں۔

دولہا کمرے میں آتا ہے۔ تو وہ اس کی شکل دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ وہ ایک بچی کو لے کر آتا ہے کہ اس کے لیے میں نے تم سے شادی کی ہے۔

زمین کو ہواؤں میں اڑنے اور اونچے خواب دیکھنے کا شوق ہے حریم اس کی چھوٹی بہن اسے سمجھاتی ہے۔

زمین کی سہیلی نجل کہتی ہے کہ تمہیں عباد وسیم پوچھ رہا تھا۔

زمین اپنی دوست صوما کی سالگرہ میں جانے کی ضد کرتی ہے لیکن اس کی اماں کو اعتراض ہوتا ہے کہ جوان جہان لڑکی آدھی رات کو سالگرہ میں سے واپس آئے گی تو محلے والے کیا کہیں گے۔ اس کے اصرار پر ابا سے جانے کی اجازت

عفت سحر طاہر

Khawateen Digest December 2021

pklibrary.com

pklibrary.com

زمین صوما کی سالگرہ کی تقریب میں (جو کہ یم پر تی) گھر سے تیار ہوتے ہیں جاتی بلکہ بس کے گھر سے تیار ہو کر جاتی ہے۔راستے میں تجل رانا سعید سے عباد وسیم کے متعلق بات کرتی ہے کہ رانا سعید عباد کا دوست ہے وہ عباد سے زمین کی دوستی کرا دے۔وہ کہتا ہے کہ اپنی دوست کو بربادی کے راستے پر مت ڈالو۔پارٹی میں زمین کی عباد سے ملاقات ہوتی ہے لیکن وہ یمنی الطاف کے ساتھ ہوتا ہے۔اگلی ملاقات میں تجل بتاتی ہے کہ عباد وسیم، رانا سعید سے تمہارا پوچھ رہا تھا۔ زمین بے یقین ہوتی ہے۔

وہ اپنے حواس میں نہیں تھی فیملی ڈاکٹر فریحہ کی ولیسے کی صبح اس کا چیک کرنے آیا تو اس نے کہا کہ شاکڈ اور ڈپریسڈ ہیں۔میڈیسن دیں آرام کرائیں شام تک بہتر ہو جائیں گی۔

تجل زمین کو آفس کے بعد لے کر کلب آجاتی ہے زمین کا موڈ آف ہے۔وہاں ان کی ملاقات عباد وسیم سے ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان رکھائی سے بات چیت ہوتی ہے۔عباد وسیم ان کے جوس کا بل ادا کر دیتا ہے۔زمین کو برا لگتا ہے۔

نصرت زلفی کو کہتی ہیں کہ اٹھ کر دکان پر چلا جا لیکن وہ نہیں سنتا۔وہ زمین کی ہم راہی کا خواب دیکھتا ہے نصرت کہتی ہیں کہ وہ پڑھی لکھی لڑکی تجھ سے شادی سے انکار کر دے گی۔زلفی کہتا ہے کہ وہ میرے بچپن کی منگ ہے۔

زمین کے پاس چھٹی والے دن عباد کا فون آتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ دن گزارنا چاہتا ہے۔زمین، تجل کے گھر کا بہانہ کر کے اس کے بتائے ہوئے ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کرتی ہے۔

عباد وسیم کے ساتھ ایک بھرپور دن گزار کر زمین خوشی خوشی گھر لوٹ آتی ہے۔زمین کو اس کی کھوجتی چمکتی آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔

زمین کی غیر موجودگی میں اماں کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔حریم ابا کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے زمین کو فون کرتی ہے،فون بند ہونے کی صورت میں وہ تھک ہار کر تجل کے نمبر پہ کال کرتی ہے، اسے مبارک باد دیتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے کہ کس چیز کی مبارک باد اور اپنے گھر میں صبح سے کپڑے دھونے کی مظلومیت کا رونا روتی ہے۔حریم پریشان ہو جاتی ہے۔ابا آجاتے ہیں وہ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔

زمین کے آنے پر حریم اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کہاں تھی،زمین سچ اسے بتا دیتی ہے۔

عباد وسیم، رانا سے ملتا ہے تو زمین کی بات ہوتی ہے، رانا کہتا ہے کہ وہ شریف گھرانے کی ہے اس کو بخش دے۔عباد ہنسنے لگتا ہے۔

مائرہ صبح صبح پھپھو کے گھر پہنچتی ہے جہاں عباد وسیم اور نزہت ناشتہ کر رہے ہیں۔مائرہ اور نزہت کی معنی خیز باتوں سے انجان بنتا عباد وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔

حریم بے ساختہ میرب کو پیار کرتی ہے، وہ گھبرا جاتی ہے۔

نزہت گھر د[illegible] پر حریم کو کہتی ہیں کہ وہ میرب کے سلسلے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کریں گی۔

حریم عباد سیکو[illegible] کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اس کے شوروم تک آجاتی ہے عباد اسے دھمکاتا ہے وہ اس سے کہتی ہے کہ تم خراب کیریکٹر کے ہو۔میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔زمین پتا چلنے پر ناراض ہوتی ہے اور عباد سے معذرت کرتی ہے وہ معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

مارک ڈینیکل کو بتاتا ہے کہ اس کی مسلمان لڑکے سے دوستی ہے۔نصرت پھپھو تاریخ طے کرنے کے لیے مٹھائی اور شادی شدہ بیٹی کو لے کر آتی ہیں۔زمین گھر میں نہیں ہوتی۔

حریم کو وہ اس کے گھر لے کر آتا ہے اماں اور طوبیٰ بہت خوش ہوتی ہیں لیکن ابا کے آنے سے پہلے اسے جانے کا کہتی ہیں۔

عباد کی برتھ ڈے کے موقع پر عباد زمین کو اپنے فلیٹ پر تنہا بلاتا ہے، وہاں جانے کے بعد زمین کو باپ کی بات یاد آتی ہے کہ دو نامحرموں کے بیچ تیسرا ہمیشہ شیطان ہوتا ہے۔

pklibrary.com

اترتی ہے۔ ادھر نصرت پھپھو تاریخ لینے آجاتی ہیں۔ اماں اور حریم کے پوچھنے پر نرمین شادی کی ہامی بھر لیتی ہے۔ نصرت پھپھو اور زلفی خوش ہو جاتے ہیں۔ سجل فون کر کے نرمین کو لاتی ہے۔ وہاں عباد وسیم موجود ہوتا ہے اور اسے پرپوز کرتا ہے۔ نرمین خوشی خوشی گھر آتی ہے۔

رات میں حریم نریم سے کہتی ہے کہ شادی کا کارڈ پسند کر لو۔ وہ کہتی ہے پہلے لڑکا تو پسند کر لوں۔ پھر اسے بتاتی ہے کہ عباد وسیم نے اسے پرپوز کیا ہے۔ دروازے میں کھڑی اماں یہ سن کر بے سدھ ہو کر گر پڑتی ہیں۔

سجل کے سمجھانے پر حریم کو احساس ہوتا ہے کہ وہ غلطی پر ہے، اس نے اپنی زندگی کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ حالات کو انتہا پر آتے دیکھ کر حریم شوہر سے کہتی ہے کہ وہ میرب سے دور نہیں رہ سکتی۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اسے آخری چانس دے رہا ہے، اس کے بعد اسے یہاں سے جانا پڑے گا۔

وہ میرب کے لیے شاپنگ کا کہتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آؤٹ لیٹ پر آجاتا۔ زیاد واپس پہنچتا ہے تو کیتھی کی ساتھی ویٹرس اسے بتاتی ہے کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔

زیاد کیتھی کو بتاتا ہے کہ اس کے بھائی نے پسند کی شادی کر لی ہے اور ماں باپ نے اسے گھر سے نکال دیا ہے اور بھائی کی مشکیتر اس کے سر منڈھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں۔

پال کیتھی سے کہتا ہے کہ اسے اب مارک کے مستقبل کی پلاننگ کرنی چاہیے۔ وہ اکتا کر وہاں سے ہٹ جاتی ہے۔

مارک اس سے راستے میں معافی مانگتا ہے، کیتھی کے انکار پر ثبوت ملنے کا کہتا ہے۔

کیتھی زیاد سے کہتی ہے کہ وہ مسلمان ہونا چاہتی ہے۔ عباد ماں باپ سے معافی مانگ کر گھر واپس آنے کا کہتا ہے۔

مائرہ، حریم کو آؤٹ لیٹ پر دیکھ کر برہم ہو جاتی ہے۔ نزہت بھی اس پر ناراض ہوتی ہے۔ حریم میرب کو لے کر اپنے والدین کے گھر آتی ہے۔

حریم میرب کو لے کر اپنے والدین کے گھر جاتی ہے۔ اماں کو یہ سن کر بہت صدمہ ہوتا ہے کہ حریم کا شوہر پہلے سے شادی شدہ ہے۔ وہ بچی کو پیار کرتی ہیں کہ اس میں نرمین کی شباہت ہوتی ہے۔

مائرہ کو دیکھنے کچھ لوگ آنے والے ہیں۔ وہ ماں پر ناراض ہوتی ہے لیکن وہ کہتی ہیں کہ اپنی پھپھو کے سراب سے باہر نکل آؤ۔

نزہت بیٹے پر ناراض ہوتی ہیں کہ اسے حریم کے میکے کیوں بھیجا۔ مائرہ اسے اپنے آنے والے رشتے کے بارے میں بتاتی ہے۔ وہ اسے سمجھاتا ہے کہ اسے اب زندگی میں آگے بڑھ جانا چاہیے۔ مائرہ باہر جانے کا پروگرام بناتی ہے لیکن وہ منع کر دیتا ہے کہ اسے حریم اور میرب کو لینے جانا ہے۔ مائرہ شدید غصے میں گھر آتی ہے جہاں اس کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آئے ہوتے ہیں، وہ ان سے بدتمیزی کرتی ہے۔ فوزیہ بیٹی کو ڈانٹتی ہیں، وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

کیتھی کے گھر والوں کو پتا چل جاتا ہے کہ وہ اسلام قبول کر چکی ہے۔ وہ اسے لے کر غائب ہو جاتے ہیں۔ زیاد ہر جگہ اسے تلاش کرتا ہے لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلتا، مائرہ خودکشی کر لیتی ہے۔

بائیسویں قسط

کاش!! کوئی لفظ
میری اذیت کے معیار پہ پورا اترے
تو میں تمہیں بتاؤں
کہ درد اور تکلیف اس اذیت سے
بہت چھوٹے لفظ ہیں

میں چاہتا ہوں
میں تمہیں بتاؤں
مجھے تمہارے بعد کے غم کی دیمک نے کھایا ہے
مجھ سے ملنا تو
میرے درد کو دلاسا دینے کے لیے
مجھے کاندھے سے لگا کر بہت سارا رو لینے دینا
میں جو کہوں محبت کی بھیگی آنکھوں سے سننا
اپنی شفیق بانہوں میں سمیٹ کر میری پیشانی پر بوسہ دینا
مجھے بتانا کہ
تم نے بھی مجھے بالکل میری طرح ہر لمحہ یاد کیا

(فرح طاہر)

''کیتھ۔'' زیاد نے بے قراری سے اس کا نام پکارا تھا، بالکنی کے ساتھ ملحق کمرے میں موجود حریم کے دل کو کسی نے مٹھی میں بھینچا اس کی آنکھیں بھرا گئیں وہ مزید کوئی لفظ کانوں میں پڑنے سے پہلے ہی کمرے سے نکل گئی۔

''تم کہاں چلی گئی تھیں۔ میں نے کتنا ڈھونڈا تمہیں۔ اور اب کہاں ہو؟'' وہ بے تاب لہجے میں کہتا گویا سب کچھ ہی جان لینا چاہتا تھا۔

''بہت لمبی کہانی ہے۔ ملو گے تو تفصیل سے بتاؤں گی۔'' بشاشت سے کہتے ہوئے بھی اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھلی ہوئی تھی۔

''کہاں ہو تم کیتھ؟''

''کیتھ نہیں..... آمنہ۔'' وہ بے اختیار اسے ٹوک گئی۔ زیاد لمحہ بھر کو قوت گویائی سے محروم ہوا تھا۔

''مجھے پتا تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ تم نے اسلام قبول کر لیا ہوگا۔ اسی لیے تمہیں انڈر گراؤنڈ جانا پڑا ہوگا۔ میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔'' وہ بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔

''مجھے موقع ہی نہیں ملا کہ میں کسی کے پاس تمہارے لیے پیغام چھوڑ سکوں یا تمہیں کال کر سکوں۔ میرا سیل فون چھین لیا گیا تھا۔ اور واقعی مجھے سب کی نظروں سے چھپا دیا گیا۔ خاص طور پر تم مجھے نہ ڈھونڈ سکو۔'' آمنہ کی بھیگی ہوئی آواز مسکرا رہی تھی۔

''ان لوگوں نے چھوڑا کیسے تمہیں؟ وہ تو سنا ہے دماغ سے کھرچ کر نکال دیتے ہیں باغی خیالات کو۔'' زیاد نے بے ساختہ کہا۔

''ابھی صرف گھر والوں کو پتا چلا تھا۔ مام، ڈیڈ اور ڈینیل کو۔ مجھے انڈر گراؤنڈ کر کے گھر سیل کر دیا گیا۔ مجھے بیڑیاں ڈال کر رکھا گیا تھا، گھر والوں نے میری محبت میں مجبور ہو کر کمیونٹی والوں کو میرے مذہب تبدیل کرنے کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی اور خود ہی سختی کر کے میرا برین واش کرتے رہے لیکن میں اللہ کے کرم کی وجہ سے متزلزل نہیں ہوئی اور ایمان کی روشنی کو نہیں چھوڑا۔ پھر ایک روز ڈینی کو ترس آ گیا۔ دراصل وہ سمجھ گیا تھا کہ میں مر جاؤں گی لیکن اس راہ سے واپس نہیں پلٹوں گی۔ اس نے مجھے فرار کروا کے عائشہ کے حوالے کر دیا۔ اور کچھ مہینوں کے بعد جب میرے نئے نام سے نجانے کس طرح پیپرز بن گئے تو مجھے عائشہ کے ساتھ ترکی بھیج دیا۔ اس

ہوں اس دن کے جب وہ یہ ناراضی بھول کر پھر سے میرا پیارا دوست بن جائے گا۔'' اس کی بھرائی ہوئی آواز آخری جملے تک آنسوؤں میں ڈوب گئی تھی۔

''ان شاءاللہ۔ ضرور وہ دن آئے گا کیتھ۔ مطلب...... آمنہ۔'' وہ خلوص دل سے کہتے ہوئے آخر میں اس کے نام کی تصحیح کر کے مسکرایا۔

''ان شاءاللہ۔'' وہ دل سے بولی۔

''اب بتاؤ۔ کہاں ہو اس وقت۔ اور اکیلی ہو یا کسی کے ساتھ ہو؟'' وہ پوچھنے لگا۔

''حیان البشر ساتھ ہے میرے۔ عائشہ کا بڑا بھائی۔'' آمنہ نے اسے بتایا۔

''میں اسلام آباد میں ہوں۔ تم مجھے ایڈریس اور لوکیشن سینڈ کر دو بس۔ ہم پلین سے لاہور پہنچیں گے اور وہاں سے تمہارے پاس۔'' اس کی آواز میں ٹھہراؤ اور گہرے سکون کی سی کیفیت تھی زیادکا دل بھرانے لگا۔

''تم میرے دل کی پہلی خواہش ہو آمنہ۔'' نجانے کیوں بے اختیار ہی اس نے اعتراف کیا تھا۔

''(سیم ہیئر) یہاں بھی ایسا ہی ہے۔'' آمنہ نے جذب سے کہا۔

☆☆☆

''بس اب رشتہ ڈھونڈو اس نالائق کا اور اسے کسی طرف لگاؤ ورنہ یہ تو آوارہ نکمے دوستوں کے ساتھ مل کر ساری کمائی کھا اڑا دے گا۔'' پھپھا نے بڑی ہی مشکل اور گالی گلوچ کے بعد بمشکل زلفی سے آدھے روپے نکلوائے تھے۔

''آپ نے بھی تو حد ہی کر دی۔ اپنی دفعہ تو تین ہزار دیتے ہوئے پانچ سو گالیاں بھی دیتے تھے اور اس سے پچیس ہزار نکلوا لیے۔ وہ کہہ بھی رہا تھا کہ نئی موٹر سائیکل لینی ہے۔'' نصرت خفگی سے بولیں۔

''تم جیسی عورتیں ہوتی ہیں جو اولاد کی حمایت کر کر کے اسے ہاتھ سے نکال دیتی ہیں اور پھر سر پہ ہاتھ رکھ کے روتی ہیں۔'' انہوں نے پیسے واسکٹ کی جیب میں گھسیڑتے ہوئے انہیں گھر کا۔

''لو۔ اب اگر اس کی شادی ہی کرنی ہے تو یہ پیسے اپنی جیب میں کیوں گھسیڑ رہے ہو مجھے دو، میں الگ کر کے رکھ دیتی ہوں۔'' نصرت تڑپیں۔

''ہاں۔ تجھے دے دوں۔ تا کہ تو بری کے نام پہ لال، ہرے، نیلے سوٹ اٹھا لائے اور باقی کھا اڑا دے۔'' پھپھا نے طنز کیا۔

''اس کے پاس پچیس ہزار ہے پورا۔ اس سے کہہ کے نکلوا لے۔ شادی کے لیے پیسہ چاہیے ہوتا ہے پیسہ۔''

''نہ۔ تو تم نے کون سی شادی کرنی ہے اس عمر میں۔ تم نے بھی تو پچیس کا پچیس جیب میں ڈال لیا ہے۔'' نصرت سلگیں۔

''کم عقل عورت۔ اسٹور کا بل دلاؤں گا۔ کب سے فریزر لینے کا سوچ رہا تھا آئس کریم رکھنے کے لیے۔ کوئی سیکنڈ ہینڈ دیکھ لوں گا۔'' پھپھا کی سوچ کاروبار کو بڑھانے سے آگے نہیں جاتی تھی، اب بھی اطمینان سے کہہ کر نکل گئے اور پیچھے نصرت اکیلی کلستی رہ گئیں۔

''پالے پوسے، ہر قسم کی ڈیوٹی دے ماں۔ اور جیب گرم ہوا با حضور کی۔ حد ہے۔ اور یہ کمبخت زلفی۔ آ لینے دو۔ کیسے کڑکتے نوٹ جیب میں ڈال کر بھاگا ہے۔ میری ایمان داری کا انعام ہی دے دیتا کم از کم۔'' نصرت کو رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اگر وہ مکر جاتیں تو یہ پیسے ان کے بھی ہو سکتے تھے۔ زلفی تو ویسے بھی کام پر لگ گیا تھا تھوڑا

pklibrary.com

لیکن زلفی گھر آیا تو ان کی ساری امیدوں پہ پانی پھر گیا وہ پرانی موٹر سائیکل بیچ کر اس میں پیسے ڈال کر نئی موٹر سائیکل لے آیا تھا۔

''کیا بات ہے اماں! خوش نہیں لگ رہیں؟'' اپنی نئی موٹر سائیکل کو بلاوجہ ہی اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر جب ذرا شوق مدھم پڑا تو وہ نصرت کی خاموشی پہ ٹھٹکا۔

''میں تو بہت خوش ہوں۔ دس ہزار میرے ہاتھ پہ جو تو نے رکھ دیا۔ میں تو محلے کی ہر عورت کو بتا کر آئی ہوں کہ میرے بیٹے نے اپنی پہلی کمائی میرے ہاتھ پہ رکھی ہے لاکر۔'' نصرت نے بھگو بھگو کر مارتے ہوئے تڑخ کر کہا تو زلفی کھسیا گیا۔

''پچیس ہزار تو ابا نے نکلوا لیے۔ تیس ہزار کی پرانی موٹر سائیکل بکی۔ اس میں پندرہ ہزار مزید ڈال کر یہ لوکل برانڈ کی موٹر سائیکل لی ہے، پینتالیس ہزار میں پڑی ہے۔'' زلفی نے تفصیل بتائی تو نصرت کی آنکھیں چمکیں، فوراً ہی ہونٹوں پہ مسکراہٹ آ گئی۔ یعنی ابھی بھی اس کی جیب بھرنے کا چانس موجود تھا۔

''میں صدقے۔ مجھے پتا تھا میرا بیٹا ماں کو ضرور یاد رکھے گا۔'' ماں کی بات سن کر زلفی نے جز بز ہوتے ہوئے باقی کے بچے ہوئے دس ہزار میں سے پانچ ہزار ان کے ہاتھ پر رکھے۔

''ابھی دوکان کا ادھار بھی اتارنا ہے اماں! اگلی بار وعدہ رہا۔ اگر لمبا ہاتھ مارا تو دس ہزار پکا دوں گا۔''

''اللہ کرے۔ ایسے ہی لمبے ہاتھ مارتا رہے تو۔'' نصرت نے فوراً پانچ ہزار کا نوٹ بٹوے میں منتقل کرتے ہوئے دعا دی تھی۔ زلفی بے ساختہ اس دعا پہ کھل کر مسکرا دیا۔

☆☆☆

شدید چوٹوں میں سے کوئی بھی چوٹ خطرناک نہیں تھی لیکن چوٹوں کی شدت نے مصطفیٰ صاحب کو درد اور بخار میں مبتلا کر دیا تھا۔ آج بھی اماں نے ڈبل فیس پہ ڈاکٹر کو گھر بلا کر ان کا چیک اپ کروا کر دوائیں لکھوالی تھیں۔ گھر میں رشتہ داروں کا ہجوم لگنے کے خیال سے خاندان میں کسی کو اس ایکسیڈنٹ کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی گئی تھی لیکن طوبیٰ کا دل اس قدر پریشان تھا کہ اماں کے سختی سے منع کرنے کے باوجود اس نے حریم کو ابا کے ایکسیڈنٹ کے متعلق بتانے کا سوچ لیا تھا۔

''اماں! اور ہے ہی کون ہمارا۔ آپی کو بھی رشتہ داروں والے کھاتے میں ڈال رہی ہیں آپ۔''

''مجھے کیا اعتراض ہونا ہے۔ یہ تو تمہارے ابا نے منع کیا تھا سختی سے۔ حریم کی طرف سے ویسے بھی ان کا دل تنگ ہے تو کہیں بیماری میں چڑچڑے ہو کر کچھ غلط نہ کہہ دیں اسے۔'' زاہدہ جز بز ہوئیں۔

''والدین نہیں کہیں گے تو اور کون کہے گا کچھ؟ ابا ڈانٹ بھی دیں گے تو آپی چپ کر کے سن لیں گی اماں! پہلے بھی تو یہی کرتی آئی ہیں۔''

طوبیٰ نے آرام سے کہا تو اماں بے اختیار اسے دیکھنے لگیں۔ نرمین تو شروع ہی سے منہ پھٹ اور بدلحاظ رہی تھی۔ صرف اپنی خوشی اور پسند کے بارے میں سوچنے والی، خودغرض۔ جبکہ حریم اور طوبیٰ نے اپنے انداز و اطوار سے اماں کو ہمیشہ ہی مطمئن رکھا تھا۔ طبیعت میں نرمی۔ جھک جانے والی۔ ان کا مان رکھ لینے والی۔ لیکن پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ سب کچھ ہی تلپٹ ہو گیا، ان کا آشیانہ آندھیوں کی زد میں ایسا آیا کہ تنکا تنکا بکھر گیا کسی بدخواہ کی نظر کھا گئی مصطفیٰ احمد کے ہنستے بستے گھر کو۔ مگر پھر بھی حریم ان کے پاس پلٹ آئی تھی۔ اور نرمین۔ اس نے اب بھی اپنا ہی سوچا۔ حق ہا!'' اماں نے گہری سانس لی۔

''میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ معمولی چوٹیں آئی ہیں۔ سیریس کچھ بھی نہیں ہے۔'' طوبیٰ نے وعدہ کیا۔

مسکرا کر موبائل اٹھا کر چارجنگ پہ لگانے لگی، ابھی بیٹری بالکل ختم تھی تو کال کرنا ناممکن تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے لیے چائے بنا کر لاؤنج میں آئی تو نزہت وہیں بیٹھی تھیں۔

''آپ چائے پئیں گی؟'' حریم نے انہیں آفر کی۔

''نہیں۔ میں پی چکی ہوں۔'' نزہت نے تپائی پہ رکھا میگزین اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلا کر وہیں بیٹھ گئی مجبوری تھی کہ کمرے میں اس وقت بالکل بھی جانا نہیں چاہتی تھی جہاں وہ کیتھ کے ساتھ خوش گوار گپ شپ میں مصروف تھا۔

''طبیعت کیسی ہے تمہاری۔ چیک اپ کے لیے ڈیٹ نہیں دی ڈاکٹر نے؟'' نزہت نے اس قدر غیر متوقع طور پہ نرمی سے پوچھ لیا کہ منہ کی طرف بڑھتا چائے کا کپ چھلکتے ہوئے بچا۔

''جی۔ جی بالکل ٹھیک ہوں۔ ڈاکٹر نے ہتھلی چیک اپ کا کہا ہے۔'' وہ جھینپ سی گئی۔ نزہت اسے بغور دیکھ رہی تھیں وہ کم سن تھی اور خوب صورت بھی۔

انہیں نرمین یاد آئی۔ وہ حریم سے بھی زیادہ حسین تھی۔ انہوں نے بے اختیار آہ بھری۔ ان دونوں بہنوں کی قسمت مائرہ سے بلند رہی تھی نجانے کہاں سے اٹھ کر کحل کی رانیاں بن گئی تھیں۔ نرمین تو چلو مان لیا کہ عباد کا جنون تھی لیکن یہ حریم۔ کیسے بنا کسی تعلق اور چاہت کے آناً فاناً زیاد کی زندگی میں چلی آئی تھی۔ وہ بے اختیار ہی سوچ گئیں۔ اس کی جگہ مائرہ بھی تو ہو سکتی تھی۔ ان کی سالوں سے دل میں پنپتی خواہش حسرت بنی تو سارا غصہ حریم پہ نکلنے لگا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ جب سے اس کے ماں بننے والی خبر ملی تھی نزہت کا مائرہ اور زیاد کی شادی والا سارا جوش اور ولولہ بیٹھ گیا تھا۔ جو بھی ہو۔ وہ اس گھر کی نسل کو جنم دینے والی تھی اس لیے اب وہ حریم کو اپنی فیملی سے کاٹ کر الگ نہیں پھینک سکتی تھیں۔

''اوہ تو تم میکے سے گئی تھیں اپنی ماں کے ساتھ۔ زیاد کے ساتھ جاؤ ہمارے فیملی ہاسپٹل۔ وہاں سے مکمل چیک اپ کرواؤ۔ اور ڈائٹ چارٹ بنواؤ۔ صحت مند اولاد پیدا کرنے کے لیے ماں کی صحت اچھی ہونا بہت ضروری ہے۔'' ان کے لب و لہجے کی نرمی پر حریم کی آنکھیں بھر آئیں، اس نے پلکیں جھپک کر آنکھوں میں آئی نمی کو پیچھے دھکیلا اور بنا کچھ کہے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دیر سے ہی سہی لیکن حالات شاید بہتر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ حریم کے اندر یاسیت نے ڈیرے ڈال لیے۔

☆☆☆

شاذل کو دروازے میں ایستادہ دیکھ کر مائرہ کا دم حلق میں اٹکا اس نے شاذل کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ہی لائن ڈراپ کر دی۔

''تت..... تم کب آئے؟'' وہ بوکھلائی۔ موبائل اس نے سختی سے ہاتھ میں دبوچ رکھا تھا۔ شاذل نے گہری سانس بھری اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''تمہیں لینے آیا ہوں۔ کچھ گفٹس خریدنے ہیں۔ دوست کی شادی ہے۔

''تو اس نے کچھ نہیں سنا۔'' مائرہ کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑے۔

''ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔'' ویسے تو وہ اس دردسری میں نہ پڑتی لیکن اس وقت کی سچویشن کے لحاظ سے وہ کچھ نروس نیس کا شکار فوراً ہی مان گئی۔

کپڑے۔ وہ مسکرائی۔

''چلو۔ ایسے ہی چلتے ہیں، تم نے کون سا اپنی ''ہونے والی'' سے ملوانے لے جانا ہے۔ بس ذرا فریش ہو جاؤں۔'' وہ اسے خفیف سا چھیڑتے ہوئے موبائل بیڈ پہ اچھال کر واش روم کی طرف بڑھی۔

''ہمم..... میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔'' وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔

مائرہ شکر ادا کرتی واش روم میں گھس گئی۔ اندر سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی شاذل نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ مائرہ واش روم میں ہی تھی۔ شاذل نے جلدی سے اس کا موبائل اٹھا کر آخری کیے جانے والی کال کا نمبر چیک کیا۔ وہ کسی زلفی کے نام سے محفوظ تھا شاذل نے ایک نظر واش روم کے بند دروازے کو دیکھتے ہوئے اس نمبر کو اپنے واٹس ایپ پہ سینڈ کرنے کے بعد اس میسج کو ڈیلیٹ کیا اور موبائل ویسے ہی بیڈ پہ رکھ کر جیسے خاموشی سے آیا تھا ویسے ہی باہر نکل گیا۔

مائرہ تیار ہو کر نیچے آئی تو وہ رابعہ کے پاس بیٹھا میرب کے اغوا کی تفصیل پوچھ رہا تھا، وہ محتاط سی آ کر صوفے کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔

''اللہ ہی جانتا ہے کون اٹھا کر بچی کو لے گیا اور کیسی کی کیا منشا تھی۔ ہم نے تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ شخص بچی کو ساتھ ہی نہیں لے گیا۔'' رابعہ جھرجھری لے کر کہہ رہی تھیں۔

''ہو سکتا ہے اس شخص کا ارادہ بچی کے والدین کو پریشان کرنے کا ہی ہو۔ کیوں مائرہ؟'' شاذل نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے اسے بھی شامل خیال کیا تو وہ گڑبڑا گئی۔

''مجھے نہیں پتا۔ میں کون سا جاسوس لگی ہوئی ہوں پولیس کے محکمے میں۔'' مائرہ نے تنک کر کہا پھر اسے مزید گفتگو سے روکنے کی خاطر تیز لہجے میں بولی۔

''اب اگر تم نے چلنا ہے شاپنگ کے لیے تو بتا دو ورنہ میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں کہ اس انویسٹی گیشن میں ضائع کرتی پھروں۔''

''اففف۔ ایک تو آپ کی صاحبزادی کو غصہ بہت آتا ہے۔ یہ تو ٹھیک کر کے رکھ دے گی مجھے۔'' وہ اسے سراسر چھیڑنے والے انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا، رابعہ کے ہنسنے پر مائرہ نے لب بھینچے مگر گاڑی میں آ کر وہ بھڑک اٹھی۔

''میں نے تم سے ایک بار انکار کر دیا ہے تو پھر بار بار اس فضول لطیفے کو دہرانے کا کیا مقصد ہے؟''

''اففف.....''

''میری بے بسی کی تھی وہ داستاں جسے تم ہنسی میں اڑا گئے۔''

''شٹ اپ۔ جلدی سے اپنی شاپنگ کرو اور مجھے واپس چھوڑ دو۔''

''واپس چھوڑ دوں؟'' ابرو اچکا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا پھر قطعی انداز میں بولا۔ ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب تو یہ شادی ہو کر ہی رہے گی۔''

مائرہ نے اسے گھورتے ہوئے کڑا وار کیا۔

''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ شادی شدہ آدمی کے ساتھ شادی کروں۔''

''زیادہ بھی شادی شدہ ہے مائرہ!'' شاذل نے احتیاط سے یوٹرن لیتے ہوئے جتانے والے انداز میں کہا تو وہ سامنے دیکھتی ہوئی ساکت ہوئی۔

''تم یہ سب بکواس کرنے کے لیے مجھے ساتھ لائے ہو؟'' وہ ضبط سے پوچھ رہی تھی۔

یہ زندگی گزارنے کے ضابطے ہیں مائرہ۔ اب بس کردو اپنی زندگی سے کھیلنا۔"
"میں مر نہیں رہی کسی کے لیے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں زیاد سے شادی کرنے کی خواہش دل میں لیے بیٹھی ہوئی ہوں؟" وہ اونچی آواز میں چلانے لگی شاذل نے تاسف بھری ایک نگاہ اس پر ڈالی۔
"مسئلہ صرف یہ ہے کہ تم اسے خوش اور آباد بھی نہیں دیکھ پا رہیں۔" وہ چوٹ کرتے ہوئے بولا۔ مائرہ ساکت سی ہوئی پھر جیسے گڑبڑا کر ہوش میں آئی۔
"شٹ اپ شاذل! اگر تو تم مجھے اس نام نہاد برین واشنگ کے لیے ساتھ لائے ہو تو آئم ناٹ انٹرسٹڈ۔ مجھے گھر ڈراپ کردو ابھی کے ابھی۔"
"یہی تو پرابلم ہے تمہارے ساتھ۔ تم حق بات سننا ہی نہیں چاہتیں۔" شاذل نے تیز لہجے میں کہا۔" اور اوپر سے بڑی بے وقوفی یہ کہ تم یہ بھی چاہتی ہو کہ تمہیں تمہارے حال پہ اکیلے چھوڑ دیا جائے۔"
"میں تمہاری ذمہ داری نہیں ہوں۔" وہ تپی۔
"دوست دوستوں کی ذمہ داری ہی ہوا کرتے ہیں۔ اگر تمہیں دوستی کے اصول یاد ہوں تو......" شاذل نے پھر سے اس کے بے اعتنائی سے پر انداز پر چوٹ کی۔
"اپنی زندگی کو کسی ایسی ڈگر پر ڈالو مائرہ! جس کی کوئی منزل بھی ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا تحفہ ہے۔ یوں تجربات میں ضائع کرنے کے لیے نہیں دی اس نے۔"
"تم اپنی فکر کرو۔ تین شادیاں نمٹا کر بھی جسے منزل نہیں ملی۔"
"مل گئی ہے۔" وہ بے ساختہ بولا پھر اسے دیکھ کر ہنسنے لگا۔
"اب کی بار تو بس تمام عمر اسی منزل پر پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ ہے۔"
اس کی گہری نظروں نے مائرہ کو جز بز کیا۔
"فضول انسان۔ اور ویسی ہی فضول گفتگو۔"
"تمہیں جیسا بھی لگے۔ مگر ایک بات دھیان میں رکھ لو مائرہ! مجھے تم اچھی لگنے لگی ہو اور میری دل سے خواہش ہے کہ جب تم شادی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرو تو مجھے اپنی ترجیح بناؤ۔" وہ دھونس بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا مائرہ کو نا چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔
"پاگل۔"

☆☆☆

"آمنہ کہاں ہے؟" عائشہ کی کال دوپہر کے کھانے کے وقت آئی تھی۔
"اوپر اپنے کمرے میں ہے، میں تو لنچ کے لیے نیچے آیا ہوں۔"
"اس کا تو ویٹ کرلیتے۔ یہ مینرز ہوتے ہیں لڑکیوں کو ٹریٹ کرنے کے۔" عائشہ نے طنز کیا تو وہ [illegible] جتا کر بولا۔
"وہ یہاں اپنے بوائے فرینڈ سے ملنے آئی ہے۔ مجھے کیا مصیبت پڑی ہے مفت کے مینرز دکھانے۔"
"کم آن۔" عائشہ نے بے اختیار تیز لہجے میں اسے ٹوکا۔" اس کے لیے بوائے فرینڈ کا لفظ تو مت استعمال کرو۔"
"تم نے یہ سب نصیحتیں سنانے کے لیے تیسری بار کال کی ہے مجھے؟" وہ تحمل سے گویا ہوا۔
"تم جیسے بے وقوف کو قدم قدم پر مجھ جیسی عقل مند بہن کی ضرورت ہے اس لیے بار بار کال کر کے سمجھانا پڑتا ہے۔" عائشہ نے گہری سانس بھری تو حسب توقع وہ تپا۔

pklibrary.com

''سچ تو برداشت ہی نہیں کسی کو۔ یہیں تھی وہ۔ بے منزل تھی۔ وقت پہ دل کی بات کہہ دیتے تو شاید اب تک۔''

''شٹ اپ۔'' حیان درشت لہجے میں اس سے کی بات کاٹ گیا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ ایک لڑکی جو اپنے بوائے فرینڈ کے پیچھے یہاں تک آ گئی ہے میں اس کی راہ کھوٹی کرنے کی کوشش کرتا۔ سوری۔ مجھے ایسی فضولیات پسند نہیں۔ اور نہ ہی میں اب اس کے بارے میں کچھ ایسا سوچتا ہوں۔ ایسے ہی تمہارا خیال لے لیا اس کے متعلق۔ غلطی کر لی۔'' وہ پچھتایا۔

حیان نے آمنہ سے شادی کے بارے میں عائشہ سے بات کی تب اس نے آمنہ اور زیاد کی دوستی کے متعلق راز کھولا تو وہ متاسف ہوا کہ یہ بات منہ سے نکالی ہی کیوں۔ وہ بھی عائشہ جیسی جذباتی لڑکی کے سامنے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا وہ تو شاید اس تذکرے کو بھول ہی گیا تھا لیکن یہ عائشہ ہی تھی جو اسے وقفے وقفے سے یاد دلاتی رہتی کہ اسے آمنہ کو اپنے جذبات سے آگاہ کر دینا چاہیے مگر حیان نے اس کی اس بے وقوفی بھری تجویز کو سختی سے رد کر دیا۔ وہ اپنے جذبات کی ناقدری نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی خائن کہلانا اسے پسند تھا۔ اگر وہ اس کے پاس زیاد کی امانت تھی تو آج اس نے ایمان داری کے ساتھ اسے زیاد تک پہنچا دیا تھا۔ شیشے کی دیوار کے پار بھاگتی دوڑتی زندگی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خفیف سی سرخی اترنے لگی۔

☆☆☆

''تم کہاں ہو۔ بتاؤ مجھے۔ میں لینے آتا ہوں تمہیں۔'' زیاد بے چینی سے بولا وہ ہنسی۔

''اتنی دور سے بھی تو آ ہی گئی ہوں۔ فکر مت کرو تم تک بھی پہنچ جاؤں گی تم بس ایڈریس سینڈ کرو مجھے۔''

اس کے انداز پہ زیاد کھل کر مسکرایا اسی وقت بالکنی کا دروازہ کھلا اور ہڑبڑائی ہوئی سی حریم باہر آئی۔

''آئم سوری۔ تمہیں ڈسٹرب کر رہی ہوں۔ لیکن وہ۔ میرے بابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی تو آمنہ سے معذرت کرتے ہوئے زیاد نے موبائل ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے نا؟''

''پتا نہیں۔ جا کر ہی پتا چلے گا۔ طوبیٰ کہہ رہی تھی کافی چوٹیں آئی ہیں۔''

''او کے۔ تم ڈرائیور سے کہو تمہیں چھوڑ آئے گا۔'' وہ آرام سے بولا تو حریم پل بھر کو ٹھٹکی پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پلٹ گئی۔

''میرب سوئی ہوئی ہے اسے گھر پہ ہی رہنے دو میں سنبھال لوں گا۔'' زیاد کی آواز اسے پیچھے سے سنائی دی تھی۔

''ہوں۔ ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں تم؟'' وہ دوبارہ فون کی طرف متوجہ ہوا۔

''خیریت ہے نا؟ یہ کون تھی؟'' آمنہ کو ان کی گفتگو تو سمجھ میں نہیں آئی لیکن پریشان سی آواز سن کر وہ متجسس ہوئی تھی۔

''جب ملو گی تو بتاؤں گا سب کچھ۔'' زیاد نے اسے ٹالا۔

''شادی تو نہیں کر لی زید۔ بتا دو یہیں سے واپس چلی جاؤں۔'' وہ ہنس کر چھیڑ رہی تھی زیاد کی مسکراہٹ غائب ہونے میں ایک پل بھی نہیں لگا۔

''بہت کچھ جمع کیا ہوا ہے تمہیں بتانے کے لیے کیتھ! زندگی نے اگر تمہیں امتحانات میں ڈالا ہے تو کم آزمائش مجھ پر بھی نہیں ڈالی۔'' وہ مدھم پڑ گیا۔ روانی میں وہ اسے پرانے ہی نام سے پکار گیا۔

''سب خیریت ہے نا؟'' آمنہ اس کے شکست خوردہ لہجے پہ ٹھٹکی۔

pklibrary.com

"تم مل گئی ہو بالکل صحیح سلامت۔ تو اب سب کچھ ٹھیک ہے۔ بس جلد از جلد تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں کیتھ۔"
وہ جذباتی ہوا تھا آمنہ نم آنکھوں سے مسکرا دی۔
"میں بھی۔"

☆☆☆

وہ زیاد سے بات کرنے کے بعد ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں آئی تو کافی کا کپ سامنے رکھے حیان شیشے کے دروازے سے باہر کے مناظر کو گھور رہا تھا۔ اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر میز کی سطح کو ناخن سے بجایا تو وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔
"ہمم..... ہوگئی بات؟" وہ سنبھل کر بولا۔
"ہاں۔ تمہیں کیا ہوا ہے؟" اثبات میں جواب دیتے ہوئے اس کی سرخی مائل ہوتی آنکھیں دیکھ کر آمنہ نے پوچھا۔
"مجھے کیا ہونا ہے۔ میں تو گھنٹے اور منٹ گن رہا ہوں کہ کب وہ تمہیں ملے اور کب میرے سر سے بوجھ کم ہو۔" وہ منہ بنا کر بولا۔
عام حالات میں اس کا اس قدر خشک رویہ دیکھ کر شاید وہ تلملا جاتی لیکن ابھی چونکہ دل کا موسم بہت خوب صورت تھا اس لیے حیان کے سڑیل پنے کو جی بھر کر نظر انداز کیا۔
"وہ لاہور میں ہے۔ پلین سے جاسکتے ہیں وہاں۔ بائی روڈ تو چار پانچ گھنٹے لگ جائیں گے۔"
"ابھی پلیز۔ لنچ ٹائم ہو رہا ہے۔ یہ سب باتیں کھانے کے بعد کے لیے اٹھا رکھو۔" وہ جیسے بیزار سا ہو کر بولا۔
"تو تم کھا لیتے کھانا۔ مگر میں یہاں سات سمندر پار سے کھانا کھانے تو ہرگز نہیں آئی ہوں۔" وہ اس کے اکھڑے انداز پر خفا ہوئی۔
"ہاں۔ تم تو شاید ہوا کھا کے بھی زندہ رہ لوگی۔ لیکن میں تمہیں یہ حیرت انگیز راز بتا کر چونکانا چاہتا ہوں کہ اتفاق سے میں کھانا کھائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"
وہ بھرپور طنز سے کہتے ہوئے مینیو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا آمنہ نے دانت پیستے ہوئے میز پہ پڑا کانٹا اٹھا کر اس کی طرف تانا تو حیان نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو مینیو کارڈ کے پیچھے چھپا لیا۔
"بدتمیز۔ بے دل نہ ہو تو....." وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے مینیو کارڈ پہ جھک گئی۔

☆☆☆

حریم کو ڈرائیور ڈراپ کر گیا تھا حریم کا ارادہ رات یہیں رکنے کا تھا اس لیے اس نے ڈرائیور کو اگلے روز واپسی کا وقت دے کر روانہ کر دیا۔ ابا کو ادھ موئی حالت میں بخار میں پھنکتے پا کر ان کے پیروں پہ سر رکھے ہوئے وہ رو دی۔
"فکر مت کرو۔ چوٹوں کی وجہ سے بخار ہو رہا ہے بس۔ باقی سب خیر ہے کسی ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا۔"
مصطفیٰ صاحب نے اپنے پیروں پہ سر دھاتھوں کا لمس اور نمی سی محسوس کر کے آنکھیں کھولیں تو اپنے پیروں پہ جھکی حریم کو دیکھ کر تکلیف کا شکار ہوئے۔
"ابا۔" وہ انہیں جاگتے دیکھ کر جلدی سے اٹھ کر ان کے بستر کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھی اور ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔
"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" اس نے ان کا ہاتھ محبت سے چومتے ہوئے پوچھا تو ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر گویا سب ٹھیک ہونے کا اشارہ کیا۔

جیسے کہ تمام ہی مناظر دھندلا کر بصارت سے دور ہو گئے۔ مگر اب۔ شاید وہی وقت دوبارہ لوٹنے لگا تھا، انہوں نے حریم کے ہاتھوں میں دبا اپنا ہاتھ دیکھ کر سوچا۔

''ابا کام پہ نہیں جا رہے ہیں اماں۔ گھر کیسے چلے گا بھلا۔'' حریم نے رات کھانے کے بعد اپنے بیگ میں سے بیس ہزار روپے نکال کر اماں کے ہاتھ پہ رکھے تو وہ بدکیں۔

''کچھ پیسے جمع کیے ہوئے تھے مشکل وقت کے لیے میں نے۔ وہی کام آ رہے ہیں۔ یہ تم واپس رکھو۔''

''یہ سب میرے اپنے ہیں اماں! میری سلامیاں اور جیب خرچ۔ وہاں تو خرچ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔'' حریم نے روپے ان کے پرس میں ڈالے۔

''تمہارے ابا بہت خفا ہوں گے حری۔'' اماں نے اسے یاد دلایا۔

''کوئی بات نہیں۔ ابا کی ڈانٹ بھی کھا لوں گی۔ مگر آپ کو یوں بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتی۔''

حریم نے قطعیت سے کہا تو اماں کو ہارنا ہی پڑا ویسے بھی اتنے دنوں سے ڈاکٹر کو ڈبل فیس پر گھر بلانے کے بعد ان کے پاس اب کچھ نہیں بچا تھا۔ ان۔ کا دل بھرانے لگا تو حریم نے آگے بڑھ کر انہیں گلے سے لگایا۔

''میں بے حد خوش ہوں اماں! آج مجھے لگا کہ ابا اب مجھے معاف کر دیں گے۔'' حریم کی آواز بھرا گئی تھی اماں نے مسکراتے ہوئے اس کی پیشانی چوم کر اسے خود میں بھینچ لیا۔

☆☆☆

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم اس قدر ست کیوں ہو۔ اب تک تو تمہیں تیار ہو جانا چاہیے تھا۔'' وہ اس کے کمرے میں آئی تو حیان کو پوستیوں کی طرح بستر میں لیٹے پا کر جل بھن کر رہ گئی۔

''اُفف۔ سردی بہت ہے۔ بستر سے نکلنے کا دل نہیں چاہ رہا۔''

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ڈرائیور سستی اور نکمے پن کا مظاہرہ کیے بنا معہ گاڑی ہوٹل کے باہر آ چکا ہے، ایئر پورٹ پہنچنا ہے ہمیں۔'' آمنہ نے طنز کیا تو وہ بدک کر اٹھا۔

''کہا بھی تھا میں اکیلی جا سکتی ہوں ڈرائیور کے ساتھ۔ مگر تم صرف ست ہی نہیں اڑیل بھی ہو۔'' وہ بڑبڑائی۔

''تمہیں سالم واپس لے جانا میری ذمہ داری ہے، سمجھیں؟ پرسوں یہاں پہنچے ہیں اور دس فون تمہاری دوست کے آ چکے ہیں وہ بھی نصیحتوں سے بھرپور۔''

''ہاں تو ٹھیک ہی کہتی ہے وہ۔ ہم اگر اسٹور پہ ذرا لیٹ پہنچیں تو ہمارا باس ہمیں معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتا اور اپنی دفعہ ساری وقت کی پابندی بھول جاتی ہے اسے۔''

آمنہ نے سامنے بیڈروم چیئر پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے طنز کیا تو وہ اسے گھورتے ہوئے واش روم میں گھس گیا لیکن اگلے چند منٹوں میں وہ تیار ضرور ہو گیا تھا۔ آمنہ نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ عائشہ کے بقول مصر کے دیومالائی مردوں جیسی خوب صورتی رکھتا تھا۔ پرفیکٹ نین نقش۔ کھڑی ناک اور اونچا لمبا ورزشی جسم۔ نیلی جینز اور جیکٹ میں اس کا قد مزید نمایاں ہو رہا تھا۔ سیاہ بالوں کے ساتھ اس کی ہیزل گرین آنکھیں بہت نمایاں تھیں اس کے چہرے پر۔

''اگر میرا جائزہ مکمل ہو گیا ہو تو چلیں۔ ایئرپورٹ بھی پہنچنا ہے ہمیں۔'' وہ اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے بولا تو آمنہ ہڑبڑا کر حواس میں آئی۔ اسے مکمل تیار دیکھ کر جھینپی، شاید غیر ارادی طور پر وہ اسے ہی دیکھے چلی جا رہی تھی۔

''میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔'' سنبھل کر کہا۔

pklibrary.com

اپنے شولڈر بیگ سے اس کی پشت کو آگے کی طرف دھکیلا۔ آج وہ یہاں سے چیک آوٹ کر رہے تھے کاؤنٹر پہ تمام بقایا جات ادا کر کے حیان نے کمرے کی چابی واپس لوٹائی اور دونوں ہوٹل سے نکل کر حیان کی ایئر پورٹ کے لیے ہائر کی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

میرا وجدان کہتا ہے کہ
میری منزلیں ہیں قریب تر
کیونکہ ان ہواؤں میں
تمہاری سانسوں کی
خوشبوئیں ہیں گھلی ہوئی

وہ دل نہ چاہتے ہوئے بھی میرب کا سوچ کر اگلے روز ڈرائیور کے ساتھ گھر چلی آئی تو زیاد کو لان میں ہی نرم سی دھوپ میں موبائل پہ مصروف دیکھ کر ٹھٹکی۔ اسے خیال آیا۔ آج شاید کیتھ آنے والی تھی یا شاید وہ اس سے ملنے جانے والا تھا، اس سوچ سے حریم کا دل اس قدر گھبرایا کہ وہ اس کے پاس رک کر ہائے ہیلو کیے بنا اندر چلی گئی میرب اسے دیکھتے ہی مما...... مما پکارتی دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹی تو حریم کے جلتے ابلتے دل کو جیسے سکون سا آ گیا۔ اس گھر میں کوئی تو تھا غیر مشروط طور پر اس سے محبت کرنے والا۔ اس نے فرط محبت سے جھک کر میرب کو اٹھایا اور پیار کرنے لگی کمرے میں آ کر اس نے میرب کو بستر پہ اتارا۔

''کیسی طبیعت ہے تمہارے ابا کی؟'' وہ بات ختم کر کے سیدھا اندر ہی آیا تھا۔

''ابھی تو چوٹیں بھی ہیں اور بخار بھی بار بار ہو جاتا ہے۔''

''تو کچھ دن اور رہ لیتیں۔'' اس نے مشورہ دیا لیکن ان دنوں حریم اس قدر رزود رنج ہو رہی تھی کہ زیاد کا عام سا لہجہ بھی اسے سرد مہر لگا۔

''تم بے فکر رہو۔ میں تمہاری لائف ڈسٹرب کرنے نہیں آئی اور نہ ہی میں کیتھ کے سامنے آؤں گی۔'' تلخی سے کہتے ہوئے بالوں کو کیچر سے آزاد کرتے ہوئے وہ بستر پر گر سی گئی۔ زیاد ٹھٹکا۔

''یہ میں نے کب کہا ہے تم سے کہ تم اس کے سامنے نہیں آؤ گی، اس سے چھپ کر رہنا ہے تمہیں؟''

''میں خود سمجھتی ہوں اس بات کو۔ تم بھلے منہ سے نہ کہو۔'' وہ تنکی۔

''چھپانا ہی ہوتا تو اپنے اور کیتھ کے تعلق کو تم سے چھپاتا۔ لیکن مجھے ان سب فضولیات کی ضرورت نہیں اور نہ ہی مجھے گیمز کھیلنی آتی ہیں۔'' وہ تحمل سے بولا۔

''واقعی۔'' حریم نے استہزاء سے اسے دیکھا تو وہ اس کا طنز بخوبی سمجھا۔

''کل وہ آ رہی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ تم اس کے سامنے ایسی کوئی فضول بات نہیں کرو گی۔''

وہ کہہ رہا تھا، حریم کو اپنا دل کسی گہری کھائی میں ڈوبتا محسوس ہوا۔ وہ کپڑے تبدیل کرنے ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

''مت کرو ایسا میرے ساتھ زیاد وسیم! میرا تو راستہ بھی تم اور منزل بھی تم ہی ہو۔ میرے قدموں تلے کی زمین اور سر پہ آسمان تمہارے ساتھ ہونے سے ہی تو ہے۔'' اس کا دل بے اختیار ہونے لگا۔

☆☆☆

گاڑی اس عالی شان دکھائی دینے والی کوٹھی کے بڑے سے چاکلیٹ براؤن گیٹ کے سامنے پہنچی تو آمنہ

pklibrary.com

"ناٹس۔"
گیٹ کھل چکا تھا، ڈرائیور سبک روی سے ڈرائیو وے پر گاڑی چلاتا اندر پورچ تک لے آیا تب ہی وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر آیا۔ آمنہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، زیاد نے لپک کر پچھلا دروازہ کھولا وہ باہر نکلی۔
"السلام وعلیکم۔" بھرائے ہوئے لہجے میں اس پر سلامتی بھیجی تو اس کے ہاتھوں کو نرمی سے اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے زیاد کا دل بوجھل سا ہونے لگا۔
(کاش۔ تم مجھ سے یوں کھو نہ گئی ہوتیں کیتھ۔ کاش)
"وعلیکم السلام۔ کیتھ سے آمنہ تک کا سفر طے کرنا مبارک ہو۔"
آمنہ کے آنسوؤں کے بیچ مسکراہٹ چمکی۔
"کیسی ہو؟"
"دیکھ لو۔ تمہارے سامنے ہوں۔" وہ کھلکھلائی۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر حیان نیچے اترا تھا۔ زیاد نے آگے بڑھ کر گرمجوشی سے حیان کو گلے لگایا۔
"تھینکس آلاٹ مین۔ تم نے بڑا کام کیا ہے۔"
وہ سب اندر آگئے تھے۔ نزہت ان کے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ رات افراتفری میں ہی زیاد نے کچھ دوستوں کی آمد کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ آکر کچھ دن سیٹھی ہاؤس میں ہی ٹھہرنے والے تھے۔ اور اب آمنہ نامی اس لڑکی کی محبت اور والہانہ انداز انہیں الجھا گیا۔
"یہ لڑکی ہے کون۔ تم جانتی ہو کیا اسے؟" حریم کچن میں کھانے کے انتظامات دیکھ رہی تھی جب نزہت نے اس سے سرسری سا پوچھا تو وہ بے اختیار انہیں دیکھنے لگی۔
"دراصل زیاد کبھی بھی کسی دوست لڑکی کو گھر نہیں لایا اور نہ ہی کبھی کسی کے متعلق اتنا ایکسائیٹڈ ہوا ہے۔ شاید تم تفصیل جانتی ہو اس لڑکی کی۔" انہوں نے وضاحت کی۔
"یہ انگلینڈ میں یونی فیلو تھی زیاد کی۔ کیتھ۔"
"کیتھ؟" انہوں نے حیرت سے پلٹ کر حریم کو دیکھا۔
"مجھے تو کچھ اور ہی نام بتایا ہے زیاد نے۔ شاید آمنہ۔" وہ یاد کرتے ہوئے بولیں تو حریم کو دھچکا لگا۔
(تو کیا وہ مسلمان ہوگئی ہے۔ زیاد کی خاطر) حریم کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ بے اختیار لڑکھڑا کر کاؤنٹر کا سہارا لے گئی۔
"دھیان سے۔" نزہت نے اس کی سپید پڑتی رنگت دیکھی تو فوراً ثریا کو متوجہ کیا۔
"جاؤ۔ حریم کو اس کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔ طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی مجھے اس کی۔"
"نن...... نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔" وہ بمشکل بولی۔
"تم ملی ہو آمنہ سے؟" نزہت کو دھیان آیا۔ حریم نے بدقت تمام نفی میں سر ہلایا۔
"تم چینج کر کے آؤ اور مل لو ان سے۔ وہ لوگ دو تین روز یہیں ٹھہرنے والے ہیں۔ ایسے میں برا لگے گا کہ زیاد کی بیوی ملی ہی نہیں۔"
"میرے ملنے سے شاید وہ زیادہ برا محسوس کرے گی۔" حریم کے حلق میں کچھ اٹکا۔ نزہت نے حیرت سے اسے دیکھا۔

pklibrary.com

ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے پاس رکھی کرسی پہ کرسی تھیں۔

☆☆☆

''ٹانگیں توڑ دوں گا جو نام بھی لیا بھائی کے گھر جانے کا۔'' پھپھا تو سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئے۔ دراصل نصرت نے مصطفیٰ احمد کے محلے کی کسی عورت سے ان کے ایکسیڈنٹ کے متعلق سنا تو رہا نہیں گیا۔ دل اس قدر پریشان ہوا کہ اپنے تمام تر اختلافات بھول کر انہوں نے بھائی کی عیادت کرنے کا فیصلہ کیا لیکن جب انہوں نے میاں کے سامنے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو وہ بھڑک اٹھے۔

''دیکھ لے اپنے باپ کا حال۔ اب بندہ پوچھے کبھی ماس سے ناخن جدا ہوئے ہیں۔'' پھپھا کے کام پہ جاتے ہی نصرت نے منہ بسورتے ہوئے زلفی کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی۔

''دفع کرو اماں! ان لوگوں سے اب ہمارا کیا لینا دینا۔'' زلفی نے اکتا کر کہا تو نصرت نے آنکھیں دکھائیں۔

''خبردار..... خبردار جو باپ کی زبان بولی ہو تو۔''

''میرے پاس کون سی اپنی زبان نہیں ہے اماں! سچ ہی تو کہہ رہا ہوں۔ دفع کردو ان ظالموں کو جنہیں کسی کے جذبات کی پروا نہیں۔'' زلفی جذباتی ہوا۔

''ارے بخت۔ کون سا خوشی میں جا رہی ہوں۔ تیرے ماموں کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، اب جیتے جی خون کے رشتے تھوڑی توڑے جاتے ہیں۔''

''اچھا۔ پر ابا تو منع کر کے گئے ہیں۔'' وہ ماں کے آنسو دیکھ کر موم ہوا۔

''ارے ان کی کیا بات ہے۔ وہ تو ابھی کے گئے رات کو لوٹیں گے۔ تو مجھے اسٹور جاتے ہوئے چھوڑ دینا واپسی میں خود ہی کرلوں گی۔ انہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''ٹھیک ہے اماں! پر اندر آنے کا مت بولیو مجھے۔ سخت خار ہے میرے دل میں ماموں کی فیملی کے لیے۔'' زلفی نے پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا۔

''ہاں ہاں۔ تو فکر مت کر۔ دروازے سے چاہے تو ایک فرلانگ دور ہی اتار دینا۔'' نصرت نے اسے بے فکر کیا۔ اور جلدی سے کپڑے بدلنے چلی گئیں۔

زلفی نے ماموں کے گیٹ کے سامنے بائیک روکی نصرت نیچے اتریں تو وہ بائیک کو کک لگا کر اڑ منچھو ہونے ہی کو تھا کہ اسی وقت ماموں کے گھر کا دروازہ کھلا اور ایک چاند سا نوخیز چہرہ جھلکا۔ طوبیٰ نے سبزی والے کی آواز سن کر اماں کے کہنے پر اسے روکنے کے لیے دروازہ کھولا تھا کہ نصرت پھپھو کو سامنے دیکھ کر گڑبڑا سی گئی۔

ادھر زلفی کا پیر گیئر پر ہی اٹک گیا۔ یوں لگا، ماموں کے گھر کے دروازے سے چاند جھلک آیا ہو۔ یہ زلفی کی نیت بد تھی کہ وہ معصوم فوعمر لڑکی پر بھی بری نگاہ ڈالنے سے باز نہ رہا تھا۔ نرمین اور حریم کے ساتھ تو اس کا دو چار سال کا ہی عمروں کا فرق تھا۔ لیکن طوبیٰ تو ابھی بمشکل سیکنڈ ایر میں تھی۔

''ماننا پڑے گا بھئی۔ ایک سے ایک ہیرا ہے ماموں کے گھر۔'' وہ بائیک کو کک لگاتے ہوئے رخصت ہوا نصرت اندر داخل ہو گئیں۔

''اللہ معاف کرے۔ کیا ہی بے گانوں کے خون سفید ہوتے ہوں گے جیسے یہاں اپنوں کے ہوئے۔ ارے میرا بھائی ایکسیڈنٹ کروا کر معذور ہو گیا اور کسی نے اکلوتی بہن کو خبر کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔'' نصرت نے اندر داخل ہوتے ہی بین ڈالنے شروع کر دیے تو اماں افتاں وخیزاں کمرے سے باہر نکلیں۔

کی خبر کیسے پہنچی، ملنے کو آگے بڑھیں۔
"ارے رہنے دو یہ منہ دیکھے کی محبتیں۔" نصرت نے طوبیٰ کو ساتھ لگاتے ہوئے بھر جائی کو نخوت سے دیکھا۔
"ابا نے ہی منع کیا تھا کسی کو بھی بتانے سے۔ کہہ رہے تھے اتنی تکلیف میں دیکھ کر پھپھو کو دکھ ہوگا۔ کچھ دنوں بعد بتا دینا۔" طوبیٰ نے مصلحت کا راستہ اپنایا تو نصرت قدرے ٹھنڈی پڑیں۔ اماں سے مل کر وہ بھائی کے پاس پہنچیں تو انہیں چوٹوں اور نیل کے نشانات لیے بستر پہ پڑا دیکھ کر دل پگھل گیا۔
"ہائے۔ میرے ویر۔ کیا حشر ہو گیا ہے۔ رنگت تو دیکھو۔ پلی پھٹک۔" وہ مصطفیٰ صاحب سے مل کر خوب ہی روئیں۔ جو بھی تھا زمانے کے لیے جیسی بھی تھیں۔ بہن بھائی والا رشتہ تو سب سے الگ ہی تھا۔
تھوڑی دیر ایکسیڈنٹ کی تفصیل پوچھنے کے بعد وہ ایسی باتوں میں مشغول ہوئیں، جیسے کبھی آپس میں کوئی ناراضی تھی ہی نہیں۔
اماں اور طوبیٰ نے جھٹ پٹ مرغی کا بھنا ہوا گوشت چپاتیاں اور کھیرے ٹماٹر کا سلاد بنالیا۔ دوپہر کا کھانا کھایا جاتا تھا جب بیرونی دروازے کی گھنٹی نے کسی کی آمد کی اطلاع دی۔ طوبیٰ باورچی خانے میں تھی، وہیں سے دروازہ کھولنے چل دی۔ دروازہ کھولتے ہی زلفی کی مسکراتی شکل نظر آئی تو اس نے بے اختیار ہی اپنا دوپٹہ ٹھیک سے لیا۔
"السلام علیکم زلفی بھائی۔" ہڑبڑا کر سلام کیا۔
"وعلیکم السلام۔" زلفی نے کھینچ کر لمبا سا جواب دیا تھا۔
"کیسی ہو طوبیٰ رانی۔ تم تو بہت بڑی ہو گئی ہو بھئی۔" وہ لگاوٹ سے کہہ رہا تھا اور ادھر زلفی کی پرشوق ایکسرے جیسی گہری نگاہیں دیکھ کر طوبیٰ پوری جان سے کانپ اٹھی۔

☆☆☆

حریم نے کھانا لگا کر ثریا سے کہہ دیا کہ زیاد کو خبر کردے خود وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں جمع کر پائی تھی کہ آمنہ سے جا کر مل سکتی۔ کجا اپنے ہاتھوں اپنے شوہر کو اس کے حوالے کرنا۔ نزہت وہاں بیٹھی ہوئی تو تھیں لیکن یہ جو نئی صورت حال ان کے سامنے آئی تھی، اس نے ان کی ساری خوش مزاجی ہوا کر دی تھی۔ اب تو وہ بس گہری نظروں سے آمنہ اور زیاد کا جائزہ لے رہی تھیں اور ویسے بھی آمنہ اور حیان کے ساتھ خالص انگریزی کی گفتگو کم ہی ان کے پلے پڑ رہی تھی۔
آمنہ کی چہکار پورے ڈائننگ روم میں گونج رہی تھی اس کی نیلی آنکھوں کی چمک نظر انداز کرنے کے قابل ہرگز نہ تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ روح کی گہرائیوں سے خوش ہے آج۔ حیان چپ چاپ اپنے کھانے میں مگن تھا بھی کبھار زیاد کے مخاطب ہونے پر مختصر سی بات کر لیتا ورنہ محض آمنہ ہی کی باتیں جاری تھیں۔
"پاپا۔ اٹھالیں۔"
میرب ہاتھ میں فیڈر تھامے جاگتے ہی سیدھی حسب عادت زیاد کی گود کی طرف آئی تھی اور میرب کے پیچھے افتاں و خیزاں لپکتی حریم بے ترتیب سانسیں لیے دروازے ہی میں رک گئی۔ میرب کی پکار پر آمنہ کی مسکراہٹ ایک دم سمٹی، اس نے بے یقینی سے زیاد کو دیکھا جس کی رنگت اس اچانک صورتحال پر بدل گئی تھی۔ ڈائننگ روم میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔
آمنہ کی نظر دروازے میں کھڑی پیاری سی لڑکی کی طرف بے ساختہ اٹھی تو اس کا دل جیسے گہری کھائی میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ بنا تعارف بھی بوجھ سکتی تھی کہ وہ لڑکی زیاد وسیم کی کیا لگتی ہے۔

آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ

آزمائش

راشدہ رفعت

ہے تو وہ دونوں سگی بہنیں لیکن مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بیس برس پہلے میں معراج الدین کے سنگ رخصت ہو کر سسرال پہنچی، تب میرا ان دونوں سے پہلا تعارف ہوا۔ صفورا بیگم اور صغریٰ بیگم۔ دونوں معراج کی پھوپھیاں تھیں۔

"لو بھلا ؤ بتاؤ، بھیا نے معراج کے لیے کیسی دلہن پسند کی۔ ہمارا معراج ماشاءاللہ لمبا چوڑا، گورا چٹا اور بہو کا تو قد بھی چھوٹا اور رنگ بھی ذرا دبتا ہوا ہے۔"

پاٹ دار آواز میں کیا جانے والا یہ بے لاگ تبصرہ میرے کانوں میں پڑا تو جی اندر ہی اندر ڈوب سا گیا۔ نئی نویلی دلہن کا سسرال پہنچتے ہی سواگت ایسے دل دوز تبصرے سے کیا جائے تو دل ڈوبنا بنتا ہی ہے۔ تبصرہ کرنے والی ہستی صفورا بیگم کی تھی۔ معراج کی سگی پھوپھی جو بٹوا نکال کر مجھے سلامی کے پیسے دے رہی تھیں۔ کرخت سے نین نقش والی صفورا پھوپھی مجھے پہلی نگاہ میں ہی بہت خوف ناک سی لگیں۔ میں اتنا سہم گئی کہ ان پر دوسری نگاہ تک نہ ڈال سکی۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت والی انگلی سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھائے جانے کس جانچ پڑتال میں مصروف تھیں حالانکہ مجھے دیکھتے کے ساتھ ہی تبصرہ تو انہوں نے صادر فرما دیا تھا پھر وہ کیوں مجھے ایسی ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے تک رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ میرے خوف پر کوفت غالب آنے لگی۔ اتنے میں میری نند شاہینہ میرے لیے جوس کا گلاس لے کر آئی تو صفورا پھوپھی کو میرے پاس سے ہٹنا پڑا۔

"نورین بھابھی! پلیز آپ صفورا پھوپھی کی باتوں کا برا مت مانیے گا۔ ان کا مزاج اور عادتیں بس ایسی ہی ہیں۔" شاہینہ نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے ملتجیانہ انداز میں سرگوشی کی۔ میں دلہن بنی بیٹھی تھی، اس بات کا کیا جواب دیتی۔ ہولے سے مسکرا کر سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

کمرے میں ویسے بھی عورتوں کا جم غفیر تھا۔ سب رشتہ دار خواتین کو میاں جی کی بہو دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ میاں نورالدین میرے شفیق سسر کا نام

pklibrary.com

برس پہلے ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ معراج ان کے پہلوٹھی کے بیٹے تھے۔ معراج سے چھوٹی دو بہنوں کو تو معراج کی مرحومہ والدہ نے اپنی زندگی میں ہی گھر بار کا کر دیا تھا۔ معراج ایک سرکاری محکمے میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ میاں جی نے اپنی بیوی کے انتقال کے کچھ عرصے بعد ہی معراج کے لیے میرا رشتہ مانگ لیا تھا۔ حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا تک نہ تھا۔ ابا جی سے برسوں کا یارانہ تھا۔ ابا جی کی شرافت و نجابت کے معترف تھے اور جانتے تھے کہ ابا جی نے اپنی اولاد کی تربیت عین ان ہی خطوط پر کی ہے جن خطوط پر میاں جی نے اپنے بچوں کی تربیت کی ہے۔

ان کے نزدیک شکل وصورت اور دیگر تمام باتیں ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ بات پکی ہونے سے پہلے معراج کے گھر سے مجھے کوئی دیکھنے تک نہ آیا اور جب ابا جی نے میاں جی کو رضا مندی دے دی تو صرف ایک بار وہ اپنی دونوں شادی شدہ بیٹیوں کو مجھ سے ملوانے لائے تھے۔ شاہینہ اور فہمیدہ دونوں مجھ پر واری صدقے جارہی تھیں۔

''آپ بہت پیاری ہیں نورین بھابھی! سچی ہمارے تو دل دھڑک رہے تھے کہ ابا جی نے معراج بھائی کے لیے کیسی دلہن منتخب کی لیکن آپ کو دیکھ کر دل میں ٹھنڈک سی اتر گئی ہے۔ ماشاء اللہ چاند، سورج کی جوڑی ہوگی ہمارے بھائی بھابھی کی۔''

جوش مسرت سے فہمیدہ کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ مجھے خود پہلی ملاقات میں اپنی پرخلوص اور بے ریا نندیں بہت پسند آئی تھیں اور جاتے سمے شاہینہ نے چپکے سے میری مٹھی میں معراج کی پاسپورٹ سائز تصویر تھمائی تو میرا دل انوکھی ہی لے پر دھڑکنے لگا۔ معراج الدین نام سے کسی بھاری بھرکم شخصیت کا تصور ذہن میں آتا تھا مگر وہ تو بہت خوب صورت اور باوقار لڑکے کی مسکراتی ہوئی تصویر تھی۔ حیا کی لالی میرے گالوں پر بکھری تھی اور میں بے اختیار اللہ کا شکر بجالے آئی۔

میاں جی جلد شادی کے خواہش مند تھے کہ گھر آرہی تھی۔ ابا جی کی خواہش تھی کہ رابعہ آپا کے ساتھ ہی میری شادی کے فریضے سے سبک دوش ہوجائیں۔ رابعہ آپا کی نسبت میرے خالہ زاد بھائی سے طے تھی اور ان کے مالی حالات فوری شادی کی اجازت نہ دے رہے تھے۔ میاں جی نے ابا جی کی مجبوری سمجھ لی اور دوبارہ جلدی شادی کا تقاضا نہ کیا لیکن ابا جی خود دل میں بہت شرمندگی محسوس کرتے تھے۔ سو خالہ پر زور دیا کہ وہ رسوم ورواج کی پیروی اور تکلفات میں پڑنے کے بجائے سادگی سے رابعہ آپا کو رخصت کروا کر اپنے گھر لے جائیں۔ پھر بھی میری اور آپا کی شادی ہوتے ہوتے سال کا عرصہ لگ ہی گیا تھا۔

دنیا میری قسمت پر رشک کررہی تھی۔ میں رخصت ہوکر ایسے گھر میں آئی تھی جہاں ساس، نندوں کا ٹنٹنا ہی نہ تھا (دنیا کی نگاہوں میں تو یہ ٹنٹنا ہی ہوتا ہے۔ یہ اور بات کہ مجھے زندگی میں قدم قدم پر ان رشتوں کی ضرورت محسوس ہوئی)۔ میں خود رخصتی کے وقت بڑی ''ریلیکس'' قسم کی دلہن تھی۔ رابعہ آپا جو سگی خالہ کے ہاں جارہی تھیں، انہوں نے رو رو کر آنکھیں سجالی تھیں۔ اماں سے ملتے وقت میری آنکھیں صرف ڈبڈبائی تھیں، ہاں جب ابا جی نے سر پر ہاتھ رکھا تو ان کے کپکپاتے ہاتھ کا لمس پاکر میری ہچکی بندھ گئی تھی لیکن جلد ہی میں نے خود پر قابو پالیا۔

سسرال پہنچ کر صفورا پھوپھی کا سہرہ کھلنے سے پہلے تک سب ٹھیک تھا لیکن جب وہ میرا معائنہ کرکے فارغ ہوئیں تو میں ٹھیک ٹھاک نروس ہوگئی تھی۔ رشتہ دار خواتین کا ہنسی مذاق جاری تھا کہ ایک شفیق صورت خاتون میرے پاس آئیں۔ مجھے ان کی شکل کچھ دیکھی بھالی سی لگی لیکن میں انہیں پہچان نہ پائی۔ انہوں نے پہلے میری پیشانی چوم کر مجھے ڈھیروں ڈھیر دعائیں دی تھیں پھر میری مٹھی میں سلامی کے پیسے تھمائے۔

''یہ صغریٰ پھوپھی ہیں بھابھی! ابا جی کی سب

نہیدہ نے تعارف کروایا تھا اور پھر مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے ان کی شکل دیکھی بھالی لگ رہی ہے۔ ان کا چہرہ میاں جی کی شباہت لیے ہوا تھا۔ ویسا ہی شفیق، پرخلوص اور مسکراتا ہوا چہرہ۔

اس روز مجھے فرسٹ امپریشن از دا لاسٹ امپریشن والے مقولے کی صحیح سمجھ میں آئی تھی۔ صفورا پھوپھی کا پہلا ہیبت ناک تاثر نہ تو کبھی میرے ذہن سے فراموش ہوا نہ ہی صغریٰ پھوپھی کے شفیق ہونٹوں کا لمس میرے ذہن سے محو ہوا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ان تاثرات کی صداقت ثابت ہوتی گئی۔

خوش قسمتی سمجھ لیجیے یا بدقسمتی۔ صغریٰ پھوپھی اور صفورا پھوپھی کا گھر ہمارے گھر سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ پانچ منٹ کی پیدل مسافت پر صفورا پھوپھی کا گھر تھا تو آٹھ دس منٹ کی مسافت پر صغریٰ پھوپھی کا۔

صفورا پھوپھی کا بھرا پرا گھرانہ تھا۔ اس کے باوجود ان کے گھر میں عجیب سی دہشت اور وحشت کا راج تھا۔ وہ خیر سے پانچ بیٹوں کی ماں تھیں جن میں سے تین بیٹے شادی شدہ تھے۔ تینوں بہوویں بلا کی خوب صورت تھیں (ان کی بہوؤں کو دیکھ کر مجھے سمجھ میں آیا کہ میں صفورا پھوپھی کے من کو کیوں نہ بھائی) لیکن ان کی بہوؤں کی حسین صورتوں پر ہر وقت عجیب سا ہراس چھایا رہتا۔ وہ کوئی بھی کام کرتے وقت کن انکھیوں سے ساس کے تاثرات دیکھتی رہتیں۔ ایسی ساس جو کسی بھی وقت ناخوش ہو کر بہوؤں پر چڑھائی شروع کر دے تو بہوؤں کا سہمے رہنا فطری سی بات ہے۔ مجھے تو لگتا تھا کہ اکثر تو صرف گھبراہٹ کے مارے ان کی بہوؤں سے غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں لیکن صفورا پھوپھی کی ڈکشنری میں معمولی سے معمولی غلطی بھی قابل معافی نہ ہوتی تھی۔

ایک بار میری موجودگی میں انہوں نے چائے میں میٹھا تیز ہو جانے کی پاداش میں گرم گرم چائے کی پیالی پھینک کر بہو کے پاؤں پر ماری، چائے کے پڑ گئے۔

''آج کے دور میں اتنی جہالت..... پلیز معراج! آئندہ مجھے صفورا پھوپھی کے ہاں لے کر مت جایئے گا۔'' مجھ پر واقعی کرخت نقوش والی صفورا پھوپھی کے پاس بیٹھ کر عجیب سا خوف طاری ہونے لگتا تھا۔

''دیکھ لو، صفورا پھوپھی کو پتا چل گیا نا کہ صغریٰ پھوپھی کے ہاں تو تم آئے روز حاضری دیتی ہو اور ان کے گھر مدتوں چکر نہیں لگاتیں تو ہو سکتا ہے، ناراض ہو کر وہ اپنے گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے تم پر بند کر دیں۔'' معراج نے مسکراتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

''کر دیں تو کر دیں۔ اچھا ہے، ان کے ہاں جانے سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے گی اور پھر صغریٰ پھوپھی اور صفورا پھوپھی کا کیا مقابلہ۔ لگتا ہی نہیں دونوں سگی بہنیں ہیں۔'' میں صاف گوئی سے کہہ دیتی تھی۔

یہ سچ تھا کہ تنہائی سے اکتا کر میں اکثر و بیشتر صغریٰ پھوپھی کی طرف چلی جاتی تھی۔ ان کی دونوں بہوؤں سے بھی میری خاصی دوستی ہو گئی تھی اور صغریٰ پھوپھی کو دیکھ کر تو لگتا ہی نہ تھا کہ وہ اپنی بہوؤں کی ساس ہیں۔ کبھی بڑی بہو کو پاس بٹھا کر اس کے لمبے بالوں میں تیل لگا کر چوٹی گوندھ رہی ہوتیں، کبھی چھوٹی بہو کے دوپٹے پر کروشیے کی بیل بنا رہی ہوتیں۔ پوتے، پوتیاں بھی ہر وقت ان ہی کے پاس اودھم مچائے رکھتے۔ وہ ماتھے پر کوئی شکن لائے بغیر پوتے، پوتیوں کی ہر الٹی سیدھی فرمائش پوری کرتیں اور ادھر صفورا پھوپھی کے پاس تو ان کے پوتے، پوتیوں کو پھٹکنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اگر کوئی بچہ غلطی سے ننگے پاؤں چلتا آ کر ان کے سفید تخت پوش پر پیر دھر دیتا تو بچے کی جو درگت بنتی سو بنتی، بچے کی ماں کو بھی سخت سست سننے کو ملتی۔

''حیرت ہے معراج! لوگ تو پوتے، پوتیوں پر

کہ سگے پوتے، پوتیوں پر بھی پیار نہیں آتا۔'' میں معراج کے سامنے حیرت کا اظہار کرتی۔

''اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے تو دنیا کی رنگا رنگی قائم ہے۔'' معراج ہنس کر مجھے سمجھاتے۔

''لیکن پھر بھی سگے بہن بھائیوں کے مزاجوں میں اتنا فرق سمجھ میں نہ آنے والی ہے۔ میاں جی (سسر) اور صغریٰ پھوپھی سراپا شفقت ہیں، نہ صرف اپنوں کے لیے بلکہ پرایوں کے لیے بھی اور صفورا پھوپھی، توبہ..... وہ تو بھی اپنوں سے بھی اپنائیت بھرے انداز میں بات نہیں کرتیں۔ ہر وقت تیوریوں پر بل ڈالے رکھتی ہیں۔ ان کی بہوؤں کی ہمت ہے جو ایسی کرخت ساس کے ساتھ گزارا کر رہی ہیں۔'' میں فردوس بھابھی وغیرہ کی ہمت کی داد دیتی۔ معراج مسکرا دیتے۔

وقت کچھ اور آگے سرکا۔ اللہ نے میری گود میں یکے بعد دیگرے دو بیٹے ڈال دیے۔ مزمل اور مصدق۔ زچگی کا عرصہ بے شک میں اپنے میکے میں گزارتی کہ سسرال میں دیکھ بھال کرنے کے لیے کسی عورت کا وجود نہ تھا۔ بیاہی نندیں دور دراز کے شہروں میں بستی تھیں پھر کون اپنی گھر گرہستی چھوڑ کر اتنے اتنے دنوں کے لیے میرے پاس رہنے آسکتا تھا۔ سو ایسے وقت میں میکے والے ہی کام آئے لیکن سوا مہینہ نہا کر جب میں سسرال آتی تو یہاں صغریٰ پھوپھی کے وجود سے میری ڈھارس بندھی رہتی۔ جب بھی کوئی ضرورت پیش آتی، میں ان کے گھر فون کھڑکا دیتی اور وہ ذرا سی دیر میں اپنا برقع سنبھالتی آن موجود ہوتیں۔

میرے مزمل نے تو پیدائش کے بعد سے چھ ماہ تک مجھے خوب ستایا تھا۔ ایک بار اس کا رونا اسٹارٹ ہو جاتا تو کسی طور پر چپ نہ ہوتا۔ ایسے میں گھبرا کر میں صغریٰ پھوپھی کو بلا لیتی۔ ان کو جانے کیسے پتا چل جاتا کہ مزمل کے کان میں درد ہے یا وہ پیٹ کی اینٹھن نسخہ بھی آزماتیں، کامیاب رہتا اور کبھی کبھی وہ کہتیں کہ مزمل کے کہیں درد، ورد نہیں ہو رہا، وہ صرف ضد میں آکر رو رہا ہے تو واقعی محض صغریٰ پھوپھی کی لوری اور تھپکنے پر مزمل صاحب کی ضد اڑن چھو ہو جاتی اور وہ بیبا بچہ بن کر سو جاتا یا پھر قلقاریاں بھر کر ہنسنے لگتا۔ صفورا پھوپھی محض ایک بار مزمل کو دیکھنے آئی تھیں اور دیکھتے کے ساتھ ہی تبصرہ بھی صادر فرما دیا۔

''منا بالکل تم پر گیا ہے۔ ناک تو دیکھو، کتنی موٹی ہے۔ معراج کا تو کوئی نین نقش چرایا ہی نہیں اس نے۔''

''خبردار صفورا! جو تم نے میرے شہزادوں جیسے پوتے کے نین نقش میں کوئی عیب نکالا اور بچے تو اللہ کی حسین ترین مخلوق ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی ایسا ویسا فقرہ بولنے سے تو خالق کائنات کی ناراضی کا بھی خدشہ ہوتا ہے۔'' میاں جی نے بہن کو بروقت ٹوکا تھا۔ وہ بھائی کے آگے کچھ بول تو نہ پائیں، محض بڑبڑا کر خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

مزمل پانچ برس کا اور مصدق ڈھائی برس کا تھا کہ میاں جی مختصر علالت کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شفیق ترین سسر کے بچھڑنے کا مجھے تو صدمہ تھا سو تھا۔ معراج باپ کے انتقال پر بالکل گم صم ہو کر رہ گئے۔ شاہینہ اور فہمیدہ کا حال بھی بھائی سے کچھ مختلف نہ تھا، ایسے میں صغریٰ پھوپھی نے ہی بھتیجا، بھتیجیوں کی ڈھارس بندھائی۔ ان کے بات کرنے کا انداز بالکل میاں جی جیسا ہی تھا۔ فلسفیانہ انداز گفتگو کے بجائے وہ سیدھے سادے شفیق انداز میں صبر کی تلقین اور صبر کے بعد ملنے والے اجر کا ذکر کرتیں تو بات سیدھی دل میں اتر جاتی۔

مہینہ، ڈیڑھ مہینہ قیام کر کے شاہینہ اور فہمیدہ واپس اپنے اپنے سسرال سدھاریں۔ معراج بھی رفتہ رفتہ سنبھل گئے۔ اگلے برس معراج کی ترقی کا پروانہ آیا تو ساتھ ٹرانسفر لیٹر بھی آ گیا۔ پنڈی ہمارے

ہی کوئی شناسا۔ شروع شروع میں بہت مشکل پیش آئی لیکن پھر دل بھی لگ گیا اور لوگوں سے شناسائی بھی پیدا ہوگئی۔

ملتان والا آبائی مکان کرائے پر چڑھا دیا لیکن پھر معراج کو بہنوں کو وراثت کا شرعی حصہ دینے کا خیال ستانے لگا حالانکہ نہ تو بے چاری نندوں کا ایسا کوئی تقاضا تھا نہ معراج کے بھلے ماس بہنوئیوں نے اس حوالے سے کوئی دباؤ ڈالا تھا لیکن دونوں نندیں سفید پوش گھرانوں میں بیاہی تھیں۔ معراج ہمیشہ ہی بہنوں کے لیے کچھ کرنے کا سوچتے تھے، بس ان کی خودداری اور انا کا سوچ کر کوئی عملی قدم نہ اٹھا پاتے۔ اب ان کی مالی مدد کا ایک مضبوط جواز بن گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ ایک شرعی تقاضا جو پورا کرنا ہی تھا۔ سو مکان فروخت کر کے بہنوں کو ان کا حصہ دیا اور اپنے حصے کی رقم سے پنڈی میں پلاٹ خرید لیا۔

ملتان میں میرا میکہ آباد تھا سو آنا جانا برقرار رہا لیکن پھر ابا جی اور اماں کا یکے بعد دیگرے انتقال ہوگیا۔ بہنیں سب اپنے اپنے گھر بار کی تھیں۔ بڑے بھائی روزگار کے چکر میں دبئی نکل گئے۔ چند برسوں بعد انہوں نے چھوٹے کو بھی اپنے پاس بلوالیا۔ میکے والا آبائی گھر بھی فروخت ہوگیا کہ بھاوجوں نے اپنے میکے والوں کے قریب گھر لے کر بسنے کو ترجیح دی۔ زندگی ایسی ہی عجیب شے ہے، آنے والا کل کیسا ہوگا کوئی گمان بھی نہیں کرسکتا۔

☆☆☆

میرے بچوں کے لیے ان کا آبائی شہر ملتان ایک اجنبی شہر تھا۔ انہوں نے ہوش ہی پنڈی میں آکر سنبھالا تھا۔ یہیں کے تعلیمی اداروں میں تعلیم پائی تھی، سو انہیں یہ شہر ہی عزیز تھا۔ معراج نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر کاروبار شروع کیا تو ان کا ارادہ پھر سے ملتان شفٹ ہونے کا تھا لیکن بچے اس ارادے کے آڑے آئے۔ سو پنڈی میں ہی کاروبار کی بنیاد ڈالی۔ اللہ نے کام میں برکت ڈالی۔ کاروبار روز بروز

سگے رشتہ داروں میں معراج کی دونوں پھوپھیاں ہی وہاں بستی تھیں۔ صفورا پھوپھی سے بات کرنے کو میرا دل ہی نہ کرتا تھا، ہاں صغریٰ پھوپھی کو میں فون کرتی رہتی تھی۔ وہ بہت ضعیف ہوگئی تھیں، انہیں خاصا اونچا سنائی دینے لگا تھا۔ سو رفتہ رفتہ میں نے فون کرنا بھی کم کردیا۔

☆☆☆

پھر ایک روز خبر ملی کہ صغریٰ پھوپھی واش روم میں پھسل کر گر پڑیں اور ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی ہے۔ ضعیفی کی وجہ سے آپریشن کی مکمل نہ ہوسکتی تھیں، اس لیے مستقل معذوری جھیلنا پڑ گئی۔ اب وہ اپنے بستر کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ چلنا، پھرنا تو درکنار وہ تو خود سے کروٹ تک لینے کی روادار نہ تھیں۔ ان کی حالت کے بارے میں جان کر جہاں میرا دل دکھ سے بھر گیا، وہاں ذہن میں ایک عجیب و غریب سوچ بھی پیدا ہوئی۔ صغریٰ پھوپھی جیسی نیک طبیعت خاتون کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا۔ صفورا پھوپھی کے ساتھ ایسا کچھ ہوتا تو مکافات عمل کی توجیہہ پیش کی جاسکتی تھی۔

مگر اگلے ہی پل استغفار پڑھتے ہوئے میں نے اس سوچ کو ذہن سے جھٹک۔ ظاہر ہے خدائی کاموں میں کس کو مداخلت کا حق ہے اور پھر اللہ اپنے نیک بندوں کو بھی تو آزمائشوں سے دوچار کرتا ہے۔ سو ساری سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر صدق دل سے صغریٰ پھوپھی کی تندرستی کے لیے دعا کی لیکن میرا ان سے ملنے اور ان کی عیادت کرنے کو بھی جی چاہ رہا تھا۔

معراج سے ذکر کیا تو پتا چلا کہ وہ تو خود ملتان جانے کا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں۔ بچوں کی پڑھائیوں کے اپنے شیڈول تھے اور پھر وہ اتنے سمجھ دار ہوگئے تھے کہ گھر میں اکیلے رہ سکیں۔ سو میں اور معراج ساری مصروفیات ترک کر کے ملتان کے لیے روانہ ہوگئے۔

یادیں آنکھوں میں ہی بن کر چمکتے ہیں۔ اس گھر میں زندگی کا کیسا سنہرا اور یادگار وقت گزرا تھا۔ معراج کا آبائی گھر (جواب کسی اور کا آبائی گھر بن چکا تھا) اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے دل کی حالت ہی عجیب ہوگئی۔ میرا جی چاہا کہ گھڑی دو گھڑی کے لیے گھر میں جا کر بیتی یادیں دہرالوں لیکن معراج کے چہرے پر نگاہ پڑی تو ارادہ ملتوی کردیا۔ ان کی جذباتی کیفیت چہرے سے مترشح تھی۔

میرا ارادہ سیدھا صغریٰ پھوپھی کے ہاں جانے کا تھا لیکن راستے میں پہلے صفورا پھوپھی کا مکان پڑتا تھا اور ان کا منجھلا بیٹا اتفاق سے گھر کے دروازے پر کھڑا کسی پڑوسی سے محوگفتگو تھا۔ ہمیں دیکھ کر پہلے حیران ہوا پھر بے پناہ خوش۔ پرتپاک انداز میں معراج سے گلے مل کر ہمیں گھر کے اندر لے گیا۔ گھر کے نقشے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی لیکن پھر بھی سب کچھ بدلا بدلا لگ رہا تھا۔

صفورا پھوپھی کا تخت برآمدے میں اپنی مخصوص جگہ پر موجود تھا اور اس تخت پر صفورا پھوپھی نیم دراز تھیں۔ نوید ہمیں سیدھا اماں کے پاس ہی لے گیا تھا۔

"دیکھیے تو اماں! کون آیا ہے؟" اس نے ماں کو بلند آواز میں پکارا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ صفورا پھوپھی بہت بوڑھی اور کمزور ہوگئی تھیں۔ ملگجے لباس اور بکھرے بکھرے بالوں میں پہلی نگاہ میں وہ کوئی مخبوط الحواس بڑھیا لگی تھیں۔ معراج کو پہچان کر انہوں نے سینے سے چمٹایا پھر میری باری آئی۔ نوید نے اپنی بیگم اور دیگر بھاوجوں کو ہماری آمد کے متعلق بتانے کے لیے اندر کے کمرے کا رخ کیا۔

"اے دلہن! ٹھیک طرح سے بیٹھو نا۔ تھکی ہوئی آئی ہو۔ یوں کیا پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئیں۔ پاؤں اوپر کرکے آرام سے بیٹھو بھئی۔"

صفورا پھوپھی نے تخت پر سمٹ کر بیٹھتے ہوئے مجھے آرام سے بیٹھنے کا کہا۔ تخت پر بچھی میلی سی چادر ان کے سوا کسی کو پاؤں دھرنے کی اجازت ہی نہ تھی اور اب وہ میلا کچیلا تخت پوش بتا رہا تھا کہ وقت کتنا بدل چکا ہے۔ ذرا سی دیر میں صفورا پھوپھی کی بہوویں ہم سے ملنے کے لیے اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل آئی تھیں۔

"اندر ڈرائنگ روم میں چلیں معراج بھائی! اے سی چلا ہوا ہے، یہاں اتنی گرمی میں کیسے بیٹھیں گے آپ لوگ۔" فردوس بھابھی نے ہمیں مخاطب کیا۔ ان کے لہجے کا اعتماد بدلتے وقت کا ایک اور مظہر تھا۔

"میرے بچے یہیں بیٹھیں گے میرے پاس۔ تم ایک اور پنکھا لا کر لگادو نا یہاں۔"

صفورا پھوپھی نے بہو کو مخاطب کیا لیکن یہ حکمیہ انداز نہ تھا بلکہ لہجہ کچھ منت بھرا سا تھا۔ چھت پر لگا پنکھا گھوں گھوں کرکے چل رہا تھا۔ اس کی ہوا یقیناً پسینہ خشک کرنے کے لیے ناکافی تھی لیکن مجھے خیال آیا کہ صفورا پھوپھی بھی تو یہیں اتنی گرمی میں لیٹی ہوئی تھیں اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک پیڈسٹل فین ہی ان کے سرہانے لگا ہونا چاہیے تھا

"اور دلہن! بتاؤ، میرے پوتے کیسے ہیں۔ انہیں ساتھ کیوں نہیں لائے اور معراج! تم مجھے اتنے دبلے کیوں لگ رہے ہو۔ اے نائلہ ذرا ڈھونڈ کر میرا چشمہ تو لے آ۔ جانے کس بچے نے ادھر اُدھر کردیا۔ میں چشمہ لگا کر اپنے بچوں کی شکل تو غور سے دیکھ لوں۔"

صفورا پھوپھی نے بہو کو مخاطب کیا۔ نائلہ نے جیسے ساس کی بات غور سے سنی تک نہیں، وہ موڑھا گھسیٹ کر تخت کے قریب بیٹھ گئی اور بہت اشتیاق سے ہمارا حال احوال دریافت کرنے لگی۔ اپنے بچوں کو بلا کر خصوصی طور پر ان کا تعارف کروایا پھر ہمارے بچوں کے متعلق پوچھنے لگی۔

فردوس بھابھی ہماری خاطر تواضع کا سامان کرنے باورچی خانے میں گھس گئیں۔ ذرا دیر

بعد انہوں نے آواز دے کر نائلہ بھابی کو بھی بلالیا۔ اب نوید ہمارے پاس آن بیٹھا، اس ہی کی زبانی پتا چلا کہ باقی تینوں بھائی اپنے اپنے گھر بنا کر وہاں شفٹ ہوگئے تھے۔

''میں تو اپنی اولاد کی شکل دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔ بیویوں نے ایسا مٹھی میں کر رکھا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ عید تہوار پر بھی ماں کے پاس نہیں پھٹکتے اور وہ تو چلو دور چلے گئے، یہ گھر میں بسنے والے دونوں بیٹے، یہ کون سا بھلے ہیں۔ یہ نوید تو ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتا ہے اور ندیم دفتر سے آ کر سیدھا کمرے میں گھس جاتا ہے۔ بوڑھی ماں کے پاس دو گھڑی بیٹھنے کی فرصت تک نہیں ان کے پاس۔''

صفورا پھوپھی نے ہمارے سامنے دکھڑا رویا تھا۔ نوید ماں کا گلہ سن کر مزے سے مسکراتا رہا، جیسے ماں کی ان باتوں کا عادی ہو۔ مجھے صفورا پھوپھی کا ماضی کا دبدبہ اور طنطنہ یاد آیا۔ بہوویں تو بہوویں ان کے تو بیٹے بھی ان کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ کرتے تھے۔

''ارے ارسل سن بیٹا! ذرا میرا چشمہ تو ڈھونڈ کر لا دے۔ اللہ جانے کہاں رکھ کر بھول گئی میں۔''

صفورا پھوپھی نے پاس سے گزرتے پوتے کو آواز دی وہ ''اچھا دادو'' کہہ کر غڑاپ سے ایک کمرے میں گھس گیا۔ ہم نے صفورا پھوپھی کے پاس کوئی دو گھنٹے کے قریب وقت گزرا تھا۔ خوب خاطر مدارت ہوئی۔

فردوس بھابھی اور نائلہ سے خوب گپ شپ بھی رہی۔ ان دو گھنٹوں میں صفورا پھوپھی نے بلا مبالغہ گھر کے ہر فرد کو پکار کر اپنا چشمہ ڈھونڈنے کا کہا مگر کسی نے چشمہ ڈھونڈنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔

''یہ موا چشمہ ہی بار بار گم ہوتا ہے۔ اب چشمہ لگائے بغیر میں اپنا چشمہ خود سے ڈھونڈ بھی تو نہیں سکتی۔'' تھک ہار کر صفورا پھوپھی نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تو میرا دل دکھ سے بھر گیا۔

ماضی کی اس اکھڑ اور دبنگ خاتون کا یہ روپ دیکھ کر ان پر ترس ہی آ سکتا تھا۔ جاتے سمے صفورا پھوپھی نے مجھے اور معراج کو چمٹا چمٹا کر پیار کیا اور ہم سے دوبارہ آنے کا وعدہ لے کر ہمیں جانے کی اجازت دی۔

اب ہمارا رخ صغریٰ پھوپھی کے گھر کی طرف تھا، ہم یہاں بھی بنا اطلاع دیے گئے تھے۔ ہماری آمد پر گھر بھر میں خوش گوار سی ہل چل مچ گئی۔ حیرت کے ساتھ ساتھ سب نے ہی اس اچانک آمد پر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ سب سے زیادہ خوش تو بلاشبہ صغریٰ پھوپھی ہی تھیں۔ انہیں یوں بستر پر پڑے دیکھ کر میری آنکھیں نم ہوگئیں لیکن پھر میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

معذوری کے باوجود صغریٰ پھوپھی کے چہرے پر عجیب سا اطمینان ہلکورے لے رہا تھا۔ ہونٹوں پر وہی پرشفقت مخصوص مسکراہٹ موجود تھی۔ میں بیڈ کی پائنتی پر بیٹھ گئی تو معراج کرسی گھسیٹ کر بیڈ کے بالکل قریب لے آئے۔ پیاری پھوپھی کے ہاتھ تھام کر وہ اپنی نالائقی کا اعتراف کر رہے تھے۔

زندگی کے جھمیلوں میں پڑ کر کتنا عرصہ انہوں نے پھوپھی کو فراموش کیے رکھا۔ وہ اس بات پر اپنی ندامت کا اظہار کر رہے تھے۔

''پگلا ہے تو، میں بھلا کیوں ناراض ہونے لگی تجھ سے۔''

صغریٰ پھوپھی مسکرا کر یہ ہی کہے جا رہی تھیں۔ میں جذباتی کیفیت سے باہر نکلی تو یونہی نظر اٹھا کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ صاف ستھرا، روشن اور ہوادار کمرہ۔ پھر صغریٰ پھوپھی پر نگاہ ڈالی بلاشبہ وہ بہت بوڑھی اور کمزور ہوگئی تھیں لیکن ہلکے رنگوں کے اجلے اجلے کپڑے، سلیقے سے سمٹے ہوئے بال، بستر کی بے شکن چادر اور کمرے کی فضا میں ائر فریشنر کی بھینی سی خوشبو۔ سامنے کی دیوار رنگ برنگے کارڈوں سے بھری ہوئی تھی جن میں اکثر پر گیٹ ویل سون دادی اور اسی طرح کے دعائیہ کلمات درج تھے۔

صغریٰ پھوپھی کی بہوویں کچھ دیر ہمارے پاس

ہنس گئی تھیں۔ اتنے میں ان کی پوتی نے کمرے میں جھانکا۔ وہ ہماری موجودگی کی وجہ سے اندر آنے سے شرما رہی تھی۔

''یہ کشف ہے نا؟'' چودہ پندرہ برس کی اس پیاری سی بچی کو دیکھ کر میں نے استفسار کیا۔ صغریٰ پھوپھی نے اثبات میں سر ہلایا۔ کشف بھی جھجکتے ہوئے اندر آئی تھی پھر ہمیں سلام کر کے کمرے میں بچھے دوسرے سنگل بیڈ پر بکھری کتابیں سمیٹیں اور جلدی سے کمرے سے چلی گئی۔

''جب سے معذور ہوئی ہوں، پوتے، پوتیاں ایک لمحے کو اکیلا نہیں چھوڑتے۔ کبھی کوئی کتابیں لے کر یہاں پڑھنے آبیٹھتا ہے تو کبھی کوئی اخبار، رسالہ لا کر مجھے پڑھ کر سنانے لگتا ہے۔ رات کو بھی بچوں نے میرے پاس سونے کی باریاں مقرر کر رکھی ہیں۔ اللہ کا بڑا احسان ہے جو اتنی سعادت مند اولاد سے نوازا۔''

صغریٰ پھوپھی نے ہولے سے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ میں نے اور معراج نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ یقیناً میری طرح معراج کو بھی اس لمحے صفورا پھوپھی ہی یاد آئی تھیں۔ رات کو ہم نے صغریٰ پھوپھی کے ہاں ہی قیام کیا۔

ڈنر کے بعد جب گپ شپ کی محفل برخاست ہوئی تو میں اور معراج اپنے آرام کے لیے مخصوص کیے جانے والے کمرے میں آ گئے۔ تھکاوٹ کے باوجود ہم دونوں میاں بیوی دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ ہم دونوں نے آپس میں اپنی جذباتی کیفیت شیئر کی۔ ماضی کی یادیں دہرائیں پھر ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے زمانے کی بے ثباتی پر بھی اظہار خیال کیا۔

''سچ معراج! مجھے تو صفورا پھوپھی کی حالت دیکھ کر سخت شاک لگا، حالانکہ صغریٰ پھوپھی معذور ہیں پھر بھی ان کی حالت صفورا پھوپھی جیسی قابل رحم نہیں۔ انہیں تو دیکھ کر عبرت آ رہی تھی۔'' میں نے جھرجھری لے کر کہا۔

پھوپھی نے رعب داب والی ایک بھرپور زندگی گزاری۔ انہوں نے اپنے گھر والوں پر حکومت تو کی لیکن ان کے دلوں پر حکومت نہ کر سکیں۔ اب وہ اپنا دور گزار چکیں تو خود بخود معزولی ان کا مقدر بن گئی۔ یہ ہی قانون قدرت ہے۔ ہر عروج کو زوال ہے۔''

معراج نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

''اور صغریٰ پھوپھی کے متعلق کیا کہیں گے۔ وہ بھی تو عمر کے آخری حصے میں ہیں لیکن گھر میں ان کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔'' میں نے معراج سے پوچھا۔

''صغریٰ پھوپھی، صفورا پھوپھی کی طرح اپنے گھر کی مطلق العنان حکمران نہ تھیں۔ انہوں نے گھر والوں پر حکومت کرنے کے بجائے ان کے دلوں پر حکومت کی تھی۔ اللہ کا ان پر خصوصی کرم ہوا کہ اولاد بھی فرماں بردار ملی۔ زندگی بھر جو پیار صغریٰ پھوپھی نے بیٹے، بہوؤں اور پوتے پوتیوں پر لٹایا، وہ وہی پیار انہیں واپس لوٹا رہے ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ معذوری کے باوجود معزولی صغریٰ پھوپھی کا مقدر نہیں بنی۔ گھر میں ان کی حیثیت اب بھی برقرار ہے۔''

معراج نے کس خوبی سے چند جملوں میں دونوں پھوپھیوں کی زندگی کا موازنہ کر دیا تھا۔ میں دل سے ان کی بات کی قائل ہو گئی تھی۔ بے شک معذوری اللہ کی طرف سے آئی ہوئی بہت بڑی آزمائش سہی لیکن ''معزولی'' اس سے کہیں بڑی آزمائش ہوتی ہے لیکن جو دلوں پر حکومت کا ہنر جانتے ہیں، وہ عموماً اس آزمائش سے محفوظ رہتے ہیں۔

ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے میں نے معراج کی دونوں پھوپھیوں کی آزمائش ختم ہونے کی دعا کی، پھر ٹیبل لیمپ آف کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

کے عارضہ میں مبتلا تھیں اور آج کل ان کا ڈائیلاسس چل رہا تھا۔ میں ان کی عیادت کے لیے ان کے ہاں آئی بیٹھی تھی۔ ان کا پلنگ ٹی وی لاؤنج میں تھا اور میں ان سے علاج معالجے اور ادویات کے بارے میں محو گفتگو تھی۔ ناصرہ (دوست) کچن میں چائے بنا رہی تھی۔

اتنے میں تقریباً چودہ پندرہ سال کی ایک دھان پان سی لڑکی ہاتھ میں جھاڑو اور پانی سے بھری بالٹی لیے داخل ہوئی، اس نے مسلے اور ملگجے سے کپڑے زیب تن کر رکھے تھے مگر اس کا منہ ہاتھ دھلا ہوا اور بال بھی سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ اس نے آتے ہی تن دہی سے پہلے سارے لاؤنج میں جھاڑو پھیری۔ پھر بالٹی سے پوچا نکال کر فرش چمکانے لگی۔

"باجی! تھوڑا ایک سائیڈ پر ہو جائیں۔ میں نے پلنگ کے نیچے پوچا لگانا ہے۔" اس نے ٹھٹکتی ہوئی آواز میں کہا۔

میں سرک کر پلنگ کی پائنتی کی جانب ہو گئی۔ وہ پوچا لگاتی ہوئی گھوم کر دوسری سائیڈ پر چلی گئی۔

اتنے میں ناصرہ چائے اور دیگر لوازمات سے بھری ٹرے لیے اندر داخل ہوئی۔ اس نے ٹرے

حمیرا شفیع

گمنام قارئین کے نام

درمیانی ٹیبل پر دھری اور پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

"شمو نے ابھی تک صفائی ہی نہیں مکمل کی ہے۔ کچن میں جو ڈھیر برتنوں کا جمع ہے اس سے کب نمٹے گی۔"

شمو جو پوچا لگاتے ہوئے پلنگ کے نیچے غروب ہو چکی تھی۔ اس نے کوئی ردعمل نہ دیا تو ناصرہ جھنجلا اٹھی۔ "شمو جلدی کرو، نکلو یہاں سے....."

اب شمو غریب ہڑبڑا کر پلنگ کے نیچے سے برآمد ہوئی۔ ساتھ ہی اس کے ہاتھ سے کچھ چھوٹ کر فرش پر گرنے کی آواز آئی۔

"کیا کر رہی تھیں تم.....؟ کیا چھپا رہی

pklibrary.com

ہو.....؟

ناصرہ گھوم کر دوسری طرف چلی گئی اور کڑک دار آواز میں پوچھا، ساتھ ہی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پلنگ کے نیچے جھانکنے لگی۔

میں نے گھبرا کر سامنے ٹیبل پر دھرا اپنا پرس اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

(میرا سیل فون اور واپسی کا کرایہ تھا اس میں)

''اماں! یہ دیکھیں.....! یہ ہیں اس کے کرتوت'' ناصرہ نے ہاتھ بڑھا کر پلنگ کے نیچے سے کچھ نکالا اور ہاتھ میں پکڑ کر لہرانے لگی۔

''نیچے چھپ کر یہ پڑھ رہی تھیں محترمہ''

ناصرہ کے ہاتھ میں ڈائجسٹ لہرا رہا تھا۔

میں بھونچکی رہ گئی۔

''وہ باجی! بس تھوڑا سا پڑھا تھا۔ دو صفحے کی کہانی رہ گئی تھی۔'' شمو نے منمناتی ہوئی آواز میں اقرار جرم کیا۔

''سمیٹو یہ سب اور چلو کچن میں.....!'' ناصرہ کھٹ کھٹ کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

''کتنا پڑھی ہو تم.....؟'' میں نے پلٹ کر پوچھا۔

''وہ..... باجی..... چوتھی جماعت میں تھی کہ اماں نے ہٹا لیا۔ اس نے دو گھروں کا اور کام پکڑ لیا تھا۔''

''تمہیں کہانیاں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کردار وغیرہ، اردو پڑھ لیتی ہو آسانی سے.....؟''

میری تو حیرت ہی ختم نہیں ہو رہی تھی۔

''اردو تو ٹوٹی پھوٹی سی جو پڑھ لیتی ہے سو پڑھ لیتی ہے۔ اگر تم کبھی اسے ناصرہ کے ساتھ کہانیوں کے کردار پر بحث کرتا سن لو تو دنگ رہ جاؤ۔''

دوست کی امی بتا رہی تھیں اور شمو دوپٹے کا کونا دانتوں تلے دبائے شرمیلی سی ہنسی ہنس رہی تھی۔

''شمو..... شمو!'' اتنے میں ناصرہ نے کچن سے ایک اور کڑک دار آواز لگائی اور شمو جلدی سے پوچھا اور بالٹی سنبھالتی ہوئی وہاں سے نکل گئی اور میں اپنی جگہ پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

آپی! یہ کوئی افسانہ نہیں، کسی ناولٹ یا ناول کا اقتباس بھی نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ ہمارے معاشرے میں ادھر ادھر ایسے ہزاروں کردار بکھرے پڑے ہیں جو ان ڈائجسٹ کے شیدائی ہیں۔

ان گمنام قارئین میں کچھ ایسی بھی ہیں جن کو کبھی نیا شمارہ تو نصیب ہی نہیں ہوا۔ کٹا پھٹا، پرانا رسالہ جہاں سے بھی مل جائے وہ اسے کسی متاع عزیز کی طرح سنبھال لیتی ہیں۔ کچھ ایسی بھی ہیں جو اپنے جیب خرچ سے دس دس روپے بچا کر اگر خرید بھی لیں تو گھر بھر کے کمر توڑ دینے والے کاموں سے بامشکل فرصت کے چند لمحے چرا کر پڑھ پاتی ہیں۔ کبھی کچن کی ہوشربا گرمی میں بیٹھ کر پڑھ لیا اور کبھی اسٹور روم کی حبس زدہ فضا میں.....!

ہزار جتنوں سے پڑھ بھی لیں تو ان کے اتنے وسائل ہی نہیں ہیں کہ آپ تک اپنی رائے پہنچا سکیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس جدید دور میں جب ترقی یافتہ ممالک کی عورت چاند اور خلا تک سے گھوم پھر کر آچکی ہے۔ ہماری عورت کے پاس آج بھی ایسے باپ، بھائی اور شوہر موجود ہیں جو گھر کی عورت کا نیلے لفافے میں بند خط پوسٹ کروانا گناہ کبیرہ خیال کرتے ہیں۔

حالانکہ ان کا بھی دل چاہتا ہوگا کہ وہ بھی کبھی کسی کردار کو سراہیں۔ کسی غزل یا نظم کی تعریف کریں۔ کسی ناولٹ، ناول پر اپنی رائے دیں۔ مگر دل مسوس کر ہی رہ جاتی ہوں گی۔ میرا آج کا خط ایسی ہی گمنام قارئین کے نام ہے۔

میرا سلام ہے ان کی لگن کو جو اتنی مزاحمت کے باوجود اپنے شوق اور طلب کو کسی نہ کسی طرح سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے آنے والے وقت میں کبھی ان میں سے کسی کی نظر سے میرا یہ خط گزرے اور ان کا دل شاد کر جائے یہ سوچ کر کہ ان کے بارے میں بھی سوچا جاتا ہے۔ وہ بھی کسی نظر یا دھیان میں رہتی ہیں۔ گمنام قارئین کو سلام۔

☆

شاید

میں شاید تم کو یکسر بھولنے والا ہوں
شاید۔ جاں جاں شاید
کہ اب تم مجھ کو پہلے سے زیادہ یاد آتی ہو
ہے دل غمگین بہت غمگین
کہ اب تم یاد دل دارانہ آتی ہو
شمیم دور ماندہ ہو
بہت رنجیدہ ہو مجھ سے
مگر پھر بھی
مشام جاں میں میرے آشتی مندانہ آتی ہو
جدائی میں بلا کا التفات مجرمانہ ہے
قیامت کی خبر گیری ہے
بے حد ناز برداری کا عالم ہے
تمہارے رنگ مجھ میں اور گہرے ہوتے جاتے ہیں
میں ڈرتا ہوں
میرے احساس کے اس خواب کا انجام کیا ہوگا
یہ میرے اندرون ذات کے تاراج گر
جذبوں کے بیری وقت کی سازش نہ ہو کوئی
تمہارے اس طرح ہر لمحہ یاد آنے سے
دل سہما ہوا سا ہے
تو پھر تم کم ہی یاد آؤ
متاع دل متاع جاں تو پھر تم کم ہی یاد آؤ
بہت کچھ بہہ گیا ہے سیل ماہ و سال میں
اب تک
سبھی کچھ تو نہ بہہ جائے
کہ میرے پاس رہ بھی کیا گیا ہے
کچھ تو رہ جائے

جون ایلیا

جن کی پرواز کے چرچے کبھی افلاک میں تھے
آنکھ جھپکی تھی کہ وہ عرش نشیں خاک میں تھے

جس پہ اب تہمتِ شب رنگ کے آوازے ہیں
کتنے سورج تھے کہ دامن صد چاک میں تھے

جانے کس وادیٔ بے ابر کی قسمت ٹھہرے
ہائے وہ لوگ جو اس موسم سفاک میں تھے

جن سے دلداریٔ یاراں کے قرینے یاد آئیں
ایسے تیور بھی مرے لہجۂ بے باک میں تھے

زرد پتوں کی طرح خواب اڑتے پھرتے تھے
پھر بھی کچھ رنگ مرے دیدۂ نمناک میں تھے

شہرِ بے رنگ! ترے لوگ گواہی دیں گے
ہم سے خوش رنگ بھی تیرے خس و خاشاک میں تھے

افتخار عارف

pklibrary.com

رنگ

زندگی کی کہانی رنگوں سے عبارت ہے
خزاں رُتوں میں مسکرانا مہارت ہے
یہ سلسلے بھی عجیب ہوتے ہیں
رنگ دیکھنا ان کو نصیب ہوتے ہیں
زندگی کے جتنے قریب ہوتے ہیں
کچھ رنگ ہوتے ہیں اگر خاص
کچھ بن جاتے ہیں خاص الخاص
کچے رنگوں کے بیچ میں کچھ
دیرپا اور پکے بھی ہوتے ہیں
کبھی جھوٹے تو کبھی سچے ہوتے ہیں
کچھ بُرے اور کچھ اچھے ہوتے ہیں
ہجر کے رنگ گہرے ہوتے ہیں
وصل کے سنہرے ہوتے ہیں
کئی رنگوں کو پہنے چہرے ہوتے ہیں
کچھ رنگوں کے لیکن ان پہ پہرے ہوتے ہیں

ن م

وعدۂ حور پہ بہلائے ہوئے لوگ ہیں ہم
خاک بولیں گے کہ دفنائے ہوئے لوگ ہیں ہم

یوں ہر اک ظلم پہ دم سادھے کھڑے ہیں
جیسے دیوار میں چنوائے ہوئے لوگ ہیں ہم

اس کی ہر بات پہ لبیک بھلا کیوں نہ کہیں
زر کی جھنکار پہ بلوائے ہوئے لوگ ہیں ہم

جس کا جی چاہے وہ انگلی پہ نچا لیتا ہے
جیسے بازار سے منگوائے ہوئے لوگ ہیں ہم

ہنسی آئے بھی تو ہنستے ہوئے ڈر لگتا ہے
زندگی یوں تیرے زخمائے ہوئے لوگ ہیں ہم

آسمان اپنا، زمیں اپنی، نہ سانس اپنی تو پھر
جانے کس بات پہ اترائے ہوئے لوگ ہیں ہم

جس طرح چاہے بنالے ہمیں وقت قتیلؔ
درد کی آنچ پہ پگھلائے ہوئے لوگ ہیں ہم

قتیلؔ شفائی

pklibrary.com

شگفتہ جاہ

رنگارنگ پھول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

" نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ایک آدمی بہادری کے اظہار کے لیے جنگ کرتا ہے، ایک آدمی اپنے قبیلے کی حمایت میں لڑتا ہے۔ ایک آدمی دکھاوے کے لیے لڑتا ہے (کیا انہیں بھی فی سبیل اللہ جہاد کرنے والے میں شمار کیا جاسکتا ہے؟)"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص اس مقصد کے لیے جنگ کرتا ہے کہ اللہ کا کلمہ (اسلام) بلند ہو، وہ اللہ کی راہ میں (جہاد کرنے والا) ہے۔"

بہتری،

امام غزالیؒ نے فرمایا۔

" اللہ تعالیٰ جس کی بہتری چاہتا ہے اس کو ہمیشہ بلا اور بیماری کے ذریعے تنبیہ کرتا ہے۔ اسی بنا پر بزرگوں نے کہا ہے کہ دین ان تین باتوں سے کبھی خالی نہیں ہوگا۔ مفلسی، بیماری اور ذلت و خواری۔"

تقویٰ کا راز،

کسی نے حضرت حسن بصری سے پوچھا کہ آپ کے تقویٰ کا راز کیا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ چار چیزیں ہیں جو میری سمجھ میں آگئیں۔

1۔ میں سمجھ گیا کوئی شخص میرا رزق ختم نہیں کرسکتا چنانچہ میرا دل مطمئن ہوگیا۔

2۔ میں سمجھ گیا کہ میری جگہ کوئی اور عبادت اور نیک عمل نہیں کرسکتا چنانچہ میں نے خود عمل کرنا شروع کردیا۔

3۔ میں سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے چنانچہ کچھ غلط کرنے سے شرم آنے لگی۔

4۔ میں سمجھ گیا کہ موت میری منتظر ہے، چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی تیاری شروع کردی۔

طوبیٰ، ردا ۔ کراچی

مہکتی کلیاں،

☆ جس دن تم دوسروں کا درد محسوس کرنے لگو تو سمجھ لینا کہ تم "اشرف المخلوقات" میں سے ہو۔

☆ ان لوگوں کو وضاحتیں دے دے کر اپنا وقت اور سکون برباد نہ کرو، جو ہمیشہ آپ کو غلط سمجھنے کے لیے مصروف عمل رہتے ہیں۔

☆ آپ کا بہت بڑا سرمایہ وہ لوگ ہیں جو آپ کی غیر موجودگی میں اپنے رب سے آپ کے لیے دعاؤں میں خیر مانگتے ہیں۔

درخواست،

دو ماہ کی چھٹیاں گزارنے کے بعد ملازم نے اگلے روز جب اپنی شادی کی دو دن کی درخواست دی تو مالک نے حیرانی سے پوچھا۔

"دو مہینے کی چھٹی میں تم نے شادی کیوں نہیں کی؟ ان چھٹیوں میں تم نہ صرف سکون و اطمینان سے شادی کرسکتے تھے بلکہ ہنی مون منانے بھی چلے جاتے؟"

ملازم نے فوراً جواب دیا۔

"اجی چھوڑیے جناب! کون اپنی چھٹیاں غارت کرواتا۔"

ام کمال ۔ فیصل آباد

pklibrary.com

لفظ لفظ موتی

- زبان درست ہو جائے گی تو دل بھی درست ہو جائے گا۔
- جس نے مصیبت میں صبر کرنا سیکھ لیا، اس نے زندگی کو جیت لیا۔
- کسی کو تعلیم دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے دو مرتبہ تعلیم حاصل کی۔
- ناکامی کا خوف ہی ناکام ہونے کی بنیادی وجہ ہے۔
- اچھی کتاب سے اچھا دوست کوئی نہیں۔
- اپنے ماں باپ اور استاد کی کبھی شکایت نہ کرو۔

رنگ اور خواتین

- جو خواتین سبز رنگ پسند کرتی ہیں، وہ ہر حال میں خوش رہتی ہیں۔
- جن خواتین کی پسند سُرخ رنگ ہو، وہ ہمیشہ غصے میں رہتی ہیں۔
- سفید رنگ پسند کرنے والی خواتین امن پسند ہوتی ہیں۔
- وہ خواتین جو رونا دھونا مچائے رکھتی ہیں، کالا رنگ پسند کرتی ہیں۔
- گلابی رنگ چاہنے والی خواتین قناعت پسند ہوتی ہیں۔
- پیلا رنگ پسند کرنے والی خواتین نرم خو ہوتی ہیں۔
- وہ خواتین بلندی کی جستجو رکھتی ہیں، جو نیلا رنگ پسند کرتی ہیں۔
- نارنجی رنگ پسند کرنے والی خواتین نخرے والی ہوتی ہیں۔
- جامنی رنگ چاہنے والی خواتین سچائی پسند ہوتی ہیں۔
- بھورا رنگ پسند کرنے والی خواتین محنتی اور سخت جان ہوتی ہیں۔

پتی کہاں ہے

شوہر: "بیگم! پتی کہاں پڑی ہے؟ پورا کچن چھان مارا ہے؟"

بیگم: "تم مردوں کو کبھی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ سب کچھ ہمیں بتانا پڑتا ہے۔ ایک چھوٹا سا کام ذمہ لگا دو، وہ بھی پہاڑ بن جاتا ہے۔ سالنے برتنوں والی الماری کھولو، اس میں مرچ مسالوں والا خانہ ہے۔ اس میں بسکٹوں کا ڈبہ پڑا ہوگا جس پر نمک لکھا ہوا ہے۔ بس اسی میں پتی پڑی ہے۔"

دولت کہیں جسے

- باپ چاہتا ہے کہ مکر و فریب اور تمام ہتھکنڈوں سے بہت ساری دولت سمیٹ کر اپنے بیٹے کے لیے چھوڑ جائے۔ اور بیٹا منتظر ہے کہ کب باپ وفات پائے اور وہ مال و دولت پر قبضہ جمائے۔
- دولت مند بیوہ کے آنسو جلد خشک ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کا نصف سہاگ (دولت کی شکل میں) قائم رہتا ہے۔
- دولت مندوں کا یہ خیال ہے کہ غریب مسرت و شادمانی سے مالا مال ہیں۔ اتنا ہی احمقانہ ہے، جتنا غریبوں کا یہ یقین کہ امیر بہت خوش ہیں۔
- دولت مند ہونے سے آدمی اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور دولت مند نہ ہونے سے لوگ اس کو بھول جاتے ہیں۔

حادثات اور صنفِ نازک

ٹریفک کے بہت سے مسائل اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ بہت سے لوگ اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی دوستوں، منگیتروں کو مرعوب کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تیز رفتاری دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ بہت سے لوگ اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی

pklibrary.com

Khawateen Digest December 2021

بیویوں کی ہدایت پر زیادہ سے زیادہ سست رفتاری سے گاڑیاں چلاتے ہیں۔

بچرادان نہ بنیں،

معروف عرب مفکر ڈاکٹر طنطاوی مرحوم لکھتے ہیں ایک دن میں ٹیکسی سے ایرپورٹ جارہا تھا، ہم سڑک پر اپنی لائن میں جارہے تھے کہ اچانک کار پارکنگ سے ایک شخص انتہائی سرعت کے ساتھ گاڑی لے کر روڈ پر چڑھا۔ قریب تھا کہ اس کی گاڑی ہماری ٹیکسی سے ٹکرا لیتے لیکن ٹیکسی ڈرائیور نے لمحوں میں بریک لگائی اور ہم کسی بڑے حادثے سے بچ گئے۔ ہم ابھی سنبھلے نہیں تھے کہ خلاف توقع وہ گاڑی والا ہم پر چیخنے چلانے لگ گیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو خوب کوسا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اپنا غصہ روک کر اس سے معذرت کرلی اور مسکرا کر گاڑی آگے بڑھادی۔

مجھے ٹیکسی ڈرائیور کے اس عمل پر حیرت ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا۔

"غلطی اس کی تھی اور غلطی بھی ایسی کہ ہم کسی بڑے حادثے سے دوچار ہوسکتے تھے۔ ہماری جان بھی جاسکتی تھی پھر آپ نے اس سے معافی کیوں مانگی؟"

ٹیکسی ڈرائیور کا جواب میرے لیے ایک سبق تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"کچھ لوگ کچرے سے بھرے ٹرک کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ گندگی اور کچرا لاد کر گھوم رہے ہوتے ہیں۔ وہ غصہ، مایوسی، ناکامی اور طرح طرح کے داخلی مسائل سے بھرے پڑے ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے اندر جمع اس کچرے کو خالی کرنا ہوتا ہے۔ وہ جگہ کی تلاش میں ہوتے ہیں، جہاں جگہ ملی، یہ اپنے اندر جمع سب گندگی کو انڈیل دیتے ہیں لہٰذا ہم ان کے ڈسٹ بین اور کچرادان کیوں بنیں؟"

اس طرح کے کسی فرد سے زندگی میں کبھی واسطہ پڑجائے تو ان کے منہ نہ لگیں بلکہ مسکرا کر گزر جائیں اور اللہ تعالیٰ سے ان کی ہدایت کے لیے دعا کریں۔

(عربی سے ترجمہ)

نمرہ عاقب۔ گرین سٹی

وقت مختلف لوگوں کی نظر میں،

٭۔ وقت کو پیچھے سے مت پکڑو، اسے آگے سے روک کر اس پر قابو پانے کی کوشش کرو۔

(نیوٹن)

٭۔ وقت خام مسالے کی مانند ہے جس سے آپ جو کچھ چاہیں بنا سکتے ہیں۔

(امام غزالیؒ)

٭۔ وقت ایک ایسی زمین ہے جس میں محنت کیے بغیر کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ اگر محنت کی جائے تو یہ زمین پھل دیتی ہے اور بے کار چھوڑ دی جائے تو اس میں خار دار جھاڑیاں اگ آتی ہیں۔

(افلاطون)

٭۔ وقت ضائع کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ وقت بھی آپ کو ضائع کررہا ہے۔

(ارسطو)

٭۔ وقت روٹی کے گالوں کی مانند ہے جس کا اسراف واجب نہیں۔ یاد رکھو تم دولت کما سکتے ہو، وقت میں اضافہ نہیں کرسکتے۔

(فرینکن)

٭۔ آپ مسرور ہوں یا مغموم، تکلیف اور مصیبت سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ آپ کے پاس وقت نہ ہو۔

(پنولین بونا پارٹ)

نادیہ یاسر۔ گوجرخان

موتی،

نفس کو تین چیزوں سے قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔

، خاموشی کے خنجر سے۔

، بھوک کی تلوار سے۔

، تنہائی کے نیزے سے۔

عائشہ۔ گوجرہ

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

طوبیٰ، ردا ممتاز ______ کراچی

اندھے عدم وجود کے گرداب سے نکل
یہ زندگی بھی خواب ہے تو خواب سے نکل
تو مٹی، پانی، آگ، ہوا میں قید ہے کیوں
ہونے کا دے جواب، تب وتاب سے نکل

فاکہہ سہیل ______ کراچی

تمہارا نام لکھنے کی اجازت چھن گئی جب سے
کوئی بھی لفظ لکھتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
ہزاروں موسموں کی حکمرانی ہے میرے دل پر
وصی میں جب بھی تنہا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں

ارم کمال ______ فیصل آباد

اک مہک سی فضا میں ہے رقصاں
کہیں قرب وجوار میں ہے وہ

نادیہ یاسر ______ گوجرخان

یہ گرد بیٹھ جائے تو معلوم کر سکوں
آنکھیں نہیں رہیں کہ تماشا نہیں رہا

اقرا، عائشہ ______ کراچی

اگر کہیں تو کسی کو نہ اعتبار آئے
کہ ہم کو راہ میں اک آشنا نے لوٹ لیا

ماریہ عاطف ______ گوجرہ

ہم سے یہ بارِ لطف اٹھایا نہ جائے گا
احسان یہ کیجیے کہ احسان نہ کیجیے

ثمرہ عاقب ______ گرین سٹی

جو بھی چاہو ملے گا جنون کے عوض
سکہ چلتا نہیں دوسرا عشق میں

تحریم ______ محراب پور

اے گردشِ ایام ہمیں رنج بہت ہے
کچھ خواب تھے ایسے کہ بکھرنے کے نہیں تھے

ماروی سلیم ______ ملیر

مکمل چاند ہو بہو تم جیسا تھا محسن
وہی حسن، وہی غرور، وہی دوری

صدف عمران ______ کے، ڈی، اے

جب ہو سکے تو بھلا دینا رنجش دل کی
کہ محبتوں کا اصول ہے درگزر کرنا
تیرے طرزِ تغافل سے گلہ تو نہیں
ہمیں آتا نہ تھا دلوں میں گھر کرنا

اریبہ شمشاد ______ آزاد کشمیر

بساطِ زیست پہ مجھو میری ہی شکست ہے
میں بھی انا پرست ہوں، وہ بھی انا پرست ہے

لائبہ، ایمن ______ مظفر آباد

اب میں جیت بھی جاؤں تو دل خوش نہیں ہوتا
جس شخص کو ہارا ہے، وہ انمول بہت تھا

عنایہ ملک ______ پشاور

عنوانِ زندگی پہ بس اتنا ہی لکھ پائی!
بہت کمزور رشتے تھے بہت مضبوط لوگوں سے

فضہ بلال ______ ڈیفنس گارڈن

ہیں غنیمت یہ چار لمحے بھی
پھر نہ ہم ہیں نہ یہ تماشا ہے
زندگی ایک دکان کھلونوں کی
وقت بگڑا ہوا سا بچہ ہے

ماہا سلطان ______ کراچی

بغیر وجہ کے نہیں بے رخی عدم ان کی
ضرور ہم سے وہ رغبت زیادہ رکھتے ہیں

صفیہ مہر ______ رحیم یار خان

یہ بھی آداب تمہارے ہیں تمہیں کیا معلوم
ہم تمہیں جیتنے کے ہارے ہیں تمہیں کیا معلوم

نمرہ، اقراء کی ڈائری سے

نصیر ترابی کی غزل آپ کی نذر کر رہی ہوں۔
نصیر ترابی کہتے ہیں۔
دراصل یہ غزل میں نے فال آف ڈھاکا پہ لکھی تھی۔ 16 دسمبر 1971ء کو جب فال آف ڈھاکا کی اطلاع دفتر میں ملی تو ایک دم میں رونے لگا۔ آنسو بہنے لگے تو میں نے یہ غزل لکھی۔

وہ ہم سفر تھا مگر اس سے ہم نوائی نہ تھی
کہ دھوپ چھاؤں کا عالم رہا، جدائی نہ تھی

عداوتیں تھیں، تغافل تھا، رنجشیں تھیں مگر
بچھڑنے والے میں سب کچھ تھا، بے وفائی نہ تھی

بچھڑتے وقت ان آنکھوں میں تھی ہماری غزل
غزل بھی وہ جو کسی کو ابھی سنائی نہ تھی

کبھی یہ حال کہ دونوں میں یک دلی تھی بہت
کبھی یہ مرحلہ کہ جیسے آشنائی نہ تھی

محبتوں کا سفر اس طرح بھی گزرا تھا
شکستہ دل تھے مسافر، شکستہ پائی نہ تھی

عجیب ہوتی ہے راہ سخن بھی دیکھ نصیر
وہاں بھی آ گئے آخر جہاں رسائی نہ تھی

طوبیٰ، ردا کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر افتخار عارف کی یہ غزل آپ سب کی نذر۔

کوئی مژدہ نہ بشارت نہ دعا چاہتی ہے
روز اک تازہ خبر خلق خدا چاہتی ہے

موج خوں سر سے گزرتی تھی سو وہ بھی گزری
اور کیا کوچۂ قاتل کی ہوا چاہتی ہے

شہر بے مہر میں لب بستہ غلاموں کی قطار
نئے آئین اسیری کی بنا چاہتی ہے

کوئی بولے کہ نہ بولے قدم اٹھیں نہ اٹھیں
وہ جو اک دل میں ہے دیوار اٹھا چاہتی ہے

ہم بھی لبیک کہیں اور فسانہ بن جائیں
کوئی آواز سر کوہ ندا چاہتی ہے

یہی لو تھی کہ الجھتی رہی ہر رات کے ساتھ
اب کے خود اپنی ہواؤں میں بجھا چاہتی ہے

عہد آسودگیٔ جاں میں بھی تھا جاں سے عزیز
وہ قلم بھی مرے دشمن کی انا چاہتی ہے

پھر پلاتی گل آئی ہے اور موج خزاں
گفتگو میں روش باد صبا چاہتی ہے

خاک کو ہمسر مہتاب کیا رات کی رات
خلق اب بھی وہی نقش کف پا چاہتی ہے

حبیبہ خان کی ڈائری سے

وقت بڑی ظالم چیز ہے۔ وقت کے سفر میں جان سے پیارے دوست، احباب ساتھی بچھڑ جاتے ہیں۔ شہر، گلیاں، کوچے ویران ہو جاتے ہیں۔ بے درد انسان کو بے وقعت کر دیتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خزاں کے بعد بہار آتی ہے اور نئے پھول کھل جاتے ہیں۔

ناصر کاظمی کی اس غزل میں ان ہی کیفیات کا اظہار ہے۔

کہیں اجڑی سی منزلیں، کہیں ٹوٹے پھوٹے بام و در
یہ وہی دیار ہے دوستو جہاں لوگ پھرتے تھے رات بھر

میں بھٹکتا پھرتا ہوں دیر سے یونہی شہر شہر نگر نگر
کہاں کھو گیا مرا قافلہ کہاں رہ گئے مرے ہم سفر

جنہیں زندگی کا شعور تھا انہیں بے زری نے بجھا دیا
جو گراں تھے سینۂ خاک پر وہی بن کے بیٹھے ہیں معتبر

مری بے کسی کا نہ غم کرو مگر اپنا فائدہ سوچ لو
تمہیں جس کی چھاؤں عزیز ہے میں اسی درخت کا پھول ہوں

یہ بجا کہ آج اندھیر ہے، ذرا رُت بدلنے کی دیر ہے
جو خزاں کے خوف سے خشک ہے، وہی شاخ لائے گی برگ و بر

سحر سہیل کی ڈائری سے

موجودہ حالات کی عکاس یہ غزل قارئین کی نذر کر رہی ہوں۔

چاند پر بستیاں بساؤ گے
چاندنی پھر کہاں سے پاؤ گے

سلب کر لیں سماعتیں سب کی
کس کو اب داستاں سناؤ گے

چھین لی شہر بھر کی گویائی
اب صدائیں کہاں سے لاؤ گے

سب کی آنکھیں نکال دیں تم نے
اب یہ آنکھیں کسے دکھاؤ گے

ہر طرف نفرتوں کے کیکر ہیں
وہ ہی کانٹو گے جو اُگاؤ گے

رافعہ رابیل کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر ناصر کاظمی کی یہ غزل آپ سب کی نذر

تم آ گئے ہو تو کیوں انتظارِ شام کریں
کہو تو کیوں نہ ابھی سے کچھ اہتمام کریں

خلوص، مہر و وفا لوگ کر چکے ہیں بہت
میرے خیال میں اب اور کوئی کام کریں

یہ خاص و عام کی بے کار گفتگو کب تک
قبول یہ بھی جو فیصلہ عوام کریں

ہر آدمی نہیں شائستۂ رموزِ سخن
وہ کم سخن ہو مخاطب تو ہم کلام کریں

جدا ہوئے ہیں بہت لوگ اک تم بھی سہی
اب اتنی سی بات پہ کیا زندگی حرام کریں

خدا اگر کبھی کچھ اختیار دے ہم کو
تو پہلے خاک نشینوں کا انتظام کریں

سرورق کی شخصیت

ماڈل ——— خوشی
میک اپ ——— روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ——— موسیٰ رضا

pklibrary.com

خبریں وبتیں

دانعہ سہیل

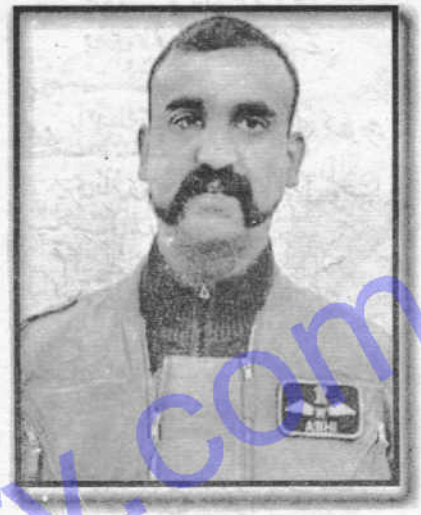

ایوارڈ

بھارتی پائلٹ ابھی نندن کو بھارتی فوج کے تیسرے سب سے بڑے اعزاز ویر چکرا سے نوازا گیا۔ (مار کھانے پر ویر چکر اایوارڈ، بھئی واہ!) بھارت نے ابھی نندن کو یہ ایوارڈ فروری 2019ء میں پاکستانی فضائیہ کا ایف 16 طیارہ مار گرانے پر دیا ہے۔ (اچھا لطیفہ ہے) اس حوالے سے پاکستانی دفتر خارجہ نے بیان دیا ہے کہ مار گرائے جانے والے پائلٹ کو ایوارڈ دینا شرمندگی چھپانے اور اپنے عوام کو خوش کرنے کا کلاسک کیس ہے (اپنا ہی جہاز گرانے پر ایوارڈ صرف بھارت میں ہی دیا جاسکتا ہے)

حادثہ

پاکستانی اداکارہ و میک اپ آرٹسٹ زویا ناصر نے انکشاف کیا ہے کہ ان کی والدہ کو تین بار موٹروے سے اغوا کیا جاچکا ہے، (تین بار کچھ زیادہ نہیں ہوگیا؟) جب وہ ایم پی اے تھیں (ایں......اچھا) اور مجھے موٹروے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اغوا کرنے والے ڈاکو ان کی والدہ کو گاڑی میں بٹھا کر سنسان علاقے میں لے جاتے تھے اور وہیں چھوڑ دیتے تھے لیکن تینوں مرتبہ گاڑی بازیاب کرالی گئی۔ زویا نے بتایا حال ہی میں فلم کی شوٹنگ سے واپسی پر ان کی گاڑی کو بھی ڈاکوؤں نے روک لیا تھا (لیکن آپ تو سیاست دان نہیں)۔ ڈاکوؤں نے ان کی گاڑی کا دروازہ کھول کر سامان مانگا تو وہ گاڑی سے باہر نکل کر بھاگیں اور چیخنے لگیں، ڈاکو کے پاس پستول نہیں تھی۔ اس لیے وہ بچ گئیں۔ (زویا...... کیا یہ فلم کی شوٹنگ ہورہی تھی یا خواب تھا؟)

تبدیلی

حال ہی میں والد کے عہدے پر فائز ہونے والے فلک شبیر نے کہا ہے کہ وہ کم از کم مزید ایک بچے کے خواہش مند ہیں (اور سارہ خان؟) ان کی تمنا ہے کہ وہ اپنی نوزائیدہ بچی اور اہلیہ سارہ خان کے ہمراہ عمرہ کریں۔

اپنی نوزائیدہ بچی کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ان کی بیٹی بچوں کا معروف گانا "بے بی شارک" سننے کے بجائے اپنے والد کی موسیقی سنتی ہے (آہم) باپ بننے کے تجربے کے متعلق کہا کہ جب انہوں نے بیٹی (عالیانہ) کو گود میں لیا تو وہ آب دیدہ ہوگئے۔ والد بننے کے بعد وہ یکسر بدل گئے ہیں۔ (کیا گلوکاری چھوڑ رہے ہیں؟) نہ صرف ان کی حالت بلکہ جذبات بھی تبدیل ہوگئے ہیں۔ اب وہ انتہائی پرسکون ہوگئے ہیں۔

معصومیت

"ہم جو لکھیں گے، سچ لکھیں گے سچ کے سوا کچھ

pklibrary.com

نہیں لکھیں گے......" پاکستانی اداکارہ وینا ملک نے انکشاف کیا ہے کہ ان کے ٹوئٹر اکاؤنٹ سے کی جانے والی ٹوئٹس میں سوچ تو ان کی ہوتی ہے لیکن الفاظ کسی اور کے ہوتے ہیں (ہائے معصوم) وینا کو لگتا ہے کہ ٹوئٹس میں استعمال کیے جانے والے الفاظ بہت مناسب ہوتے ہیں۔ لیکن اس بات کی حقیقت کہیں زیادہ تلخ ہوتی ہے۔ اور اگر آپ رات کو رات نہیں کہیں گے تو کیا اندھیرا کہیں گے۔ (وینا! بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی)

وینا نے بھارتی صحافی ارنب گوسوامی کو ڈراما کنگ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ارنب گوسوامی اتنا جھوٹ بولتے ہیں کہ انہیں اپنے جھوٹ پر شرم بھی نہیں آتی (انہیں کیا پتا شرم کیا ہوتی ہے یہ تو سنا ہی ہوگا آپ نے وینا)

وینا نے عامر لیاقت کو ان کا ایک پرانا وعدہ بھی یاد دلایا کہ عامر لیاقت نے ان کے ساتھ فلم کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر پتا نہیں کیوں نہیں کی۔ (فلم کا ہیرو کون ہوگا؟ کیا نہیں! بھئی ہم نہیں کہہ رہے آپ بھی تو کچھ ذہن پر زور ڈالیں)

☆ مگر اس رقم کا حساب تو لینا ہوگا جو ڈاکٹر ثانیہ نشتر جیسی دھانسو ماہر کی نگرانی میں سینکڑوں بے وسیلہ خواتین تک پہنچنا تھی۔ اس رقم کی دل دہلا دینے والی تعداد کو بائیو میٹرک نظام میں جگاڑ لگا کر ظالم جعل سازوں نے اچک لیا۔ احساس پروگرام کے ذریعے جاری ہوئی خیرت سے ہوئے کھلواڑ کے باوجود حکومت اب بھی ڈٹی ہوئی ہے کہ وہ الیکٹرک مشینوں کے استعمال سے آئندہ انتخاب کو صاف اور شفاف بنائے گی۔

(نصرت جاوید...... برملا)

☆ ہم نے گزشتہ سالوں میں اس ملک کا بہت نقصان کیا ہے۔ خود اپنے ہاتھ سے اس نشیمن کو آگ لگا دی ہے۔ اپنے مفادات کی خاطر بائیس کروڑ لوگوں کے مفادات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ بہت کچھ برباد ہو گیا ہے لیکن ابھی بھی واپسی کا راستہ ممکن ہے۔ بگڑے حالات کو قابو کیا جا سکتا ہے۔

(عمار مسعود...... سوچ فکر)

pklibrary.com

خامشی کو زباں ملے

آدارہ

بشریٰ طارق...... گوجرانوالہ

س: "اپنا مختصر تعارف، تعلیم اور مشاغل لکھیں؟"

ج: "اس محفل میں شریک ہونے کی خواہش تو شروع دن سے ہی تھی۔ مگر کیا کرتی کہ خود سے رابطہ کرنے کا تفصیلی موقع ہی نہ ملا۔ بہر حال اب ٹھان ہی لی ہے تو کوشش کروں گی کہ آپ کو اپنے بارے میں زیادہ سے زیادہ بتا سکوں۔

مجھے بشریٰ طارق کہتے ہیں۔ آج سے بیس برس پہلے 6 جون 1989ء میں اس جہان رنگ و بو میں قدم رکھا۔ اس لیے بائی اسٹار جیمنائی ہوں اور کچھ حد تک اسٹار کا شیس بھی ہوں۔ کامرس فیلڈ میں آنا میرا شوق تھا۔ جسے وقت نے جنون بنا دیا۔ کامرس اسٹوڈنٹ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں خشک قسم کی چیز ہوں۔ میرا پہلا لگاؤ لٹریچر ہے اور اچھے اچھے رائٹرز کو پڑھنا میرا شوق ہے۔

مشاغل تو بہت سارے ہیں جن میں سرفہرست ڈائجسٹ پڑھنا، کتابیں پڑھنا، جو ہاتھ آئے وہ پڑھنا' کوکنگ کرنا، چینل بدل بدل کرٹی۔ وی دیکھنا، گیمز کھیلنا اور گانے سننا وغیرہ۔

میں چونکہ دوسروں سے شیئر بہت کم کرتی ہوں۔ اس لیے اسی صورت حال میں ڈائری لکھتی ہوں۔ ڈائری کے علاوہ شیئر کرنے یا بولنے سے پہلے سوچتی ہوں۔

س: "اپنی خوبیاں، خامیاں اور پسندیدہ عادات کے بارے میں لکھیں؟"

ج: "میری شخصیت بدلتی رہتی ہے۔ میری سوچیں مستقل نہیں رہتیں۔ دوسروں کے بارے میں میری رائے بدلتی رہتی ہے۔ میرا مزاج ذرا مختلف سا ہے کبھی سنجیدہ تو کبھی بے حد شوخ و شرارتی، میں بنیادی طور پر تنہائی پسند ہوں تنہائی انسان کو اپنے آپ کے قریب کر دیتی ہے اور جب آپ خود سے قریب ہوتے ہیں تو اپنی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ ہوتے ہیں مجھے اداسی پسند ہے اس لیے کہ اس کی وجہ سے ہمیں خدا سے قریب ہونے کا موقع ملتا ہے اور اداسی ہی کی وجہ سے ہمیں خوشیوں کو بھرپور انداز میں محسوس کرنے کا مزہ آتا ہے۔

پہلے میں بہت زیادہ وہمی تھی مگر اب کافی سدھر گئی ہوں۔ دوسروں کے متعلق باتیں کرنے اور حسد کی عادت سے نفرت ہے۔ میں جنونی ہوں۔ جب کسی چیز کا جنون سوار ہو جائے تو بس......! کبھی کبھار مجھے اپنا آپ بے حد الجھا ہوا لگتا ہے میں بات بے بات اپنی سوچوں کو الجھا دیتی ہوں۔

بلاوجہ پریشان ہونا میری عادت ہے۔ میں کسی بھی معاملے میں اظہار کی عادی نہیں ہوں نہ ہی محبت کے نہ ہی نفرت کے، دونوں صورتوں میں خاموش رہتی ہوں۔ اپنی یہ عادت کبھی کبھار مجھے بہت تنگ کرتی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ میں بے حس ہوں۔ پہلے میں لوگوں کے رویوں پر بہت زیادہ کڑھتی تھی۔ مگر اب تجربات نے ڈھیٹ بنا دیا ہے شاید اسی لیے بے حس کہلاتی ہوں۔ اس کے علاوہ ہر کام ایمان داری سے کرتی ہوں۔ حسد نہیں کرتی۔ ہنس مکھ، پرخلوص، صلح جو، حساس اور محتاط ہوں۔ غیر مستقل مزاج اور موڈی بھی ہوں۔"

پسندیدہ عادات:-

خود کو دوسروں کی جگہ رکھ کر سوچتی ہوں۔ جس کی وجہ سے دوسروں کے بُرے۔ ردعمل کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔

س: "خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ تعلق کتنا پرانا ہے اور ان میں سے جتنی تحریریں پڑھیں ان میں کون سی ہیں جنہیں فراموش نہیں کر سکیں؟"

ج: "مجھے ادب کا حوالہ بہت عزیز ہے جب کسی

pklibrary.com

ہوتی ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ میرا باقاعدہ رشتہ صرف سات سال پرانا ہے۔ لیکن میں نے اپنے پیدا ہونے سے پہلے کے ڈائجسٹ بھی پڑھ رکھے ہیں۔

تحریروں کے بارے میں سوال کر کے آپ نے بہت مشکل میں ڈال دیا ہے۔ خواتین اور شعاع کی ایسی بہت سی تحریریں ہیں جن کو میں آج تک فراموش نہیں کر سکی۔ جن میں فرحت اشتیاق کا ناول ''وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر'' اور ''دل سے نکلے ہیں جو لفظ''۔ عمیرہ احمد کا ناول ''امر بیل'' اور ''پیر کامل'' ماہا ملک کا ناول ''جو چلے تو جاں سے گزر گئے'' تنزیلہ ریاض کی تحریر ''نارسائی سے پارسائی تک'' کی یشمی کے کردار کے حوالے سے درج ہر لفظ کے ساتھ میرے آنسوؤں کی داستان جڑی ہے۔

اس کے علاوہ جبین سسٹرز، رخسانہ نگار، فائزہ افتخار ان سب کی تحریریں میرے لیے خوب صورت یاد کی طرح ہیں۔ ان کی تحریریں میں ایک بار نہیں کئی بار پڑھتی ہوں اور اتنا ہی انجوائے کرتی ہوں جتنا انسان کسی تحریر کو پہلی بار پڑھتے ہوئے کرتا ہے۔''

س: ''کیا آپ اپنی سالگرہ مناتے ہیں؟ سالگرہ کے موقع پر دوستوں، عزیز و اقارب کی طرف سے دیا جانے والا تحفہ جو کسی خوب صورت جملے کے ساتھ ملا ہو؟''

ج: ''باقاعدہ طور پر سالگرہ تو کبھی نہیں منائی ہاں امی، ابو، بہن بھائیوں سے زبردست ایس ایم ایس اور گفٹ ضرور موصول کرتی ہوں۔''

س: ''پسندیدہ اشعار؟''

ج: ''اچھی شاعری میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اگر پسندیدہ شاعری کے بارے میں پوچھا جائے تو۔ سینکڑوں صفحات کالے ہو جائیں گے پھر بھی فیض احمد فیض کی ''میرے دل میرے مسافر'' اور ''ہارٹ اٹیک'' انشا جی کی ''فرض کرو'' اور ''اک بار کہو'' محسن نقوی کی ''میرا نام نہ پوچھا کرو'' دل و جان سے پسند ہے۔ کتابوں کی طرح پسندیدہ اشعار کی فہرست بھی بے حد طویل ہے..... جیسے

حال مجھ سے پوچھا اس کا اور اس کے بعد

.....

ہم کو احساس تک نہیں ہوتا
ہم کسی کی حیات ہوتے ہیں

.....

سیف یہ دن تو قیامت کی طرح گزرا ہے
جانے کیا بات تھی، ہر بات پہ رونا آیا

کتابیں بھی بہت ساری پڑھی ہیں جن میں مستنصر حسین تارڑ کا ناول ''پیار کا پہلا شہر'' اور ''سفرنامہ دیوسائی'' جاوید چوہدری کی ''زیرو پوائنٹ 1 اور 2''۔ واصف علی واصف کی ''قطرہ قطرہ قلزم''۔ مظہر الاسلام کی ''بارش میں بھیگتی لڑکی'' اور اس سال میں نے لیفٹیننٹ کرنل عمر شبیر کی کتاب ''منزل'' پڑھی ہے یہ ایک اسرائیلی سیکریٹ ایجنٹ لڑکی کی کہانی ہے جو اسلام قبول کر کے اپنی زندگی کا کٹھن دور شروع کرتی ہے۔

اس کے علاوہ میں نے ''ہادی عالم'' پڑھی ہے جو سیرت النبیؐ کے بارے میں ہے، اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ پوری کتاب بغیر نقطوں کے لکھی گئی ہے۔

اقتباس

خواتین ڈائجسٹ یا شعاع کی کسی کہانی میں، میں نے یہ اقتباس پڑھا تھا جو مجھے بے حد اچھا لگا تھا۔

''مردانہ قسم کی عورتیں جو بلا وجہ یہاں وہاں جاتی اور سارے فیصلے مردوں سے بڑھ کر کرتی ہیں۔ یہ اصل میں عورت کی جمالیاتی اور عقلی سطح پر کبھی پوری نہیں اتر سکتیں۔ ان میں ملائمیت نہیں ہوتی جو عورت کو خوب صورت بناتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مرد سے خود کو کم تر سمجھے۔ نہیں بلکہ میں سمجھتی ہوں جو مکمل عورت ہوتی ہے، وہ کسی بھی مرد سے زیادہ مضبوط ارادوں کی مالک ہوتی ہے۔''

اینڈ میں ایک پیغام دینا چاہوں گی۔

انسان کو اپنی زندگی میں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسا کہ بقول شاعر ''کوئی امید بر نہیں آتی'' ایسے لمحوں میں مایوس ہونے کے بجائے اللہ کی ذات سے امید اور آس لگا کر دیکھیے۔ وہ اپنے بندوں کو ضرور نوازتا ہے مایوس کبھی مت ہوں۔

☆

ج: پیاری صدف! شکریہ کی ضرورت نہیں۔ آپ کے دل سے نکلی دعائیں ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں۔ ان شاء اللہ، اللہ آپ کو بہت نوازے گا۔ آپ نے اپنے حصے کے دکھ سہہ لیے۔ اب آپ کے حصے کی خوشیاں آپ کو ملیں گی۔ ہم آپ کی خوشیوں کے لیے دعا گو ہیں۔

آپ میں کہانیاں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ آپ کی ایک کہانی ہم نے منتخب بھی کی ہے لیکن وہ 72 صفحات پر مشتمل ہے۔ آپ پہلے افسانے، ناولٹ لکھیں پھر قسط وار ناول کی باری آئے گی۔

گل مہک.....لاہور

آپ کا ادارہ بہت عمدہ کام کر رہا ہے میں ایک عرصہ دراز سے آپ کے خواتین ڈائجسٹ کی دنیا سے منسلک ہوں۔ میں نے تقریباً تین سال پہلے اپنی ایک تحریر کی اصل کاپی آپ کو بذریعہ ڈاک ارسال کی تھی جو دستاویزات ضروری تھیں۔ مثلاً شناختی کارڈ کی کاپی وغیرہ سب مہیا کیا مگر وہ تحریر آج تک نہیں چھپی۔ اور اگر وہ پہلی تحریر اگر آپ نہیں چھاپنا چاہیں تو وہ مجھے واپس بھیج دیں۔

☆ پیاری گل! تین سال پہلے کی کہانی تلاش کرنا ہمارے لیے مشکل ہوگا۔ ہم بارہا لکھ چکے ہیں اپنی تحریروں کی کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ آپ اپنی مزید کہانیاں بھجوادیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ فوری پڑھ کر آپ کو بتادیں کہ آپ کی کہانی قابل اشاعت ہے یا نہیں۔ کہانیوں کے ساتھ کسی دستاویزات کی ضرورت نہیں۔

ارم نعیم.....بحریہ ٹاؤن راولپنڈی

میں ساتویں کلاس میں پڑھتی ہوں۔ مجھے بہت شوق تھا کہ میں آپ کو خط لکھوں۔ میرا بچپن آپ کے رسالوں کو دیکھتے گزرا ہے کیونکہ میری ماما بچپن سے ہی آپ کے رسالوں کو پڑھتی آرہی ہیں۔ مجھے اور طوبیٰ (چھوٹی بہن) کو ان میں کلر کرنے میں بہت مزا آتا تھا۔ دوپہر کو جب سب سوجاتے تو ہم دونوں مل کر سارے پرانے رسالوں میں کلرنگ کرتے اور باہر ٹائٹل پر ماڈل کا مار کر کلر سے میک اپ کرتے اور پھر جب ماما کو پتا چلتا خوب ڈانٹتیں (ہاہاہا) بچپن میں تو صرف ماما پڑھتی تھیں نے تو پوری لائبریری ہی بنائی تھی، ہمارے گھر میں بہت سارے پرانے رسالے پڑے ہوئے تھے۔ پتا نہیں کس کس وقت کے تھے جو ابھی تک ماما نے سنبھال کر رکھے تھے کچھ تو میری پیدائش سے بھی پہلے کے تھے۔ جب پانچویں کلاس میں تھی، تب پہلا ناول پڑھا۔ مجھے وہ ناول بہت اچھا لگا۔ میں نے شروع سے تھوڑا پڑھا تو مجھے بہت مزا آیا۔ مجھے نہیں پتا اب کہ وہ کون سا ڈائجسٹ تھا نہ ہی اس ناول کی رائٹر کا نام پتا ہے۔ اس ناول کی اسٹوری میں نے اپنی چھوٹی بہن کو بھی سنائی۔ مجھے جو بھی ملتا میں اسے یہ اسٹوری سنانا شروع ہوجاتی۔ پھر ہم کورونا میں گاؤں چلے گئے تب میں چھٹی کلاس میں تھی۔ وہاں پر میری بہن نے اپنی ساری بکس، ناول، ڈائجسٹ وغیرہ نکالے تھے تب میں نے عمیرہ احمد کے ناول ''پیر کامل'' کو تین دن میں پڑھا۔

میں جب بھی کوئی ناول پڑھتی تو پھر سب کو سنانے لگ جاتی۔ اسکول میں بھی ساری فرینڈز کو سناتی ہوں۔ وہ بھی خوب بور ہوجاتی ہے (ہاہاہا)

ج: پیاری ارم! ابھی آپ بہت چھوٹی ہیں۔ میٹرک بھی نہیں کیا آپ نے، اس کے باوجود آپ نے ہمیں اتنا اچھا خط لکھا صفحات کی کمی وجہ سے ہمیں کچھ حصے ایڈٹ کرنا پڑے۔ آئندہ خط لکھیں تو ناولز کے علاوہ پرچے کی دیگر تحریروں پر بھی تبصرہ کریں۔

ثانیہ جعفر.....سانوواں

خواتین اور شعاع کی پرانی قاری ہوں۔ (اب اتنا بھی پرانی نہیں ہوں میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہوں) وہ تو جب سے ہوش سنبھالا اپنی کزنز اور پھپھو اور خالہ وغیرہ کو ان رسالوں میں گم پایا پھر میں بھی ان کو پڑھنا شروع ہوگئی۔ اب چلتے ہیں سمبرے کی طرف، ام طیفور سے مل کر بہت اچھا لگا۔ ان کی ایک کہانی مجھے بہت پسند آئی تھی (تم سے تم تک) اور رنگ ریز میرے عفت سحر کی بھی بہت اچھی ہے۔ زندگی ہم تجھے گزاریں گے بھی ویل ڈن راحت جبیں اور باقی ساری کہانیاں تو بس۔ میں کیا کہوں۔

ج: پیاری ثانیہ! آپ کو خواتین ڈائجسٹ میں پہلے جیسی بات نظر نہیں آئی۔ یہ جان کر ہمیں افسوس ہوا۔ کوشش کریں گے کہ اسے مزید بہتر بنائیں۔ بہت مختصر خط لکھا

ہے آپ نے۔ آئندہ بھی بتائیے گا کہ آپ کو کون سی کہانیاں اچھی نہیں لگیں۔

علیزہ بلال...... کوٹ ادو

ڈائجسٹ اس وقت پڑھنا شروع کیا جب ٹھیک سے پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ اب میں سکینڈ ایئر میں ہوں۔ اس عرصہ میں بہت کچھ بدلا۔ تقریباً ہی ہر چیز بدل گئی مگر سب سے زیادہ ڈائجسٹ کا معیار بدل گیا۔ اس عرصہ میں میرا اور میری تقریباً آٹھ نو کزنز کا بہت دل چاہا کسی ناول کو سراہنے کا کسی لکھاری کو داد دینے کا مگر ہمیں ڈاک خانے کا پتا معلوم نہ تھا۔ کچھ عرصے پہلے میں نے اسے اپنے کالج کے راستے میں دیکھا اور آج ڈاک کے لفافے لے آئی۔ اب کل اس خط کو "سپرد ڈاک" کروں گی اور پتا نہیں کب تک یہ آپ تک پہنچ پائے گا۔ (اگر راستے میں کہیں "سپرد خاک" نہ ہو گیا تو)۔ شروع کرتی ہوں کہانی سے۔ جھوٹ نہیں بولوں گی۔ کبھی ڈائجسٹ عشاء لے کر آتی ہے اور کبھی میں اور یہاں اسے پڑھنا ہوتا ہے۔ عشاء نے۔ میں نے۔ عینی نے۔ باجی مہر النساء نے۔ باجی رضیہ نے۔ باجی عذرا نے (یہ وہی کزنز ہیں جنہوں نے سب سے پہلے شعاع اور خواتین پڑھنا شروع کیا) جب ڈائجسٹ آتا ہے تو ہمارے گھر میں گھمسان کا رن پڑتا ہے تو ڈائجسٹ بے چارا محدود وقت کے لیے میرے یا عشاء یا عینی کے پاس آجاتا ہے۔ اس محدود وقت میں پہلے عمر یسرا یا نور القلوب کو ہی ترجیح دی جاتی ہے۔ (آہ! کہ اب تنزیلہ بھی عہد الست جیسا نہ لکھ سکیں۔ جب ڈائجسٹ فرصت کے ساتھ ہمارے پاس آتا ہے (مہینے کے آخر میں پھٹ کر تو احادیث سے شروع کرتی ہوں۔ بہت اچھی اور مستند احادیث ہوتی ہیں۔ ان کے لیے جزاک اللہ، اس کے بعد تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ اس کے لیے بھی شکریہ۔ مکمل ناول پڑھنے کا دل نہیں کرتا اس لیے "خط آپ کے" پڑھتی ہوں۔ پھر دیگر سلسلے پڑھنے کے بعد۔ پچھلی مرتبہ کا بتاتی ہوں کہ فرح بھٹو کا ناول کھولا شروع کے حالات پڑھ کر آگے بڑھی مگر جب ہیروئن (بے چاری) گرنے لگی اور ہیرو صاحب نے تھام لیا تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ رائٹرز، میری پیاری بہنوں، آپیو، باجیوں خدا کے لیے اس موضوع کا پیچھا چھوڑ دیں۔

افسانے بھی پڑھنا چھوڑ چکی ہوں اور وجہ آپ کو معلوم ہے۔ ظالم نند اور مظلوم بھابھی جو اتوار کے دن بھی کچن میں کھڑی ہو کے ان کے لیے کھانا تیار کرنے کے ساتھ آنسو بہا رہی ہوتی ہے۔

ج: پیاری علیزہ! آپ کی تنقید سر آنکھوں پر لیکن کسی بھی چیز میں انتہا سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے، آپ کسی بھی شمارے کو اٹھا کر دیکھ لیں، افسانے آپ کو ہمیشہ متنوع موضوعات پر نظر آئیں گے۔ ہم خاص طور پر دھیان رکھتے ہیں کہ موضوعات کے حساب سے پرچا یکسانیت کا شکار نہ ہو، آپ کا افسانہ پڑھا نہیں۔ اگر قابل اشاعت ہوا تو ضرور شامل ہوگا۔

الفت زہرہ ہراج، اقصیٰ ماہ نور ہراج...... داؤد والا، تلمبہ

خواتین پانچ تاریخ کو حاصل کیا۔ "کہنی سنی" اور "کرن کرن روشنی" پڑھا۔ اس کے بعد سیدھا دوڑ لگائی اپنے فیورٹ ناول "رنگ ریز میرے" کی طرف عباد اور زمین کی حادثاتی موت سے دل کانپ کے رہ گیا۔ زیاد نے اچھا کیا جو حریم سے شادی کر لی میرب کو ماں سی مل گئی۔ ورنہ مائرہ سے کوئی اچھی امید نہ تھی۔ اس کے بعد پڑھا "زندگی ہم تجھے گزاریں گے" واہ بھئی، بہت ہی زبردست۔ حقیقت کے انتہائی قریب ناول زبردست اعلا۔ راحت جبیں صاحبہ ایسا ہی لکھتی رہیں۔ اس بعد مکمل ناولز کی طرف متوجہ ہوئے۔ دو طویل مکمل ناول دل خوش ہو گیا۔ فرزانہ کھرل صاحبہ زبردست بہترین ناول لکھنے پر مبارک باد۔ فرحانہ مہناز کا خط بہت پسند آیا۔ خطوط کی محفل مجھے بے حد پسند ہے۔ ساری بہنیں بہت ہی اچھا تبصرہ کرتی ہیں۔ زینب نور کا تبصرہ اور ناولٹ شان دار تھا اور صدف ناصر گوجرانوالہ کا خط اچھا تھا ان کی بیٹی خدیجہ بہت اچھی بچی ہے۔ بھئی جو پڑھائی کے ساتھ ساتھ ماما کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ "خبریں و بریں" میں ثانیہ سعید کی بات کہ اچھے اسکرپٹ نہیں۔ پڑھ کر حیرت ہوئی بی بی! اتنے اچھے رائٹر اتنا اچھا اسکرپٹس لکھ رہے ہیں۔

ج: الفت، زہرہ، اقصیٰ اور ماہ نور! بہت شکریہ آپ نے بہت تفصیلی خط لکھا، تبصرہ بھی بہت اچھا ہے۔ اس لیے تاخیر سے موصول ہونے کے باوجود شامل کر رہے ہیں۔

☆

آپ کا باورچی خانہ

شائستہ نعیم.....میر پور خاص

س ''کھانا پکاتے ہوئے کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟''

ج ''کھانے پکاتے ہوئے تمام چیزوں کا خیال رکھتی ہوں لیکن بچوں کی پسند اور ناپسند ضرور مدنظر رکھنا پڑتی ہے۔ ورنہ ڈبل بیگار کرنا پڑ جاتی ہے۔''

س ''کھانے کا وقت ہے اور اچانک مہمان آ گئے ہیں؟''

ج ''اچانک مہمان اکثر آ ہی جاتے ہیں اس کے لیے فرج زندہ باد۔ چھولے بوائل رکھے ہیں۔ چنے کا پلاؤ بنا لیا۔ پودینہ، ہرا دھنیا، زیرہ، ہری مرچ کے کیوبز فریزر میں تیار، دہی پھینٹا رائتہ میں نمک ڈالا اور رائتہ تیار۔

کیونکہ فوری ڈش بھی بتانا ہے تو ترکیب حاضر ہے۔ چھ انڈے ابال لیں، پیاز، ہری مرچ، ٹماٹر باریک کاٹ کر اتنا بھونیں کہ وہ گھی چھوڑ دے۔ انڈوں میں سے سفیدی الگ کر کے باریک کاٹ لیں اور بھونے ہوئے مصالحے میں ڈال کر مزید تین سے پانچ منٹ ہلکی آنچ پر بھونیں ہلکے ہاتھ سے چولھا بند کر کے زردی توڑ کر تسلی اور تمام مسالے پر اچھی طرح ڈال کر ملا دیں پھر ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا اور پر چھڑک دیں گرم مسالہ ایک چٹکی چھڑکیں۔ فٹافٹ ڈش تیار۔ سب کو پسند آئے گی اور کھانے والے ترکیب ضرور پوچھیں گے۔''

س ''کچن کی صفائی کے لیے کیا اہتمام کرتی ہیں؟''

ج ''کچن کی صفائی پر کوئی کمپرومائز نہیں۔ گندگی بالکل پسند نہیں ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ ''صفائی نصف ایمان۔'' ہے اس لیے بھی اور پورے گھر کی صحت بھی میرے ہاتھ میں ہے تو روزانہ کچن کا ایک ایک کونا صاف کرنا لازمی ہے اور جس مرتبان سے سامان ختم ہو جائے اس کو اسی دن دھو کر سکھا دیا۔ سروس کرتی ہوں تو سالن بھونتے بھونتے نائل رگڑ ڈالے مرچ چھان لی۔ ہلدی صاف کر لی۔ وغیرہ۔ میرا کچن میرا کچن ہے کسی اور کا وہاں گزر نہیں۔''

س ''ناشتے میں کیا خاص چیز بناتی ہیں؟''

ج ''صبح کا ناشتہ ہر ایک کی پسند کا ہوتا ہے کسی نے انڈا، پراٹھا، چائے پراٹھا، اچار، ٹماٹر کی چٹنی، رات کا سالن وغیرہ لیکن ایک چیز لازمی ہے پراٹھا ضرور بنتا ہے۔

اتوار یا اور کوئی چھٹی والے دن ناشتہ وی آئی پی ہوتا ہے اس لیے رات کو چنے ابال کر رکھ دیے۔ صبح آلو چنے کا سالن، گرم گرم پوریاں اور حلوہ خود بناتی ہوں۔ کبھی ناشتے میں چائے اور ساتھ میں گرم نان کا ناشتہ بھی ہوتا ہے، کسٹرڈ وہ بھی کیک والا ضرور بنتا ہے۔''

س ''آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟''

ج ''گھر سے باہر کھانے خود کبھی نہیں گئے ہاں اب اکثر خاندان والے تقریبات ہوٹل میں یا میرج ہال میں رکھ لیتے ہیں تو وہ ہمارا باہر کا کھانا ہوتا ہے۔

اگر گھر میں کسی کی سالگرہ ہو تو ریفرشمنٹ باہر سے آ جاتا ہے لیکن کھانا گھر ہی بنتا ہے کیونکہ کسی پر اعتبار نہیں، معلوم نہیں کیسا گوشت، کیسا گھی، کیسا مسالہ اور کیسے لوگوں نے پکایا۔ حفظان صحت کے

pklibrary.com

اصول باہر کے کھانے پر پورا نہیں اترتے۔"

س "کھانا پکاتے ہوئے موسم کا لحاظ رکھتی ہیں؟"

ج "موسم تو لازمی چیز ہے۔ سردیوں میں باجرے کی کھچڑی، باجرے کی ٹکیاں، مکس سبزی، مٹر پلاؤ اور بہت سے کھانے جو موسم کے حوالے سے بنتے ہیں۔ ہاں گائے کے پائے بھی سردیوں میں ہی بنتے ہیں۔ بارش میں کھیر پوری، پکوڑے کھٹی چٹنی، چیلے، گلگلے وغیرہ ضرور بنتے ہیں۔

کھانا اور موسم ہمیشہ ساتھ چلتے ہیں ان کو ہم جدا نہیں کر سکتے کیونکہ ہر موسم کی سبزی، مسالے میں خود بخود فرق آجاتا ہے۔"

س "کھانا پکانے میں محنت کی کتنی قائل ہیں؟"

ج "اچھا کھانا محنت سے ہی بنتا ہے۔ تمام مسالے گھر کے تیار کردہ ہوں تو اس کا اپنا ہی ذائقہ ہوتا ہے۔ کسی چھٹی کے دن تمام مسالے تیار کر لیے جائیں اور پھر ہر کھانے میں استعمال کر لیے جائیں۔ پھر روزانہ کی محنت سے بچ جاتے ہیں اور کھانا بھی وقت پر تیار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہم ہوٹلنگ نہیں کرتے اس لیے گوشت کی بھی تمام اقسام جیسے کڑاہی، اچار گوشت، قورمہ، کوفتے، کباب اور ایسی ڈھیروں ڈشیں محنت مانگتی ہیں اور ہم جناب محنت کرتے ہیں کیونکہ محنت میں عظمت ہے۔"

س "کچن کی ٹپ؟"

ج "کچن میں ہر چیز کو ہر وقت ڈھک کر رکھیں اور مستقل پانی صاف کرتے رہیں، جو چیز کاٹیں اسے ڈسٹ بن میں ڈال دیں۔ جتنی صفائی ہوگی، مچھر، مکھی، کیڑے وغیرہ کچن سے دور رہیں گے، کیونکہ گھر کی دال بھی مرغی کے برابر ہوتی ہے۔"

اب میں اپنا تھوڑا سا تعارف کرادوں۔

نام شائستہ نعیم۔ شادی کو اکیس برس گزر گئے، ٹیچر ہوں۔ وقت کی کمی کا شکار ہوں۔ خواتین اپنے بچپن ہی سے پڑھ رہی ہوں اچھا اور معیاری رسالہ ہے اور تمام کھڑا پا اسی سے لیا ہے۔

pklibrary.com

خالدہ جیلانی

اسپائسی جھینگا سوپ

اجزاء:۔

چکن	آدھا پاؤ
جھینگے	چھ سے آٹھ عدد
یخنی	چار کپ
لیموں کے پتے	تین عدد
ادرک	دو انچ کا ٹکڑا
لیمن گراس	تین ٹکڑے
مشروم	آدھا پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
ثابت مرچیں	پانچ عدد
لیموں کا رس	تین کھانے کے چمچے
فش ساس	آدھا کھانے کا چمچہ
ہرا دھنیا	حسب ضرورت

ترکیب:۔

چکن ہڈی والی لے کر یخنی بنالیں اور (اب اس چکن کو کسی اور کام میں لے لیں) اس میں ادرک، لیموں کے پتے، لیمن گراس ڈال کر پندرہ منٹ تک پکائیں۔

جھینگوں کو خوب اچھی طرح دھو کر صاف کرلیں۔

یخنی میں جھینگے، مشروم، ثابت مرچیں ڈال کر ہلکی آنچ پر تین منٹ تک پکائیں۔ لیموں کا رس اور فش ساس شامل کریں۔ حسب ذائقہ نمک شامل کریں۔

مزیدار اسپائسی جھینگا سوپ تیار ہے۔ سرونگ ڈش میں نکالیں اور ہرا دھنیا چھڑک کر گرم گرم پیش کریں۔

آلو، مٹر گوشت اسپیشل

اجزاء:۔

گوشت	آدھا کلو
مٹر	ایک پاؤ
آلو	دو عدد
ہری مرچ	چار عدد
لہسن کے جوے	چار عدد
پیاز	دو عدد
ادرک	چھوٹا ٹکڑا
سیاہ دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
آٹا	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
پسی لال مرچ	آدھا چمچہ
پسی ہلدی	چوتھائی چائے کا چمچہ
چینی	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	ایک کپ
دار چینی	دو ٹکڑے
سبز الائچی، لونگ، کالی مرچ	چار عدد
بڑی الائچی	ایک عدد

ترکیب:۔

دار چینی، لونگ، کالی مرچ اور بڑی الائچی کو الگ الگ بھون کر کوٹ لیں۔ تیل گرم کر کے آلو کے ٹکڑے ڈالیں اور سنہرا کر کے نکال لیں۔ اسی تیل میں پیاز ڈال کر سنہری کریں، تھوڑی نرم ہوجائے تو گوشت، ادرک، لہسن، نمک، مرچ، دھنیا، ہری مرچ، ہلدی ڈال کر دو منٹ تک فرائی کریں۔ اس کے بعد پانی ڈال کر گوشت گلنے تک پکائیں۔ گوشت گل جائے تو اس میں مٹر، بھنی ہوئی دار چینی، سبز الائچی، لونگ، کالی مرچ، بڑی الائچی اور چینی ڈال کر بھونیں۔ تیل الگ ہونے لگے تو آٹا آدھا کپ پانی میں ڈال کر مکس کریں اور احتیاط سے گوشت میں چمچہ چلاتے ہوئی آٹا ڈال دیں اور بھنا ہوا زیرہ بھی ڈال دیں۔ دو منٹ پکا کر دم پر رکھ دیں، آلو کے ٹکڑے ڈال کر گرم گرم پیش کریں۔

مچھلی بریانی

pklibrary.com

مچھلی	آدھا کلو
چاول	آدھا کلو
تیل	آدھا کپ
نمک	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا	حسب ضرورت
دہی	ایک کپ
ہرا دھنیا، پودینہ	آدھی گٹھی
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	آٹھ عدد
پسا کھوپرا	تین کھانے کے چمچے
پیاز	دو عدد
پسا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
ادرک، لہسن	دو چائے کے چمچے
نمک	ایک چائے کا چمچہ

ان تمام اشیاء کو پیس لیں۔

ترکیب:۔

نمک اور ثابت گرم مسالا ڈال کر چاول ابال لیں۔ ایک کنی رہ جائے تو چھان لیں۔ اب تیل گرم کریں۔ پسا ہوا مسالا ڈال کر بھون لیں۔ جب مسالا تیل چھوڑنے لگے تو مچھلی ڈال کر پانچ منٹ دم پر رکھ دیں۔ اب پتیلے میں چاول ڈالیں، پھر مچھلی کا مسالا، اس کے بعد چاول پھر تیل، زردے کا رنگ، بریانی ایسنس شامل کر کے پانچ منٹ تیز آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ آٹھ سے دس منٹ ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ تیار ہونے پر مہمانوں کو پیش کیجیے۔

انجیر کا حلوہ

اجزاء:۔

انجیر	ایک پاؤ
گھی	تین چمچے
بادام	آدھا کپ
چینی	چار چمچے
الائچی پاؤڈر	ایک چوتھائی کا چمچہ

ترکیب:۔

خشک انجیر کو پانی میں تین سے پانچ منٹ کے لیے ابال کر پیس لیں۔ اب ایک کڑاہی یا دیگچی میں گھی گرم کر کے (بھیگے ہوئے باداموں کو چھیل لیں) اس میں پسے ہوئے بادام ڈال کر دو منٹ ہلکی آنچ پر بھون لیں۔ پھر اس میں پسی ہوئی انجیر، خشک دودھ، چینی اور آدھا کپ پانی شامل کر دیں اس کو پانی منٹ بھونیں، چینی پگھل جائے تو پسی ہوئی الائچی ڈالیں۔ اس دوران چمچہ چلاتی رہیں تاکہ حلوہ جل نہ جائے، اچھی طرح بھن جائے تو پلیٹ میں نکال کر چاندی کا ورق اور بادام سے سجا کر پیش کریں۔

(خشک دودھ نہ ہو تو آدھا کپ دودھ شامل کر لیں)

فلافل

اجزاء:۔

کابلی چنے	ایک پاؤ
ہرا دھنیا	تین کھانے کے چمچے
لہسن	ایک چائے کا چمچہ
ثابت سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کھانے کا سوڈا	چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:۔

چنوں کو پیس کر ایک پیالے میں نکال لیں۔ اس میں باقی اجزا ملائیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں، آمیزے کے چھوٹے پکوڑے تیل میں تلیں اور کاغذ پر نکالیں۔ مزے دار فلافل گرما گرم پیش کریں۔

pklibrary.com

سقراط کہتا ہے۔

''ہر برائی کی جڑ لاعلمی ہوتی ہے۔''

لاشعور کی لاعلمی ہماری ذہنی تکلیفوں کا باعث بن جاتی ہے۔ اگر اس کو دور کر دیا جائے تو مریض تندرست ہو جاتا ہے لیکن اکثر نفسیاتی مریض یہ کہہ دیتے ہیں کہ میں نفسیاتی مریض نہیں ہوں۔ میں تو خود نفسیات جانتا ہوں۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ وہ تندرست ہونے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں لیکن لاشعوری طور پر بیمار ہی رہنا چاہتے ہیں۔ مریض کے اس طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسی زبردست قوت بھی ذہن میں موجود ہے جو رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ یہ قوت وہی ہے جس نے مرض پیدا کیا۔ اس تندرست ہونے اور بیمار رہنے کی ایک ہی وقت کی خواہش کو اس طرح سمجھیں کہ ذہن کا ایک حصہ دوسرے کے خلاف ہو گیا۔ ایک حصہ ٹھیک رہنا چاہتا ہے اور دوسرا اسے بیمار رکھنا چاہتا ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ آپ کسی ماہر نفسیات سے رجوع کریں اور تحلیل نفسی کے ذریعے خود کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

مشہور ڈاکٹر مینارڈ نے ایک تقریب میں کہا۔

''میں اپنے ذاتی مشاہدے اور مطالعہ کی بنا پر جو میں نے عوام کی زندگی کا کیا ہے، کہہ سکتا ہوں کہ سب سے زیادہ بھلائی کا کام جو نفسیات زندگی کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے، وہ خیراتی ادارے قائم کرنے سے بھی ممکن نہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ نفسیات کے ذریعے لوگوں کی اصلاح ہو۔ یہاں تک کہ نفسیاتی طریقہ علاج سے مجرموں تک کا علاج ہو۔ اصل بات یہ نہیں ہے کہ اس نے جرم کیا، اصل بات یہ ہے کہ اس نے جرم کیوں کیا؟''

عالیہ..... گوجرانوالہ

ہم چار بہن بھائی ہیں۔ دو بہنیں، دو بھائی۔ بھائی بڑے ہیں جبکہ ہم دونوں بہنیں چھوٹی ہیں۔

ہماری والدہ کا انتقال ہمارے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ میرے سب سے بڑے بھائی کی عمر اس وقت دس سال تھی، دوسرا بھائی آٹھ سال کا تھا۔ بڑی بہن چھ سال اور میں صرف چار سال کی تھی۔ والد صاحب معمولی ملازم تھے۔ تنخواہ بس گزارے لائق تھی۔ ملازمہ رکھنے کی استطاعت نہیں تھی، دادی، چھوٹے چچا کے ساتھ رہتی تھیں۔ امی کے انتقال کے بعد وہ کچھ دن ہمارے گھر آ کر رہیں لیکن اتنے چھوٹے بچوں کے ساتھ گھر سنبھالنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ کپڑے دھونا، گھر کی صفائی، کھانا پکانا، بھائیوں کو اسکول بھیجنا۔ وہ بڑھاپے میں یہ سب کام نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے ایک بہت غریب گھر کی یتیم لڑکی سے ابو کی شادی کر دی۔ میں تو سوتیلی ماں کا مفہوم بھی نہیں جانتی تھی۔ ابو نے جب کہا یہ تمہاری امی ہیں تو میں خوش ہو کر ان سے لپٹ گئی، بھائی البتہ کچھ دن

وقت پر گھر کا پکا ہوا مزے دار کھانا ملتا۔ گھر صاف ستھرا رہتا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر قرینے سے رکھی ہوتی۔ کپڑے بھی دھلے، استری کیے مل جاتے۔

وہ ہمیں باقاعدگی سے اسکول بھیجتیں۔ ہمارا ہوم ورک چیک کرتیں۔ چاروں بہن بھائی پڑھائی میں بہت اچھے تھے۔ بڑی بہن انٹر میں تھیں تو بہت اچھا رشتہ آ گیا۔ بھائی اس وقت ایم اے کر چکے تھے، وہ جاب تلاش کر رہے تھے۔ ابو نے رشتہ کو انکار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بہن کی شادی طے کر دی۔ مسئلہ پیسوں کا تھا، ابو نے اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے پیسے نکلوائے۔ اس طرح بارات کے کھانے، جہیز کے کپڑوں اور فرنیچر کا انتظام تو ہو گیا لیکن زیور کے لیے ابو کے پاس پیسے نہیں تھے۔ امی کے پاس ایک لاکٹ سیٹ تھا جو ان کی ماں نے دیا تھا۔ انہوں نے بہن کے جہیز کے لیے نکال کر دے دیا۔ میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ انہوں نے ہمیں اپنی اولاد ہی سمجھا۔ ان کی اپنی اولاد تو کوئی تھی ہی نہیں۔ اب پتا نہیں قدرت کو منظور نہیں تھا یا ابو نہیں چاہتے تھے۔

بڑی بہن کی شادی کے بعد بھائی کی جاب بھی لگ گئی اور میں نے بھی گریجویشن کر لیا۔ میں بھی ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کر رہی تھی لیکن امی نے مجھ سے کہا ''گھر جیسے چل رہا ہے، چلنے دو۔ تم اپنے پیسے جمع کرو، تمہاری شادی میں کام آئیں گے۔''

میرا رشتہ آیا تو ابو کو پریشانی نہیں ہوئی۔ میرے اکاؤنٹ میں کافی پیسے تھے۔ دونوں بھائی بھی جاب کر رہے تھے۔ میں شادی کر کے کینیڈا آ گئی۔

ابو شاید میری شادی کے انتظار میں تھے۔ سال بعد ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے چار مرلہ کے ایک مکان کے سوا کچھ نہیں چھوڑا تھا۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ دونوں بھائی گھر فروخت کرنا چاہتے ہیں لیکن امی کی ذمہ داری اٹھانے کو کوئی تیار نہیں۔ امی کا ہمارے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔ وہ اب کہاں جائیں۔ میں نے پاکستان میں بڑی بہن سے بات کی تو اس نے اپنے سسرال والوں اور شوہر پر بات ڈال دی کہ وہ راضی نہیں ہوں گے۔ بھائی کہتے ہیں کہ یہ کون سی ہماری سگی ماں ہیں۔ ابو نے ان سے شادی کی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ کیا مغرب کا اولڈ ہوم نظام اچھا نہیں ہے، جہاں بڑھاپا عزت سے گزار لیتے ہیں۔

ج: عزیز بہن! آپ یہ نہ سوچیں کہ آپ کے بھائی سوتیلی ماں ہونے کی وجہ سے یہ سلوک کر رہے ہیں۔ وہ جس قسم کی بے حسی کا شکار ہیں، اگر سگی ماں ہوتی تو اس سے بھی یہی سلوک کرتے۔ اصل مسئلہ آپ کی والدہ کا ہے (میں انہیں آپ کی والدہ ہی سمجھتا ہوں) کہ وہ کہاں جائیں۔

اس مکان میں آپ کا اور آپ کی بہن کا بھی حصہ ہے۔ آپ دونوں اپنے حصہ کی رقم اپنی والدہ کو دے سکتی ہیں۔ اس سے وہ کوئی چھوٹا سا ایک کمرے کا گھر لے سکتی ہیں لیکن اصل مسئلہ اس عمر میں تنہا رہنے کا ہے۔ آپ اپنے بھائیوں کو سمجھائیں کہ بڑھاپا ایک دن ان پر بھی آنا ہے۔ ان کی اولاد ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ ممکن ہے وہ آپ کی بات سمجھ جائیں، اگر نہ سمجھ سکیں تو اس کا ایک ہی حل ہے کہ کوئی اولڈ ہوم تلاش کریں۔ کراچی میں تو کئی ایسے ادارے ہیں جو اسی مقصد کے لیے بنائے گئے ہیں۔ آپ کے شہر میں ایسی کوئی جگہ ہے یا نہیں، مجھے اس کا علم نہیں۔

☆

pklibrary.com

بیوٹی بکس

رضیہ بیگم......گاؤں تل سیداں

س: مجھے آپ سے صرف ایک ہی بات پوچھنی ہے۔ وہ یہ کہ سردیوں میں میرے ہاتھ پاؤں بہت کالے ہوجاتے ہیں، بہت سی کولڈ کریمیں لگائیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گلاب کے عرق اور گلیسرین کے محلول سے بھی مزید کالے ہوجاتے ہیں۔ آپ کوئی ایسا طریقہ بتائیں جس سے ہاتھ پاؤں سفید اور فریش ہوجائیں۔

ج: رضیہ! اچھی بہن آپ گاؤں میں رہتی ہیں، اس لیے پہلی احتیاط تو یہ کریں کہ جب لیموں اور گلیسرین کا محلول لگائیں، دھوپ سے احتیاط رکھیں۔ بہتر یہ ہے کہ رات سونے سے پہلے لگائیں۔

ایک نسخہ بتارہی ہوں۔

جو کا آٹا	دو چمچے
لیموں کا رس	دو چمچے
زیتون یا بادام کا تیل	دو چمچے

ان تمام چیزوں کو ملا کر پیسٹ بنالیں۔ فرصت میں ہاتھ دھو کر پندرہ منٹ تک اس پیسٹ کو ہاتھ اور پیروں پر لگائے رکھیں۔ پھر اچھی طرح رگڑ کر اتار دیں اور نیم گرم پانی سے ہاتھ دھولیں۔ اس سے ہاتھ پیروں کی جلد میں خصوصی چمک اور نکھار آجائے گا۔

ہاتھوں کے لیے بازار میں اچھے ہینڈ لوشن بھی دستیاب ہے۔ عموماً یہ بڑے شہروں میں ملتے ہیں۔ اگر آپ منگوا سکتی ہیں، وہ ہاتھ پیروں پر رات کو لگا کر سوجائیں اور صبح صاف پانی سے دھولیں۔ آپ کے ہاتھ پاؤں اجلے ہوجائیں گے۔

عالیہ......لاہور

س: میری آنکھیں سوجی ہوئی اور بے رونق نظر آتی ہیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی ہیں۔ کبھی

جان ہیں، خصوصاً سردیوں میں بہت خراب ہوجاتے ہیں۔

ج: عالیہ! سب سے پہلے اپنی خوراک پر توجہ دیں۔ چٹنی، تلی ہوئی اور بیکری کی اشیاء کھانا کم کردیں۔ غذا میں پھل، دودھ اور سبزیاں زیادہ مقدار میں شامل کریں۔ آج کل گاجروں کا موسم ہے، جتنا ممکن ہو، کچی گاجریں کھائیں۔ گاجر کا رس ویسے بھی آنکھوں میں چمک پیدا کرتا ہے۔ جلد کو نکھارتا ہے۔ صحت مند آنکھوں کے لیے وٹامن اے بھی بہت ضروری ہے۔ وٹامن اے انڈے کی زردی، مچھلی، مکھن اور سبز پتوں والی سبزیوں میں پایا جاتا ہے۔

آنکھوں میں چمک نہ ہونے کی ایک وجہ نیند کی کمی ہے۔ اچھی صحت، شفاف جلد اور چمک دار آنکھوں کے لیے آٹھ گھنٹے کی نیند لازمی ہے۔

آنکھوں کے گرد بادام کا تیل لگا کر بہت نرم ہاتھوں سے ہلکے ہلکے مساج کریں۔

کھیرے کے قتلے پتلے پتلے کاٹ کر آنکھوں پر رکھیں۔ آنکھیں روشن اور چمک دار نظر آئیں گی۔

بالوں کے لیے درج ذیل نسخہ استعمال کریں۔

دہی	ایک چھٹانک
انڈا	ایک عدد
لیموں کا عرق	ایک چمچہ

انڈے اور دہی کو اچھی طرح پھینٹ کر ملالیں۔ پھر اس میں لیموں کا عرق بھی ملالیں اور بالوں میں اس طرح لگائیں کہ جڑوں تک پہنچ جائے۔ پندرہ منٹ لگا رہنے دیں، پھر نیم گرم پانی اور شیمپو سے دھولیں۔

ہفتہ میں ایک بار یہ عمل کرنے سے بال خوب صورت، نرم اور چمک دار ہوجائیں گے۔

مہینہ میں ایک بار مہندی لگانا بھی بالوں کے لیے بہت مفید ہے۔

☆

pklibrary.com

بیوٹی بکس

رضیہ بیگم......گاؤں تل سیداں

س: مجھے آپ سے صرف ایک ہی بات پوچھنی ہے۔ وہ یہ کہ سردیوں میں میرے ہاتھ پاؤں بہت کالے ہوجاتے ہیں، بہت سی کولڈ کریمیں لگائیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گلاب کے عرق اور گلیسرین کے محلول سے بھی مزید کالے ہوجاتے ہیں۔ آپ کوئی ایسا طریقہ بتائیں جس سے ہاتھ پاؤں سفید اور فریش ہوجائیں۔

ج: رضیہ! اچھی بہن آپ گاؤں میں رہتی ہیں، اس لیے پہلی احتیاط تو یہ کریں کہ جب لیموں اور گلیسرین کا محلول لگائیں، دھوپ سے احتیاط رکھیں۔ بہتر یہ ہے کہ رات سونے سے پہلے لگائیں۔

ایک نسخہ بتارہی ہوں۔

جو کا آٹا	دو چمچے
لیموں کا رس	دو چمچے
زیتون یا بادام کا تیل	دو چمچے

ان تمام چیزوں کو ملا کر پیسٹ بنالیں۔ فرصت میں ہاتھ دھو کر پندرہ منٹ تک اس پیسٹ کو ہاتھ اور پیروں پر لگائے رکھیں۔ پھر اچھی طرح رگڑ کر اتار دیں اور نیم گرم پانی سے ہاتھ دھولیں۔ اس سے ہاتھ پیروں کی جلد میں خصوصی چمک اور نکھار آجائے گا۔ ہاتھوں کے لیے بازار میں اچھے ہینڈ لوشن بھی دستیاب ہے۔ عموماً یہ بڑے شہروں میں ملتے ہیں۔ اگر آپ منگوا سکتی ہیں، وہ ہاتھ پیروں پر رات کو لگا کر سوجائیں اور صبح صاف پانی سے دھولیں۔ آپ کے ہاتھ پاؤں اجلے ہوجائیں گے۔

عالیہ......لاہور

س: میری آنکھیں سوجی ہوئی اور بے رونق نظر آتی ہیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی ہیں۔ کبھی جان ہیں، خصوصاً سردیوں میں بہت خراب ہوجاتے ہیں۔

ج: عالیہ! سب سے پہلے اپنی خوراک پر توجہ دیں۔ چٹنی، تلی ہوئی اور بیکری کی اشیاء کھانا کم کردیں۔ غذا میں پھل، دودھ اور سبزیاں زیادہ مقدار میں شامل کریں۔ آج کل گاجروں کا موسم ہے، جتنا ممکن ہو، کچی گاجریں کھائیں۔ گاجر کا رس ویسے بھی آنکھوں میں چمک پیدا کرتا ہے۔ جلد کو نکھارتا ہے۔ صحت مند آنکھوں کے لیے وٹامن اے بھی بہت ضروری ہے۔ وٹامن اے انڈے کی زردی، مچھلی، مکھن اور سبز پتوں والی سبزیوں میں پایا جاتا ہے۔

آنکھوں میں چمک نہ ہونے کی ایک وجہ نیند کی کمی ہے۔ اچھی صحت، شفاف جلد اور چمک دار آنکھوں کے لیے آٹھ گھنٹے کی نیند لازمی ہے۔

آنکھوں کے گرد بادام کا تیل لگا کر بہت نرم ہاتھوں سے ہلکے ہلکے مساج کریں۔

کھیرے کے قتلے پتلے پتلے کاٹ کر آنکھوں پر رکھیں۔ آنکھیں روشن اور چمک دار نظر آئیں گی۔

بالوں کے لیے درج ذیل نسخہ استعمال کریں۔

دہی	ایک چھٹانک
انڈا	ایک عدد
لیموں کا عرق	ایک چمچہ

انڈے اور دہی کو اچھی طرح پھینٹ کر ملالیں۔ پھر اس میں لیموں کا عرق بھی ملالیں اور بالوں میں اس طرح لگائیں کہ جڑوں تک پہنچ جائے۔ پندرہ منٹ لگا رہنے دیں، پھر نیم گرم پانی اور شیمپو سے دھولیں۔

ہفتہ میں ایک بار یہ عمل کرنے سے بال خوب صورت، نرم اور چمک دار ہوجائیں گے۔

مہینہ میں ایک بار مہندی لگانا بھی بالوں کے لیے بہت مفید ہے۔

☆

pklibrary.com

کہنی سنتی، مدیر 8

کرن کرن روشنی، ادارہ 9

ہمارے نام، نادرہ خاتون 28

آپ سے کیا پردہ

ایک پنجابی نظم، انشاجی 11

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے، امت الصبور 244

مجھ سے ملئے

باتیں ریحان ناظم سے، شاہین رشید 15

انٹرویو

قرۃ العین خرم ہاشمی سے ملاقات، شاہین رشید 20

خامشی کو زباں ملے، ادارہ 248

ناول

رنگ ریز میرے، عفت سحر 210

زندگی ہم تجھے گزاریں گے، راحت جبیں 34

مکمل ناول

مالا، نمرہ احمد 164

تو میری راہ گزر، عنبرین ابدال 92

نازک، صبا زین 128

ناولٹ

سیاہ بخت، فلک حسن 62

افسانے

نشانے باز، ثانیہ مرتضیٰ 57

گیت دان، کشف بلوچ 83

گمنام قارئین کے نام، حمیرا شفیع 235

آزمائش، راشدہ رفعت 227

پوتی، نواسی اور میں، ام ہانی 123

کھلتا کسی پہ کیوں، مریم شہزاد 161

نظمیں غزلیں

غزل، قتیل شفائی 239

نظم، جون ایلیا 239

غزل، افتخار عارف 238

غزل، ن ۔ م 238

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

pklibrary.com